مقالاتِ شارحِ بخاری

فقیہ العصر حضرت مفتی
شریف الحق امجدی قدس سرہ



مکتبہ برکات المدینہ

مقالات شارح بخاری

(جلد اوّل)

اس میں شارح بخاری (مفتی شریف الحق امجدی نور اللہ مرقدہ) کے گراں مایہ، علمی، تحقیقی، فکری، مقالات شامل ہیں۔ جو تفسیر، سیر، فقہیات، اسفار و مشاہدات پر مختلف اوقات میں تحریر فرمائے۔

— مرتبین —

مولانا حافظ عبد الحق رضوی مصباحی

(استاذ جامعہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ)

و مولانا ارشاد احمد رضوی مصباحی

(سابق استاذ جامعہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ)

— ناشر —

مکتبہ برکات المدینہ

جامع مسجد بہار شریعت بہادر آباد کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

سلسلہ اشاعت نمبر 5

نام کتاب: مقالات شارح بخاری (جلد اوّل)

مصنف: علامہ مولانا مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ

عدد صفحات: 446

سائز: 23x36/16

تعداد: 1100

طباعت اول: 1427ھ / 2006ء

(دائرہ البرکات، اتر پردیش، ہند)

طباعت دوم: 1428ھ / 2007ء

ناشر

مکتبہ برکات المدینہ

جامع مسجد بہار شریعت، بہادر آباد، کراچی

فون: 021-4219324

barkatulmadina@yahoo.com

تقریظ

امین ملت پروفیسر سید محمد امین قادری برکاتی
سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف

فقیہ اعظم ہند علامہ مفتی محمد شریف الحق قادری برکاتی امجدی رحمۃ اللہ علیہ ایک مستند فقیہ، عظیم محدث، بخاری شریف کے شارح، بہترین مناظر، سیکڑوں مریدوں کے پیر طریقت اور ہزاروں شاگردوں کے استاد تھے لیکن ہم غلامان صاحب البرکات کے لیے ان کا سب سے ممتاز لقب " برکاتی مفتی" تھا۔ ان کے فتاویٰ اور تنقید و تحقیق کا ایک منفرد انداز تھا جس کی روشنی میں وہ دور سے ہی پہچان لیے جاتے تھے۔ اکابر اہل سنت نے ان پر اعتماد کیا اور صدر الشریعہ، مفتی اعظم اور والد ماجد احسن العلما نے انھیں اپنی خصوصی چاہتوں سے نوازا۔ ان کے علمی کارناموں میں ان کے ستر ہزار سے زیادہ فتاویٰ اور نزہۃ القاری شرح بخاری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آپ کی ان علمی خدمات کو عوام و خواص نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور جشن شارح بخاری ممبئی میں رضا اکیڈمی کے زیر اہتمام انھیں چاندی سے وزن کیا گیا۔ اہل علم نے معارف شارح بخاری کے گیارہ سو صفحات میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ وہ سارے اعزازات ہیں جن میں یہ برکاتی مفتی اپنے معاصرین کے درمیان بالکل منفرد نظر آتے ہیں۔

ان کے وصال کے ۶ سال بعد فقیہ اعظم ہند کے گراں قدر علمی اور تحقیقی مقالات کا ضخیم مجموعہ منظر عام پر آرہا ہے۔ ان مقالات کی قدر و قیمت اہل تحقیق متعین کریں گے۔ اس فقیر برکاتی نے اس مجموعے کے جستہ جستہ صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہی رائے قائم کی ہے کہ ان مقالات کے بیشتر حصے فقیہ اعظم ہند کی فقیہانہ بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ شخصیاتی گوشے میں اکابر اہل سنت سے مفتی صاحب کی سچی عقیدت ہر سطر سے تراوش ہوتی ہے۔ اس گوشہ کا اسلوب بھی صاف ستھرا ہے اور تحقیقی پیچیدگیوں سے آزاد۔ صدارتی خطبات سے آپ کی پر اعتماد شخصیت جھلکتی ہے۔ تقریظات کی روش بھی عام طرز سے جداگانہ ہے۔ انھیں مرتب کے ابتدائی اضافوں نے مزید نکھار دیا ہے۔

نوے مقالات کے اس مجموعے کو بڑی کاوش سے عزیزم مولانا ارشاد احمد رضوی مصباحی ساحل شہسرامی (علیگ) نے مختلف لائبریریوں کی چھان بین کے بعد دو سال میں جمع کیا ہے۔ یہ ان کی سعادت اور فقیہ اعظم سے نیاز مندی کا ثبوت ہے۔ یہ فقیر برکاتی انھیں اس سعادت مندانہ کاوش پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہے۔ ساتھ ہی ان تمام افراد کو جو اس گراں قدر مجموعے کو منظر عام پر لانے کے سلسلے میں معاون بنے بالخصوص محترمی ڈاکٹر محب الحق قادری برکاتی کو مبارک باد پیش ہے جو ایک سعادت مند فرزند کی طرح اپنے والد ماجد کی علمی یادگاروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور ان کے فروغ و اشاعت میں مسلسل مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس مجموعے کو مقبول عام اور مفید انام بنائے آمین!

فقیر برکاتی
سید محمد امین قادری

مقالات شارح بخاری اجمالی فہرست (جلد اول)

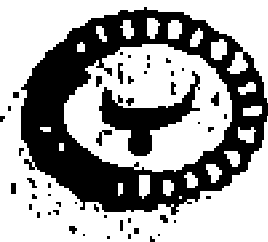
باب اول۔ تفسیرات وتشریحات

باب دوم۔ تواریخ وسیر

باب سوم۔ تحقیقات فقہیات



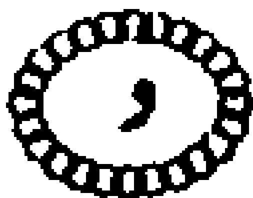
مقالات شارح بخاری اجمالی فہرست (جلد دوم)



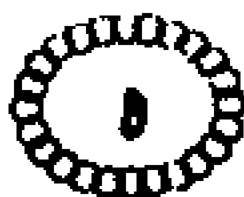
باب چہارم۔ اسفار ومشاہدات



مقالات شارح بخاری اجمالی فہرست (جلد سوم)



باب سوم۔ تقریظات وتصدیقات





تیرے علمی کارنامے بخشیں گے تجھ کو دوام
آب زریں سے لکھے گا کل مؤرخ تیرا نام

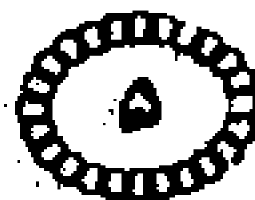
تو نے نسل نو کو بخشا ہے شعور علم و فن
ہے تری ذاتِ گرامی، لائق صد احترام

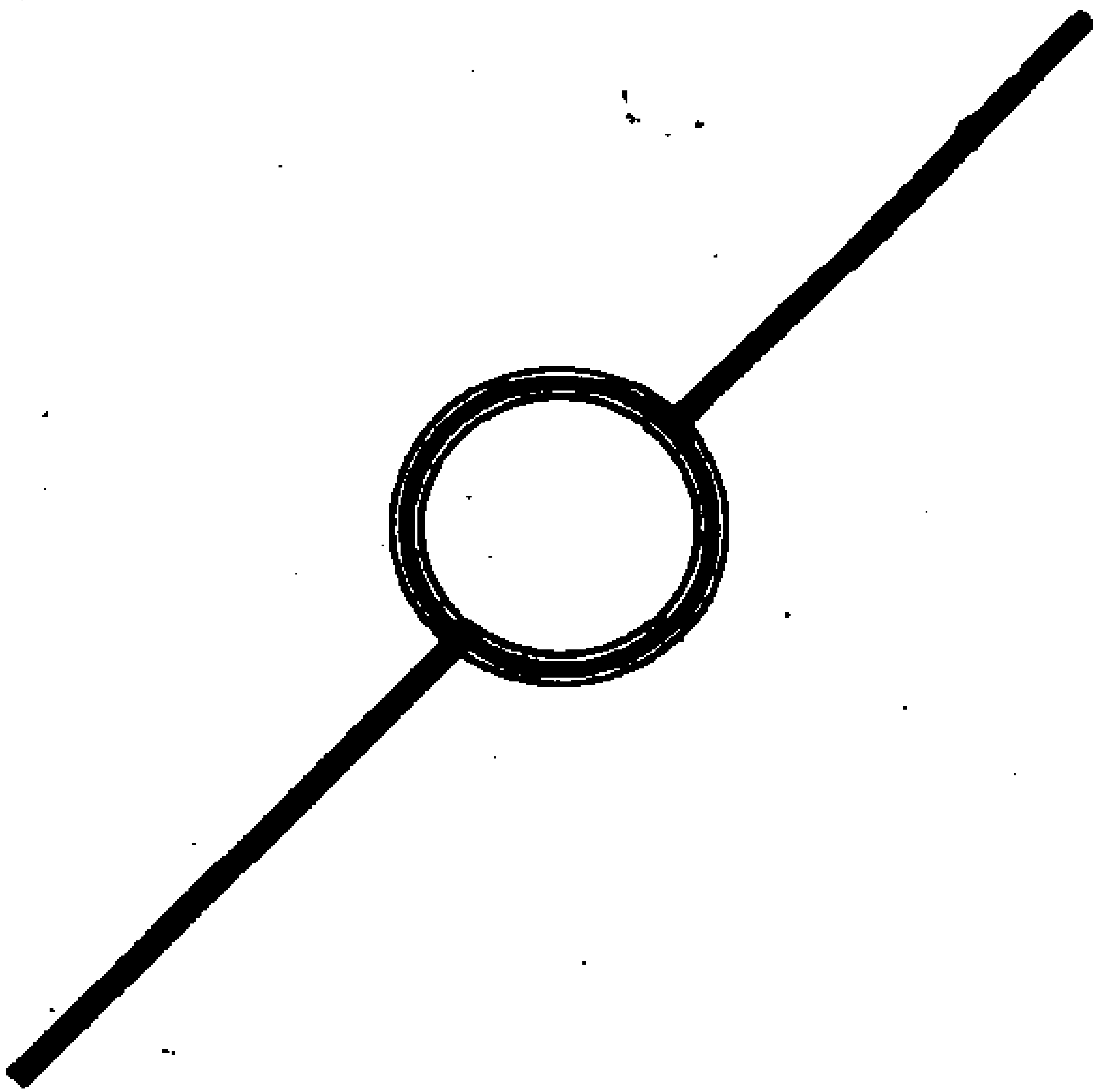
(ڈاکٹر) شکیل احمد اعظمی



فہرست مضامین مقالات شارح بخاری

(جلد اول)





بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للمتوحد = بجلالہ المتفرد ـــــ وصلوتہ دومًا علی = خیر الانام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

پیش گفتار

''شارح بخاری۔ایک ممتاز محقق''

مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ اور ان کے تلامذہ وخلفا کے بعد مصنفین، ومحققین، جماعت اہل سنت پر اگر نظر دوڑائیں تو آپ کو شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی قدس سرہ العزیز۔ایک ممتاز محقق کے طور پر نظر آئیں گے۔انہوں نے ان ادق اور پیچیدہ مسائل پر قلم اٹھایا جو تشنۂ تحقیق تھے۔اپنے دور میں شارح بخاری، فقیہ اعظم ہند، فائق الاقران تھے۔ وہ صرف گفتار کے غازی نہ تھے بلکہ جو مسئلہ سچ سمجھا،حق جانا، اسے تقریر وتحریر کے ذریعہ لوگوں تک پہونچانے کی کوشش فرمائی۔ سیاسی تدبیر میں پختگی، تدریس میں ملکہ،تقریر ومناظرہ میں پر اعتماد فاتحانہ کردار،تصنیف تالیف کا ایسا ذوق وشوق کہ تن تنہا بریلی شریف میں ''دار التصنیف والتالیف'' کی بنیاد ڈالی۔مگر افسوس کہ عوام وخواص کی سرد مہری سے وہ قابل ذکر ادارہ نہ بن سکا۔خود ہی لکھتے رہے چھاپتے رہے یہاں تک کہ شاندار اشاعتی ادارہ دائرۃ البرکات قائم فرمایا۔خود بھی ہمیشہ لکھتے رہے۔علما وطلبہ کو بھی راغب کرتے رہے۔فقہ وافتاء میں ایسا علمی استحضار کہ ان کا کوئی ثانی نہیں۔ دور طالب علمی سے لے کر تا حیات روزانہ ۱۶ تا ۱۸ر گھنٹہ آپ کے علمی مشغولیات کا تخمینہ ہے۔

تصنیفی اور اسلامی تدبر و تشخص کا اندازہ ان کی پہلی تصنیف ''اشک رواں'' کے مطالعہ سے اہل فکر و دانش لگا سکتے ہیں۔ جب ۱۹۴۶ء میں آزادی ہند کے وقت مسلمانوں میں انتشار تھا کہ وہ کانگریس کا ساتھ دیں، یا مسلم لیگ کا، یا اسلامی مملکت کا مطالبہ کریں۔

شارح بخاری نے اسلامی مملکت کا تصور اس وقت پیش کیا، جب وہ نہ تو شارح بخاری تھے، نہ فقیہ اعظم، نہ علامہ، نہ محقق و مفکر، بلکہ ۲۵ سال کے مولوی صوفی محمد شریف الحق تھے۔ یہ کتاب آزادی کے بعد ضبط ہوگئی، ورنہ اہل فکر و دانش ان کی مذہبی تدبر و تشخص کو ملاحظہ فرماتے۔

اس زمانے میں جب کہ مسلمان مختلف علما اور لیڈروں کی تحریکوں کے نتیجے میں مسلم لیگ اور کانگریس کے خانوں میں بٹے ہوئے تھے اور انہیں صحیح سمت نظر نہ آتی تھی۔ شارح بخاری نے اپنی نوعمری میں ''اشک رواں'' لکھ کر اسلامیان ہند کو صحیح راہ دکھائی۔

اسی طرح ''اشرف السیر'' کو ملاحظہ فرمائیں۔ شبلی نعمانی نے ''سیرت النبی'' میں ثقہ اصحاب سیر کی علمی حقیقت کم کرنے، ماضی کی معتبر کتب سیر کی اہمیت گھٹانے اور بے اثر کرنے کی کوشش کی ہے ''اشرف السیر'' میں شارح بخاری نے اس غبار کو دور کرنے کی کوشش فرمائی، ہجوم کار اور پر پیچ، نت نئے مسائل نے موقع نہ دیا ورنہ چار جلدوں میں یہ کتاب شاہکار تصنیف ہوتی۔

اسی طرح ''اسلام اور چاند کا سفر'' جب انسان چاند پر پہونچا اس وقت اختلافات کا ایک طوفان اٹھ گیا کہ ایسا ممکن ہے یا ناممکن۔ اس وقت ایسا لگا جیسے اسلام ہی پر حملہ ہوگیا، اس وقت ''اسلام اور چاند کا سفر'' لکھ کر یہ ثابت کیا کہ انسان چاند پر جا سکتا ہے، اس سے اسلامی فکر و اعتقاد میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ عجب اتفاق تھا اس مسئلہ پر ان کے ایک جلیل القدر استاذ صدر العلماء حضرت علامہ غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ سے اختلاف ہوا۔ اس کتاب کے جواب میں حضرت نے صحیح النظر، کتاب لکھی۔ جس کا جواب اسلام اور چاند کے سفر کے اخیر حصہ میں موجود ہے۔ اس میں جو علمی مباحثہ استاذ و شاگرد کے درمیان ہوا وہ ایک علمی شاہکار اور حسن ادب کا نمونہ ہے۔

اسی طرح دیگر تصنیفات، مثلاً تحقیقات، فتنوں کی سرزمین کون، نزہتہ القاری کے مطالعہ کے بعد قارئین، محققین، مفکرین نے اندازہ کیا ہوگا۔

اب "مقالات شارح بخاری" میں ان کی تحقیقات اور مختلف فیہ مسائل پر واضح نقطہ نظر ملاحظہ فرمائیں گے۔ اکابر، علماء، مشائخ پر قلبی جذبات واحساسات بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ طلبہ وعلماء کے لیے یہ مقالات مہمیز کا کام کریں گے۔ ذہن کو فکر نو، جن کی موجوں میں تلاطم نہیں۔ انشاءاللہ تلاطم ضرور پیدا ہوگا۔ یہ تین جلدوں میں تقریباً ۱۵ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

جلد اول: چار ابواب ہیں۔ پہلا باب تفسیرات، تشریحات۔ باب دوم: تواریخ وسیر۔ باب سوم: تحقیقات وفقہیات۔ باب چہارم۔ اسفار ومشاہدات۔

جلد دوم: دو ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول رضویات۔ باب دوم تنقیدات، تعقبات۔

جلد سوم: تین ابواب پر مشتمل ہے باب اول شخصیات باب دوم خطبات باب سوم تقریظات، تصدیقات۔

انتہائی معذرت کے ساتھ اعتراف ندامت:

مقالات شارح بخای کی تدوین وترتیب، ابا حضور نے اپنی حیات ہی میں، ذاتی صرفہ سے اپنی ہدایات ونگرانی میں، مولانا ارشاد احمد برکاتی، سابق استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارکپور سے کروادی تھی جس کی تفصیل، موصوف نے "افکار رضا" ممبئی، و"ماہنامہ ماہِ نور" دلی میں شائع کروادی۔ قارئین ملاحظہ فرما چکے ہوں گے۔ مولانا نے بہت عجلت سے کام لیا، ورنہ وہ تفصیل اس میں شامل ہوتی۔ اس کے کچھ ضروری اقتباسات اس میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ ان کا شکریہ کہ انہوں نے ابا حضور کی تعمیل حکم فرمائی اور محنت وشوق سے اس کی ترتیب فرمائی۔

ابا حضور کی دلی خواہش تھی کہ "جشن شارح بخاری" ممبئی سے قبل وہ بھی منظر عام پر آجائے مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا جس کا بہت قلق تھا۔ ابا حضور کی وفات کے بعد، مولانا عبدالحق رضوی وغیرہ نے محسوس کیا کہ عجلت میں اس کی ترتیب ہوئی ہے اور بہت سے

مضامین، چھوٹ گئے ہیں، اس لیے ترتیب کچھ ڈھنگ سے ہوجائے، اور بقیہ مضامین بھی شامل ہوجائیں، جس کو جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ کے موقر اساتذہ مولانا عبد الحق رضوی، مولانا نفیس احمد مصباحی، مولانا مبارک حسین مصباحی، مفتی نسیم احمد صاحبان نے دوبارہ ترتیب دیا، اس کی بھی دوبارہ کمپوزنگ ہوئی، مذکورہ بالا علمائے کرام نے بڑی عرق ریزی اور جان سوزی سے پروف ریڈنگ کی۔ مگر ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے اشاعت میں تاخیر در تاخیر ہوتی گئی۔ نتیجتاً وہ بھی کمپیوٹر سے محو ہوگئی جب صبر کا پیانہ لبریز ہوگیا، تو احقر نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کی مصروفیات، بہت بڑھ گئیں ہیں اب اس کام کو اپنے ناتواں ہاتھوں میں لینا چاہیے، مقالات کی جیسی ترتیب ان حضرات نے دی ویسی ہی ناچیز نے سہ بارہ کمپوزنگ شروع کرادی۔ اب اس سلسلے میں اہم کام پروف ریڈنگ کا تھا کہتے ہیں" دودھ کی جلی بلی چھاچھ کو پھونک کر پیتی ہے"۔ اب میں کسی کے ہاتھ مسودہ پروف ریڈنگ کے لیے نہیں دے سکتا تھا۔ اشرف السیر ، تحقیقات، اسلام اور چاند کا سفر کی پروف ریڈنگ کا کچھ سابقہ تجربہ تھا، ہمت کر کے پروف ریڈنگ خود شروع کردی۔ ابا حضور کی چہیتی پوتی، عزیزہ حمیرا خاتون برکاتی نے کافی تعاون کیا۔ اس کی تعلیمی و گھریلو مصروفیات اور احقر طبیب وہ بھی پرائیویٹ پریکٹس، اس میں مریضوں کے آنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ جب ان کو وقت ملا، ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔ اور دروازہ پیٹنے لگے اور اگر لمحہ بھر حاضری میں ڈاکٹر نے دیر کردی تو دروازہ بھی توڑنے لگیں گے جیسے، ڈاکٹر کو گھر میں کوئی کام ہی نہیں۔ مریض کے دستک دیتے ہی قرض خوروں کی طرح جی حضور حاضر ہوں۔ ایسی حالت میں پڑھنے لکھنے والے کام، درہم برہم۔ جس کی وجہ سے اس ناچیز سے بھی تاخیر ہوئی۔ مزید اس سلسلے میں دوسرے مخلصین ومعاونین سے کام لینا پڑا۔ جس میں مولوی معراج احمد گھوسی، مولوی وصال احمد، مفتی محبوب احمد، مولوی شہاب الدین، مولانا شمشاد احمد، مولانا امتیاز احمد صاحبان کا ممنون ومشکور ہوں۔ خاص طور پر مولانا عبد الحق ، مولانا نفیس احمد مصباحی، مفتی نسیم احمد صاحب کا کہ یہ متاع گراں مایہ محفوظ رکھا اور عنایت فرمادیا اللہ تعالیٰ سب کو اجر عظیم عطا فرمائے اور ترقی درجات سے نوازے۔ احقر کو سخت ندامت ہے کہ ایسے گنجہائے گراں مایہ کو منظر عام پر

لانے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی کہ لوگوں کا اشتیاق کم ہو گیا۔ خیر ''دیر آید درست آید'' کے مصداق ہوگا اب اہل علم وفن پر منحصر ہے کہ وہ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو کمی ہو اس سے ضرور مطلع فرمائیں۔ اس تعاون کے لیے ممنون ومشکور ہوں گا۔

''فتاویٰ شارح بخاری'' جو شارح بخاری کی زندگی کا اہم فقہی سرمایہ ہے ان شاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آ جائے گا۔ غیر معمولی تاخیر میں ہمیں اپنی کم مائیگی، نا اہلی کا پورا احساس ہے کوشش کر رہے ہیں تائید ایزدی، فضل صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے امید ہے کہ عنقریب کامیاب ہوں گے۔ وما توفیقی الا باللہ o علیہ توکلت والیہ انیب o میری توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف لوٹتا ہوں۔

(ڈاکٹر) محمد محبّ الحق قادری

بی یو، ایم، ایم، ایس (علیگ)

خادم دائرۃ البرکات گھوسی، مئو

یکم ذوقعدہ ۱۴۲۶ھ بمطابق ۴؍دسمبر ۲۰۰۵ء

۷۸۶

حرفِ چند

مولانا محمد ارشاد احمد رضوی مصباحی استاذ و نائب مفتی جامعہ اشرفیہ مبارک پور

الحمدُ لله إلٰهِنا، والصلوٰۃُ والسلامُ علیٰ سیدِنا محمدٍ شفیعنا، وعلیٰ آله وصحبِه وَسائِلِنا۔

حضرت شارح بخاری، فقیہ العصر علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ کی ذات گرامی کا علمی دبدبہ عالمگیر شہرت رکھتا ہے۔ علمی مصروفیات اور دینی خدمات آپ کی پوری زندگی کی شناخت ہیں۔ علمی تنوع، فکری بصیرت، اخذ واستنباط کا ملکہ، استحضار اور جودتِ بیان، تحقیقی رنگ، تردید کے باب میں تیکھی، دلچسپ اور مضبوط گرفت، دقیقہ رس، نکتہ آفریں فکر، اسلامی غیرت، دینی حمیت، علماء ومشائخ کا اکرام، ہم عصروں کا اعزاز، اصاغر کی راہنمائی اور ہمدردی، یہ سب آپ کی زندگی کے روشن بنیادی عناصر ہیں جن کی جھلک آپ کو ان تحریروں میں جا بجا بکھری نظر آئے گی۔

راقم نے دستیاب شدہ تحریروں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد درج ذیل ابواب میں منضبط کیا ہے۔

۱۔تفسیرات۔ ۲۔فقہیات۔ ۳۔تحقیقات۔ ۴۔تنقیدات وتعاقبات۔ ۵۔شخصیات۔ ۶۔صدارتی خطبات۔ ۷۔سفرنامے۔ ۸۔تقریظات وپیغامات۔ ۹۔متفرقات۔

باب اول سے متعلق الحمد سے سورہ بقرہ کے پہلے رکوع تک کی تفسیر ہے اور دیگر ابواب سے متعلق کل مضامین کی تعداد ۸۸ر ہے جن میں بعض بہت مبسوط ہیں اور مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے فقہیات میں مسائل حج وزیارت، تنقیدات میں انکشاف حق پر

ناقدانہ نظر، شخصیات میں مفتی اعظم اپنے فضل و کمال کے آئینے میں اور صدر الشریعہ ایک ہمہ گیر شخصیت وغیرہ۔

ان ابواب میں ہر ایک اپنی جگہ اہم ہے اور ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ کی شان رکھتا ہے مگر تحقیقات وتنقیدات بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

حضرت کی فقہی بصیرت کی تو دنیا قائل ہے اور اس پر آپ کے ہزاروں فتاویٰ شاہد ہیں جو ترتیب کے مراحل سے گذر رہے ہیں۔ خدا کرے وہ جلد ہی باحوصلہ افراد کے ہاتھوں سے مرتب ہو کر منصہ شہود پر جلوہ گر ہوں کہ نزہۃ القاری کے بعد یہ آپ کی عبقریت کی شاندار دستاویز ہوگی۔ لیکن اس مجموعہ میں فقہیات کے باب میں ''انجکشن سے روزہ نہ ٹوٹنے سے متعلق مضمون حضرت کی فقہی بصیرت کا لافانی شاہکار ہے۔ حضرت کے سفر نامے، صدارتی خطبات اور سوانحی مقالوں سے حضرت کی نثر نگاری کا جوہر خوب نمایاں ہے ان کے مطالعہ کے بعد حضرت کی انشا پردازانہ مہارت کا بھی ہر مصنف اعتراف کرے گا۔'' تقریظات وپیغامات'' ذیلی چیزیں شمار ہوتی ہیں لیکن حضرت نے اس باب میں بھی بڑے قیمتی افادات رقم فرمائے ہیں جو اس کتاب کے موضوع کی روح کہے جاسکتے ہیں، حضرت بحر العلوم علامہ عبد الحلیم فرنگی محلی قدس سرہ کی کتاب ''نور الایمان بزیارۃ آثار حبیب الرحمٰن'' کے ترجمہ پر حضرت کا مقدمہ اس کا بہترین ثبوت ہے۔ متفرقات کے باب میں'' مہر اور جہیز کے سلسلہ میں ایک گذارش'' اور'' اشرفیہ کا وفد بمبئی میں'' حضرت کی دینی ہمدردی کے قیمتی جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ الغرض پورا مجموعہ گراں قدر افادات سے لبریز ہے کہاں تک تعارف کرایا جائے صرف دو مضمون پر تبصرہ سپرد قلم ہے۔

ارض مقدس اور یہودی تغلب: دشمنان اسلام امریکہ، فرانس، برطانیہ، روس نے در بدر کی ٹھوکریں کھانے والے یہودیوں کو فلسطین کا ایک حصہ دے دیا۔ پوری دنیا کے مسلمان احتجاج کرتے رہے مگر اس کا ان پر کوئی اثر مرتب نہ ہوا۔ اللہ عزوجل کی شان بے نیازی کہ مصر، اردن وغیرہ نے ارض مقدس کو یہودیوں سے خالی کرانے کی جو بھی کوشش کیں وہ سب کی سب ناکام ہوئیں، یہودیوں سے جنگیں کیں سب میں شکستیں کھائیں حالانکہ

قرآن مجید میں یہودیوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

ضربت علیہم الذلة والمسکنة وباؤا بغضب من الله (بقرہ آیت ۶۱)

اوران پر مسلط کردی گئی خواری اور ناداری اور وہ اللہ کے غضب میں لوٹے۔

مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کی ہر محاذ پر فتح اور ان کی روز افزوں ترقی نے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا کہ اللہ عزوجل کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ یہ سوال بہت اہم اور غیر معمولی تھا۔ ملت کے سارے مفکرین اس کے جواب میں الجھے ہوئے تھے اور طرح طرح کے جوابات دیئے جارہے تھے۔ بہت سے جوابات اپنی جگہ درست بھی تھے لیکن بہتیرے لوگوں کو ان سے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ بالآخر حضرت شارح بخاری ؒ قرآن مجید ہی سے ایک ایسا جواب ڈھونڈ نکالا جس پر علمی دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ آپ نے فرمایا کہ سورۂ بقرہ شریف میں جو آیت ہے اس کی تفصیل سورۂ آل عمران رکوع ۸ میں موجود ہے۔ ارشاد ہے:

"ضربت علیہم الذلة اینما ثقفوا الا بحبل من الله وحبل من الناس" ان پر خواری جمادی گئی جہاں بھی رہیں مگر جب کہ اللہ کی رسّی یا آدمیوں کی رسّی پکڑ لیں۔

اس آیت مبارکہ کا صریح مفہوم یہ ہے کہ یہودی جہاں بھی رہیں گے ذلیل وخوار رہیں گے مگر جب کہ اللہ کی رسّی پکڑ لیں یا دوسرے لوگوں کی رسّی پکڑ لیں۔ یہ ذلت وخواری سے چھوٹنے کی استثنائی حالت کا بیان ہے۔ اللہ کی رسّی پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ مسلمان ہوجائیں اور لوگوں کی رسی پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے علاوہ کسی اور طاقت اور قوم کی پناہ میں آجائیں یعنی اگر وہ تنہا اپنی قوت سے چاہیں تو ذلت سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوسکتا اس پر یہودیوں کی ہزار ہا سالہ تاریخ شاہد ہے۔ ہاں اگر مسلمان ہوجائیں تو جو عزت مسلمانوں کو حاصل ہے انہیں بھی حاصل ہوجائے گی۔ یا یہ کہ وہ دنیا کی کسی طاقتور قوم کی پناہ حاصل کرلیں تو دنیا میں عزت پاسکتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ اسرائیلی حکومت امریکہ نے قائم کی ہے اور یہودیوں کی موجودہ بقا وترقی سب امریکہ کی دین ہے۔ شارح بخاری فرمایا کرتے تھے اسرائیلی حکومت امریکہ کی ناجائز اولاد ہے، آج اگر امریکہ یہودیوں کی پشت پناہی چھوڑ دے تو پھر دنیا دیکھے گی کہ ان کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ اسی مضمون کو حضرت شارح بخاری نے اپنے اس

عنوان میں انتہائی دلچسپ اور تحقیقی پیرائے میں سپرد قلم فرمایا ہے۔

یزید کا مسئلہ: دیوبندی برادری کے ایک مایۂ ناز فرزند محمود احمد عباسی امروہوی نے یہ شگوفہ چھوڑا کہ یزید خلیفۂ برحق تھا۔ امام عالی مقام سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاطی و باغی تھے، یزید کے بارے میں حدیث میں بشارت آئی ہے کہ وہ بخشا جائے گا۔ اس کے ثبوت میں اس نے بخاری شریف کی یہ حدیث پیش کی۔

"اول جیش من امتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم"

میری امت کا وہ پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے اسے بخش دیا جائے گا۔

اپنی دیوبندی سرشت کے مطابق امروہوی نے مدینہ قیصر سے قسطنطنیہ مراد لیا اور دھاندلی سے اس لشکر کو جس میں یزید ایک معمولی سپاہی کی طرح شریک تھا اس لشکر کا سپہ سالار بنا کر قسطنطنیہ پر پہلا حملہ آور قرار دیا۔

اس کی اس گمراہ کن بات کا جواب ہمارے اجلہ علمائے اہل سنت نے مختلف پیرائے میں دیا جو ماہنامہ پاسبان کے "حسین نمبر" کربلا کا مسافر" میں موجود ہے۔ حضرت شارح بخاری نے بھی خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ کی فرمائش پر قلم اٹھایا اور عنوان کا حق ادا کر دیا جس کا جی چاہے کربلا کا مسافر نمبر پڑھ لے وہ خود سمجھ لے گا کہ شارح بخاری کا مضمون اس نمبر کی جان ہے۔

پاسبان کے لیے جو مضمون حضرت نے تحریر فرمایا تھا وہ شارحین حدیث کی ترجمانی تھی مگر اس کے بعد حضرت مولانا حافظ مبین الدین امروہوی علیہ الرحمہ کی رہنمائی میں حضرت شارح بخاری نے اس حدیث پر تحقیق شروع فرمائی تو بڑے بڑے محققین انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس حدیث پر تین طریقے سے کلام فرمایا۔

اول: حدیث میں قسطنطنیہ کا لفظ نہیں "مدینہ قیصر" ہے جس کا ترجمہ ہوگا" قیصر کے شہر پر" یعنی میری امت کا وہ پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا بخشا جائے گا اس سے خاص قسطنطنیہ ہی مراد ہے یہ کہاں ہے؟ قیصر کی حدود سلطنت کا کوئی بھی شہر مراد ہو سکتا ہے۔ اس کے پیش نظر قیصر کے شہر پر پہلا حملہ عہد رسالت میں "موتہ" پر ۸ھ میں ہوا تھا۔ اب اس

حدیث کے مصداق غزوۂ موتہ کے مجاہدین ہوں گے۔ یہ نکتہ حضرت نے از خود استخراج فرمایا بعد میں تیسیر شرح جامع صغیر کے حاشیہ میں بھی یہی نکتہ تحریر ملا جسے مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے تحریر فرمایا تھا۔ یہ تطابق دیکھ کر حضرت شارح بخاری کو جس قدر خوشی ہوئی اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

دوم: اگر مدینہ قیصر سے اس کا دارالسلطنت مراد ہو تو عہد رسالت میں اس کا دارالسلطنت حمص تھا جو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد مبارک میں فتح ہوا اس تقدیر پر اس حدیث کے مصداق حمص فتح کرنے والے مجاہدین ہوں گے۔

سوم: اور اگر کسی کو یہی ضد ہو کہ مدینہ قیصر سے خاص قسطنطنیہ ہی مراد ہے تو بھی اس حدیث کا مصداق یزید نہیں ہوسکتا اس لیے کہ قسطنطنیہ پر پہلا حملہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۳۲ھ میں کیا تھا۔ اس تقدیر پر اس کے مصداق اس لشکر کے مجاہدین ہوں گے نہ کہ یزید۔ اس کے بعد ۴۳ھ میں بسر بن ارطاۃ نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ۴۶ھ میں حضرت عبدالرحمٰن بن خالد سیف اللہ نے کیا تھا اور جس لشکر میں یزید شریک تھا وہ قسطنطنیہ پر چوتھا یا پانچواں حملہ تھا اس لیے یزید اس حدیث کا مصداق ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا۔

چہارم: حضرت شارح بخاری نے انتہائی محققانہ طریقے سے ثابت فرمایا ہے کہ اس تقدیر پر بحری راستے سے جو پہلا لشکر مدینۂ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ آور ہوگا وہی لشکر الفاظ حدیث سے مراد ہے۔ یزید برّی راستہ سے گیا تھا۔ بحری راستہ سے نہیں اس لیے اس حدیث کا مصداق اس کا لشکر ہو ہی نہیں سکتا۔

امروہوی صاحب نے یزید کے خلیفہ برحق ہونے پر بڑے شد و مد کے ساتھ بحث کا دوسرا رخ یہ پیش کیا ہے کہ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ برحق تھے اور یہ بھی اہل سنت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ خلیفۂ برحق اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین نامزد کردے تو وہ بھی خلیفہ برحق ہوگا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی حیات مبارکہ ہی میں یزید کو اپنا ولی عہد و جانشین مقرر فرما کر اجلّہ صحابہ کرام اور عام مسلمانوں سے

اس کی بیعت بھی لے لی تھی اس لیے یزید کے خلیفہ برحق ہونے میں کسی کو کیا کلام ہوسکتا ہے اگر کوئی انکار کرتا ہے تو اہل سنت کے اجماع کے خلاف کرتا ہے۔ اور جب یزید برحق خلیفہ ہے تو سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس کے خلاف خروج خطا اور بغاوت تھی۔

امروہوی کی اس خرافاتی بحث کا جواب ہمارے علمائے اہل سنت نے متعدد طریقوں سے دیا ہے حضرت شارح بخاری کی محاسباتی گفتگو نے تو اس استدلال کی جڑ کاٹ کے رکھ دی ہے۔ فرماتے ہیں:

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ اپنا جانشین منتخب کرنے کے مجاز ہی نہ تھے کیوں کہ اس پر اہل سنت کا اجماع ہے کہ مولائے کائنات امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد خلیفہ برحق سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے اختلاف کیا نوبت جنگ تک پہنچی، نزاع ختم کرنے اور مسلمانوں کو ہلاکت وتباہی سے بچانے کی خاطر مصالحت ہوئی۔ سیدنا امام حسنِ مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رفع نزاع اور اصلاح کی خاطر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صرف ان کی حیات مبارکہ تک کے لیے خلافت سپرد فرمائی اور خود دست کش ہو گئے۔ صلح نامہ کی اہم ترین دفعہ یہ تھی۔

''حضرت معاویہ تاحیات خلیفہ رہیں گے اور ان کے بعد خلافت کا حق سیدنا امام حسن مجتبیٰ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو رہے گا''۔

اس معاہدہ کی روشنی میں سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جانشین نامزد کرنے کے مجاز نہ تھے اس لیے آپ کا انتخاب ساقط اور شرعاً غیر معتبر تھا۔ آپ کے وصال کے بعد یہ حق امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تھا لیکن حضرت بھی واصل بحق ہو چکے تھے اس لیے اس کی ذمہ داری ملت کے ارباب حل وعقد کے سر جاتی ہے۔ اور اس کے بارے میں مورخین کا اتفاق ہے کہ یزید کا انتخاب شورائی انداز میں نہیں ہوا تھا بلکہ وہ از خود غزہ کر کے تخت خلافت پر براجمان ہوگیا تھا اس لیے سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس کی خلافت کو تسلیم نہ کرنا بالکل حق بجانب تھا اسے نہ خطا کہہ سکتے ہیں نہ بغاوت''۔

اس طرح کی فیصلہ کن بحثیں آپ کو ان مقالات میں جگہ جگہ ملیں گی جن سے قارئین

ازخود حضرت کی ہمہ جہتی، فنی جامعیت، محققانہ بصیرت اور وسعت مطالعہ واستحضار کے اعتراف پر مجبور ہوں گے۔

مولائے کریم سلف کے اس علمی جانشین کا سایۂ فکر وفن ہمیشہ سلامت رکھے اور ان کے فیوضات علمیہ سے عالم اسلام کو استفادہ کا موقع عطا فرمائے۔ آمین!

نیاز مند

محمد ارشاد احمد رضوی مصباحی

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

یکم شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ

۱۰ر نومبر ۱۹۹۹ء

(باب اول)

شارح بخاری

حیات وخدمات، اوصاف اور کارنامے

بقلم
نفیس احمد مصباحی بارہ بنکوی
استاذ: جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندوستان کی سرزمین بڑی مردم خیز واقع ہوئی ہے۔ یہ اپنی ایک مستقل روشن علمی وفکری تاریخ رکھتی ہے۔ اس نے بے شمار ایسے افراد کو جنم دیا جنہوں نے ابر باراں بن کر چاردانگ عالم کو اپنے علمی وروحانی چھینٹوں سے سیراب کیا ہے، اور حیرت انگیز بوقلموں کارنامے انجام دے کر ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کا لوہا منوایا ہے۔ تصوف وروحانیت کے میدان میں حضرت داتا گنج بخش ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت نظام الدین اولیا، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت علاء الدین صابر کلیری، حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو دراز، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی اور مشائخ مارہرہ مطہرہ کی حیثیت آفتاب عالم تاب کی طرح روشن وتابناک ہے۔ علوم نقلیہ وفنون عقلیہ کے میدان میں ملک العلماء علامہ شہاب الدین دولت آبادی، شیخ محمد طاہر پٹنی گجراتی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، بحر العلوم علامہ عبدالعلی فرنگی محلی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی، علامہ فضل رسول بدایونی، تاج الفحول علامہ عبدالقادر بدایونی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی اور صدرالشریعہ علیہم الرحمۃ والرضوان جیسے ائمہ فکروفن کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک سنہری، روشن اور تابناک کڑی فقیہ اعظم ہند شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔

آپ آفاقی فکرونظر کے حامل، پرعزم حرکت وعمل کی چلتی پھرتی تصویر، جہد مسلسل، سعی پیہم، اخلاص ووفا کے پیکر جمیل، علم وحکمت کے بحر بے کراں، عمل وکردار کے سیل رواں اور گوناگوں فضائل وکمالات کے جامع کامل تھے۔

98194

ولادت ونسب:

آپ کی ولادت ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء میں ضلع اعظم گڑھ (حال ضلع مئو) کے نہایت

مشہور ومعروف اور مردم خیز خطہ قصبہ گھوسی کے محلہ کریم الدین پور میں ہوئی۔ آپ کا نسب نامہ کچھ اس طرح ہے:

مفتی شریف الحق امجدی بن عبدالصمد بن ثناء اللہ بن لعل محمد بن مولانا خیر الدین اعظمی۔

مولانا خیر الدین علیہ الرحمہ اپنے عہد میں پائے کے عالم اور صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے، ان کا یہ روحانی فیض آج تک جاری ہے کہ ان کے عہد سے لے کر اس دور میں پانچویں پشت تک ان کی نسل میں اجلۂ علماے کرام موجود ہیں۔ انہیں میں سے ایک شارح بخاری، فقیہ اعظم ہند حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جو ماضی قریب میں ہندوپاک کے مسلمانانِ اہل سنت کے صف اول کے مقتدا اور پوری دنیاے اہل سنت کے مرجع فتاویٰ اور مرکز عقیدت تھے۔

تعلیم وتربیت:

محلہ باغیچہ قصبہ گھوسی کے مقامی مکتب میں آپ نے ناظرۂ قرآن شریف کی تعلیم حاصل کی، اور صدر الشریعہ علامہ مفتی امجد علی رضوی اعظمی (مصنف بہار شریعت) کے منجھلے بھائی حکیم احمد علی علیہا الرحمہ سے گلستاں وبوستاں پڑھی بڑے ہی شوق، دلچسپی اور لگن کے ساتھ یہ تعلیم حاصل کی۔ ابتدا ہی سے آپ کے دل میں یہ امنگ اور جذبہ کارفرما تھا کہ کسی بڑی درس گاہ میں داخلہ لے کر جلیل القدر اساتذہ اور ماہرین علوم وفنون سے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ اسی تمنا اور لگن کے زیر اثر آپ نے ۱۰/شوال المکرم ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء کو دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور میں داخلہ لیا۔

واضح رہے کہ اس سے ایک سال قبل ۲۹/شوال ۱۳۵۲ھ کو قصبہ مبارک پور کا بخت خوابیدہ بیدار ہوا، اور وہاں کی مبارک سرزمین کو صدر الشریعہ کے عزیز ترین شاگرد، حافظ ملت، ابوالفیض علامہ شاہ عبدالعزیز مرادآبادی ثم مبارک پوری کی قدم بوسی نصیب ہوئی جن کی نگاہ کیمیا اثر نے اس قصبہ کی تقدیر ہی بدل کر رکھ دی۔ صدر الشریعہ کے حکم پر حافظ ملت کے مبارک پور آنے کی خوش خبری جوں ہی نسیم سحر کی طرح ضلع اعظم گڑھ اور اطراف وجوانب

میں پہلی تشنگانِ علوم نبویہ کے قافلے کشاں کشاں مبارک پور کی سرزمین کی طرف بڑھنے لگے۔ حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ اُن سابقین اولین میں سے ہیں جو حافظ ملت قدس سرہ کے مبارک پور آنے کے ایک سال بعد ہی حضور صدرالشریعہ علیہ الرحمہ کے ہمراہ آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ یہیں آپ نے حافظ ملت قدس سرہ کے زیر سایہ رہ کر آٹھ سال تک تعلیم حاصل کی۔ اس دوران آپ نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ابتدائی عربی سے لے کر صدرا، حمد اللہ، ہدایہ اور ترمذی شریف تک کتابیں بڑی محنت، عرق ریزی اور جاں سوزی کے ساتھ پڑھیں، اور حافظ ملت کے فیضان علم سے آپ کا سینہ موجزن ہونے لگا۔

محرم الحرام ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں سات آٹھ ماہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ اندر کوٹ میرٹھ کے بھی آپ طالب علم رہے، یہاں آپ نے صدرالعلماء حضرت مولانا سید غلام جیلانی علی گڑھی ثم میرٹھی سے حاشیہ عبدالغفور اور شمس بازغہ وغیرہ اور خیرالاذکیاء حضرت علامہ مولانا غلام یزدانی اعظمی سے خیالی و قاضی مبارک وغیرہ اہم کتابوں کا درس لیا۔

شوال ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں آپ مدرسہ مظہر اسلام مسجد بی بی جی، محلہ، بہاری پور، بریلی شریف پہنچے، جہاں ابوالفضل حضرت علامہ سردار احمد گورداس پوری ثم لائل پوری محدث اعظم پاکستان کا خورشید علم تمام تر تابانیوں کے ساتھ اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ محدث اعظم پاکستان سے آپ نے صحاح ستہ حرفاً حرفاً پڑھ کر دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ اور ۱۵ر شعبان ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء کو درس نظامی سے آپ کی فراغت ہوئی۔ صدرالشریعہ مولانا امجد علی اعظمی، صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مفتی اعظم مولانا مصطفےٰ رضا قادری نوری اور دیگر اجلہ علما و مشائخ اہل سنت نے اپنے مقدس ہاتھوں سے دستارِ فضیلت اور جبہ سے نوازا، اور اسی مبارک و مسعود موقع پر حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ نے غایت کرم سے مدرسے کی عام سند کے علاوہ اپنی سندِ خاص سے بھی سرفراز فرمایا۔

اساتذہ و مشائخ کرام میں جن حضرات کی تعلیم و تربیت کا آپ کی زندگی پر گہرا اثر تھا، ان میں صدرالشریعہ، مفتی اعظم ہند مولانا مصطفےٰ رضا خاں، حافظ ملت ابوالفیض مولانا شاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اور محدث اعظم پاکستان ابوالفضل

مولانا سردار احمد قادری رضوی بانی مظہر اسلام بریلی شریف و جامعہ رضویہ مظہر اسلام لائل پور، فیصل آباد پاکستان علیہم الرحمہ سرفہرست ہیں، خصوصیت کے ساتھ آپ نے حافظ ملت سے سب سے زیادہ فیض پایا۔ اس لیے حافظ ملت سے آپ کو غایت درجہ قلبی الفت اور والہانہ عشق وعقیدت تھی۔

درس نظامی کے علاوہ فتویٰ نویسی کی تعلیم وتمرین ایک سال سے زائد حضور صدرالشریعہ علیہ الرحمہ سے حاصل کی اور حضور مفتی اعظم قدس سرہ کی بارگاہ میں گیارہ سال رہ کر فتویٰ نویسی سیکھی، یہاں تک کہ ایک معتمد ومستند مفتی اور فقیہ کی حیثیت سے آپ کی ذات گرامی برصغیر ہند وپاک میں معروف ومشہور ہوگئی اور ''نائب مفتی اعظم ہند'' کے لقب سے آپ کو علمی حلقوں میں یاد کیا جانے لگا۔

شیوخ واساتذہ:

شارح بخاری کے دورِ طالب علمی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کے شیوخ واساتذہ کی فہرست میں درج ذیل اسمائے گرامی آتے ہیں:

(۱) صدرالشریعہ مولانا حکیم امجد علی اعظمی (مصنف بہار شریعت، فتاویٰ امجدیہ وغیرہ)

(۲) مفتی اعظم ہند مولانا شاہ مصطفےٰ رضا قادری نوری بریلوی شہزادۂ اعلیٰ حضرت۔

(۳) حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی، بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ

(۴) محدث اعظم پاکستان مولانا محمد سردار احمد قادری چشتی گورداس پوری ثم لائل پوری

(۵) صدرالعلماء مولانا سید غلام جیلانی علی گڑھی ثم میرٹھی (مصنف بشیر القاری شرح بخاری وغیرہ)

(۶) خیرالاذکیاء مولانا غلام یزدانی اعظمی، سابق صدرالمدرسین مظہر اسلام بریلی شریف

(۷) شیخ المعقولات، مولانا محمد سلیمان بھاگل پوری، سابق شیخ الحدیث جامعہ حمیدیہ رضویہ، مدن پورہ بنارس، یوپی

(۸) مولانا ثناءاللہ محدث مئوی

(۹) مولانا غلام محی الدین بلیاوی
(۱۰) شیخ التجوید مولانا قاری محمد عثمان اعظمی (صاحب مصباح التجوید)
(۱۱) بلبل فارسی مولانا سید شمس الحق گجہوی، مبارک پوری
(۱۲) حکیم احمد علی اعظمی (برادر صدر الشریعہ)
(۱۳) ماسٹر علیم اللہ خاں، قصبہ گھوسی ضلع مئو
(۱۴) مولوی محمد شریف اعظمی، قصبہ گھوسی ضلع مئو
(۱۵) مولوی غلام یٰسین، قصبہ گھوسی ضلع مئو

مذکورہ علمائے کرام ومشائخ عظام اور اساتذۂ ذوی الاحترام سے مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں شارح بخاری نے درس لیا، استفادہ کیا، ان کے دامن فضل وکمال سے خوشہ چینی کی، اور اپنے آپ کو زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ تغمدھم اللہ تعالیٰ بغفرانہ واسکنھم بحبوحۃ جنانہ۔

تدریسی میدان میں:

ماہر فن اور جلیل القدر اساتذہ کرام سے اکتسابِ علم کرنے کے بعد حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ نے تقریباً پینتیس سال تک نہایت ذمہ داری کے ساتھ بڑی عرق ریزی وجاں سوزی اور کمال مہارت کے ساتھ ہندوستان کے مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ہر فن کی مشکل سے مشکل ترین کتابیں پڑھائیں، برسہا برس تک دورۂ حدیث بھی پڑھاتے رہے۔ اور اخیر میں درس وتدریس کا مشغلہ چھوڑ کر جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں شعبہ افتا کی مسند صدارت پر متمکن ہوکر چوبیس برس تک رشد وہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے، جن درس گاہوں کی مسند تدریس وافتا پر جلوہ افروز ہوکر آپ نے علم وحکمت کے گوہر آبدار لٹائے ان کے اسماء درج ذیل ہیں:

(۱) مدرسہ بحر العلوم، مئو ناتھ بھنجن، ضلع اعظم گڑھ (۲) مدرسہ شمس العلوم، گھوسی ضلع اعظم گڑھ (۳) مدرسہ خیر الاسلام جپلہ، پلاموں، بہار (۴) مدرسہ حنفیہ مالیگاؤں، مہاراشٹر

(۵) مدرسہ فضل رحمانیہ پچپڑوا، گونڈہ (۶) مدرسہ عین العلوم، گیوال بگہہ، گیا، بہار (۷) جامعہ عربیہ انوار القرآن، بلرام پور، گونڈہ (۸) دار العلوم ندائے حق، جلال پور فیض آباد (۹) دار العلوم مظہر اسلام مسجد بی بی جی، بریلی شریف (۱۰) الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور۔

تلامذہ:

آپ کی درس گاہِ فیض سے شعور وآگہی کی دولت حاصل کرنے والے طلبہ اتنے کثیر ہیں کہ ان سب کا شمار تقریباً ناممکن ہے۔ ان میں سے چند مشہور حضرات کے نام پیش خدمت ہیں جو اس وقت اہلسنت وجماعت کے نامور علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔

☆ خواجہ مظفر حسین رضوی پورنوی ☆ مولانا مجیب اشرف اعظمی ثم ناگپوری ☆ قاضی عبدالرحیم بستوی، بریلی شریف ☆ مولانا رحمت حسین کلیمی، بائسی پورنیہ ☆ مولانا قمرالدین اشرفی اعظمی ☆ مولانا عزیزالحسن اعظمی ☆ مولانا حفیظ اللہ اعظمی ☆ مولانا سلطان احمد ادروی ☆ مولانا امام الدین مصطفوی ☆ مولانا محمد کوثر خاں نعیمی (جہانگیر گنج) ☆ مولانا افتخار احمد قادری ☆ مفتی شفیق احمد، گونڈہ ☆ مولانا محمد عمر بہرائچی ☆ مولانا غلام ربانی فائق القادری ☆ مولانا رحمت اللہ بلرام پوری ☆ مولانا عبدالودود فقیہ، رائے بریلی ☆ مولانا قاری شفیق احمد، پچپڑوا ☆ مفتی شفیق احمد شریفی ☆ مولانا طیش محمد شریفی ☆ مولانا فروغ احمد اعظمی صدرالمدرسین دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی۔

اور اساتذہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں مفتی محمد نظام الدین رضوی ☆ مولانا حافظ عبدالحق رضوی ☆ مفتی محمد معراج قادری ☆ مفتی بدر عالم فیض آبادی ☆ مفتی محمد نسیم مصباحی ☆ مفتی محمد ارشاد احمد مصباحی (سہسرام)

اور ارکانِ المجمع الاسلامی مبارک پور علامہ محمد احمد مصباحی اعظمی ☆ مولانا یٰسین اختر مصباحی ☆ مولانا افتخار احمد قادری ☆ مولانا عبدالمبین نعمانی اور مولانا بدرالقادری مصباحی نے سیکڑوں بار سیکڑوں مباحث ومسائل میں آپ سے استفادہ کیا۔ اس اعتبار سے مذکورہ ارکان بھی آپ کے تلامذہ کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ (شارح بخاری: ص ۲۳)

اور فقیر راقم سطور نے اگر چہ باضابطہ کوئی کتاب تو آپ سے نہ پڑھی لیکن جامعہ

اشرفیہ میں مدرس ہو جانے کے بعد دو سال تک متعدد مسائل وابحاث اور عباراتِ کتب کے حل کے سلسلے میں حضرت سے خاص استفادہ کیا، اور اس دوران آپ کے فیضان وکرم اور شفقت ومہربانی کی بارش میں نہانے کا خوب موقع ملا، اس لیے خود کو ان کا ادنیٰ تلمیذ کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

بیعت وخلافت:

دار العلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور کے ایک جلسہ منعقدہ ۱۳۵۹ھ میں صدر الشریعہ علامہ شاہ محمد امجد علی قادری رضوی اعظمی خلیفہ امام احمد رضا قادری بریلوی مبارک پور تشریف لائے تو بغیر کسی ترغیب وتحریک کے آپ انہیں سے بیعت ہوئے۔ آپ حضرت صدر الشریعہ کے سابقین اولین مریدوں میں سے ہیں۔ شوال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء کو دوسرے سفر حج وزیارت کے موقع پر صدر الشریعہ قدس سرہ نے آپ کو سلسلہ عالیہ قادریہ برکاتیہ رضویہ کی اجازت دی، اور بریلی شریف کے قیام کے زمانے میں حضور مفتی اعظم علامہ شاہ مصطفےٰ رضا قادری نوری بریلوی خلف اصغر مجدد اسلام امام احمد رضا قادری قدس سرہما نے ۷؍رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ کو "النور والبہاء" میں مذکورہ انتالیس سلاسل قرآن وحدیث وسلاسل اولیاء اللہ کی تحریری اجازت کے ساتھ سلسلہ قادریہ برکاتیہ رضویہ کی بھی اجازت مرحمت فرمائی، علاوہ ازیں ۱۳۸۳ھ میں مفتی اعظم نے "الاجازات المتینہ" میں درج تمام سلاسل کی بھی اجازت عطا فرمائی، اور احسن العلماء حضرت سید شاہ مصطفےٰ حیدر حسن علیہ الرحمہ سجادہ نشین خانقاہِ قادریہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے عرس قاسمی ۱۴۰۴ھ کے موقع پر بلا طلب اپنے خاندان کے تمام سلاسل جدیدہ کی اجازت عطا فرمائی اور دستار بندی فرمائی۔

خلفا ومریدین:

حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کی حیات طیبہ تک آپ جلد کسی کو مرید نہیں فرماتے تھے، جو طالب آتا اسے مفتی اعظم یا حافظ ملت سے مرید کرا دیتے۔ ان بزرگوں کے وصال

کے بعد بھی جب کوئی بہت اصرار کرتا تو آپ بیعت فرماتے، یہی حال خلافت کا تھا۔ اسی لیے آپ کے مریدین اور خلفا کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ خلفا میں چند نام یہ ہیں:

حضرت علامہ عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہاں پوری علیہ الرحمہ (لاہور) ☆ مولانا حافظ عبدالحق رضوی (جامعہ اشرفیہ مبارک پور) ☆ مولانا رجب علی بلرام پوری (بنارس) ☆ مولانا طیش محمد شریفی (دھول پور) ☆ مولانا ولی اللہ شریفی (ممبئی) ☆ مولانا حافظ شمیم الزماں فیض آبادی (ہوڑہ) ☆ مولانا محب اللہ شریفی (کرناٹک) ☆ مولانا بشیر احمد قادری (جالون) ☆ صاحبزادہ مولانا حافظ حمید الحق (قصبہ گھوسی، اعظم گڑھ) ☆ مولانا بدر عالم مصباحی (جامعہ اشرفیہ مبارکپور) ☆ مولانا محمد نسیم مصباحی (جامعہ اشرفیہ مبارکپور) ☆ مولانا خلیق احمد اعظمی ☆ مولانا ادریس بستوی ☆ مولانا صغیر احمد جوکھنپوری۔

ہند و بیرون ہند کے علما و مشائخ کو اجازتیں:

آپ کو اپنے اساتذہ و مشائخ سے سلاسل قرآن و حدیث، سلاسل طریقت اور اوراد و وظائف کی اجازتیں حاصل تھیں جن کی تفصیل خود آپ کے تحریر کردہ مقالہ بعنوان "اجازت و اسانید" مطبوعہ معارف شارح بخاری، صفحہ ۲۳۸ تا ۲۴۹ میں موجود ہے۔ اسی میں آپ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

جن سلاسل کی مجھے اجازت ہے، ان کی تعداد اٹھہتر (۷۸) ہے، اجازات قرآن مجید گیارہ (۱۱)، سلاسل احادیث انتالیس (۳۹)، سلاسل اولیاء اللہ اٹھارہ (۱۸)، حرزِ یمانی، حزب البحر وغیرہ اوراد و وظائف کی اجازتیں نو (۹)، سند فقہ۔

اتنی اجازتیں آپ کے معاصرین میں شاید باید چند علما کو حاصل ہوں، اس طرح آپ کی ذات ان تمام سلاسل کی سنگم اور مجمع البحار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہند و بیرون ہند کے بہت سے علما و مشائخ نے آپ سے اجازتیں لیں۔ اور آپ نے طالب کے ظرف کے مطابق قرآن و حدیث و فقہ اور دیگر سلاسل کی اجازتیں عطا کیں۔ ان اجازت یافتہ حضرات میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

☆ مولانا مفتی مجیب اشرف اعظمی ثم ناگپوری ☆ مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہاں پوری ثم لاہوری (علیہ الرحمہ) ☆ مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری، شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ قادریہ لاہور ☆ مولانا مفتی محمد حسن علی میلسی، ملتان، پاکستان ☆ سمیر القاضی، امریکہ ☆ شیخ سلیم علوان، انڈونیشیا ☆ شیخ حسام قراقیرہ، رئیس جمعیۃ المشاریع الخیریہ، بیروت، لبنان ☆ شیخ غانم جلول، طرابلس ☆ شیخ ابراہیم شافعی، آسٹریلیا ☆ شیخ نزار فاخوری، سوئزرلینڈ ☆ شیخ موفق رفاعی، سوئزرلینڈ ☆ الاستاذ ریاض ناشف، امریکہ ☆ الاستاذ محمد کابہ غینیا ☆ شیخ ماہر تمیم، اوکرانیا ☆ شیخ محمد الولی، ڈنمارک ☆ شیخ ڈاکٹر احمد تمیم اوکرانیا ☆ شیخ یوسف داؤد، جرمنی ☆ شیخ ڈاکٹر سید ارشاد احمد بنگلہ دیش ☆ شیخ کمال راغب، بیروت لبنان۔

حج وزیارت:

حرمین شریفین کی حاضری اورفریضہ حج کی ادائیگی دونوں جہان کی برکتوں اورسعادتوں کا ذریعہ ہے۔ حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کئی بار دیارِ حرم کی آبلہ پائی فرمائی۔ ذوالحجہ ۱۴۰۵ھ رستمبر ۱۹۸۵ء میں آپ نے پہلا حج فرمایا، ممبئی سے جدہ کے لیے پرواز کرنے میں جانشین سید العلماء حضرت سید آل رسول حسنین میاں نظمی برکاتی مارہروی، مولانا خلیل احمد پٹھان (ماہم شریف، ممبئی)، قاری تراب علی رضوی (منارہ مسجد، ممبئی) ایک ہی ہوائی جہاز سے حضرت شارح بخاری کے ہم سفر تھے۔ دوسرا حج ۱۴۱۸ھ ر۱۹۹۷ء میں فرمایا۔ ایک عمرہ کا سفر ۱۹۹۶ء میں اور دوسرا عمرہ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ جنوری ۱۹۹۸ء میں دوسرے سفر حج سے پہلے کیا۔

تبحر علمی:

حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے متبحر اساتذہ کرام سے بڑی شوق، محنت اوردل چسپی سے اکتساب علم کیا، اور جملہ علوم وفنون متداولہ میں مہارت تامہ حاصل کی، درسی کتابوں کے علاوہ بے شمار علمی، فنی اور مذہبی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا یہاں تک کہ آپ کی ذات علوم اسلامیہ اورفنون دینیہ کی بحر بے کراں بن گئی۔ آپ نے علم وفن کی ہر وادی میں قدم

رکھا، اور فکر و آگہی کے ہر میدان کو سر کیا، سلوک و معرفت کے ہر چشمے سے سیرابی حاصل کی۔ یہاں تک کہ ہم عصر علما میں آپ کو نمایاں مقام حاصل ہو گیا، اور عوام تو عوام، خواص بھی اپنے پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے حل کے لیے آپ کی طرف رجوع کرنے لگے، اور ماضی قریب میں تو آپ جیسا گونا گوں فضائل و کمالات کا حامل اور ہمہ جہت خوبیوں کا مالک اہل علم کی انجمن میں کوئی نظر نہیں آتا۔ ذلک فضل اللہ یوتیه من یشاء ۔

فقہ و افتا:

یوں تو حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو تمام مروجہ علوم و فنون میں ید طولیٰ حاصل تھا مگر فقہ و افتا میں آپ کو جو نمایاں اور امتیازی مقام حاصل تھا اس کی نظیر عہد حاضر میں کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ بات حقائق مسلمہ میں سے ہے کہ فتویٰ نویسی کے لیے صرف علوم اسلامیہ اور فنون دینیہ میں مہارت کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کسی ماہر تجربہ کار فقیہ و مفتی کی بارگاہ میں زانوے تلمذ تہ کرنا اور اپنے تحریر کردہ فتاویٰ سنا کر اصلاح لینا ضروری ہے۔ اس طرح اس کو بڑی حد تک علم طب سے مشابہت ہے جو صرف پڑھ لینے اور مطالعہ کر لینے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ کسی طبیب حاذق کے مطب میں باضابطہ مشق و ممارست ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

اس لیے کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم و فاضل ہو، دقیق النظر، ژرف نگاہ اور وسیع المطالعہ ہو مگر فقہاے کرام اسے فتویٰ نویسی کی اجازت اس وقت تک نہیں دیتے جب تک کہ وہ کسی ماہر، تجربہ کار مفتی کی خدمت میں رہ کر مشق افتا نہ کرے۔ اسے یوں سمجھئے کہ ایک ڈاکٹر کئی اہم ڈگری حاصل کر چکا ہے لیکن اسے آپریشن کرنے کی اجازت نہیں ملتی، جب تک کہ وہ کسی ماہر سرجن کے ساتھ رہ کر سرجری کی مشق کر کے کامل نہ بن جائے۔ بلکہ ڈاکٹر کو صرف تعلیم سے فراغت کے بعد مطب کرنے کی بھی اجازت نہیں ملتی جب تک وہ ''ہاؤس جاب'' نہ کر لے۔ یعنی کسی اسپتال میں جا کر کہنہ مشق ڈاکٹروں کی نگرانی میں وہ ایک مدت تک امراض کی تشخیص اور نسخہ کی تجویز کی مشق نہ کر لے۔ یہی حال فتویٰ نویسی کا ہے۔

مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

"ردّ وہابیہ اور افتا یہ دونوں ایسے فن ہیں کہ طب کی طرح یہ بھی صرف پڑھنے سے نہیں آتے، ان میں بھی طبیب حاذق کے مطب میں بیٹھنے کی ضرورت ہے، میں بھی ایک حاذق ڈاکٹر کے مطب میں سات برس بیٹھا، مجھے وہ وقت، وہ دن، وہ جگہ، وہ مسائل اور جہاں سے وہ آئے تھے اچھی طرح یاد ہیں۔ میں نے ایک بار ایک نہایت پیچیدہ حکم بڑی کوشش وجاں فشانی سے نکالا، اور اس کی تائیدات مع تنقیح آٹھ ورق میں جمع کیں، مگر جب حضرت والد ماجد قدس سرہ کے حضور میں پیش کیا تو انہوں نے ایک جملہ ایسا فرمایا کہ اس سے یہ سب رد ہو گئے"۔ (الملفوظ: ج ۱: ص ۸۴)

شعبان ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء سے شوال ۱۳۶۷ھ/اگست ۱۹۴۸ء تک مسلسل چودہ مہینے آپ نے اپنے وطن قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڑھ میں حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی قادری رضوی اعظمی علیہ الرحمہ (مصنف بہار شریعت) سے مختلف انداز سے فقہی استفادہ اور فتویٰ نویسی کی مشق کی۔ دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف کے زمانۂ تدریس از شوال ۱۳۷۵ھ رجون ۱۹۵۶ء تا ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء گیارہ سال، دوماہ، تین دن کی طویل مدت میں آپ نے مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ سے ہزاروں بار، ہزاروں مسائل میں علمی استفادہ کیا اور فتویٰ نویسی کی بھرپور مشق وتمرین کی، اور جلد ہی اپنی خداداد قابلیت ولیاقت، ذہانت وذکاوت، مطالعہ کے ذوق وشوق کی بناپر حضرت مفتی اعظم کے معتمد بن گئے اور عوام وخواص میں "نائب مفتی اعظم ہند" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ فقہ وافتا کے میدان میں امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ کے تلامذہ وخلفا میں صدر الشریعہ اور مفتی اعظم علیہما الرحمہ کو جو امتیازی شان حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ امام احمد رضا نے ان دونوں حضرات کو پورے متحدہ ہندوستان کا قاضی ومفتی مقرر کیا تھا، جس سے قضا وافتا میں ان کی جامعیت اور تفوق کی واضح نشان دہی ہوتی ہے۔ ایسے دو عظیم ترین فقہا ومفتیان کرام کے نظر کردہ و پروردہ اور معتمد مفتی حضرت شارح بخاری کی فقہی وفنی حیثیت روز روشن کی طرح نمایاں ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی حسن اتفاق ہے کہ فقیہ اسلام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے سب سے پہلا مسئلہ رضاعت کا تحریر فرمایا، مفتی اعظم علیہ الرحمہ کی خدمت میں بھی پہلا

مسئلہ رضاعت ہی کا پیش ہوا، جس کا آپ نے جواب دیا، اور ان کے پوتا شاگرد و نائب مفتی اعظم (شارح بخاری) نے بھی پہلا مسئلہ رضاعت ہی کا لکھا۔

تقریبا پچیس ہزار فتاویٰ آپ نے بریلی شریف میں قیام کے دوران تحریر فرمائے اور زبانی طور پر عوام وخواص کو ہزاروں مسائل سے روشناس کرایا، اور یہ سلسلہ ان سبھی مدارس اہل سنت کے زمانہ تدریس میں جاری رہا جہاں آپ مختلف اوقات میں استاذ کی حیثیت سے پہنچتے رہے۔ لیکن ذوالحجہ ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء سے الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں تشریف لانے کے بعد صرف افتا کی خدمت آپ کے سپرد کی گئی۔ کئی کئی معاون مفتی آپ کی سرپرستی ونگرانی میں آپ کے شعبہ افتا میں رہے اور صدر شعبہ افتا کی حیثیت سے آپ فتاویٰ کی اصلاح وتصدیق فرماتے۔ اور خود بھی برجستہ فتاویٰ املا کراتے۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں قیام کے دوران آپ کے لکھے ہوئے فتاوے تقریبا ساٹھ ہزار ہیں۔

انہیں خصوصیات وامتیازات اور فقہ وافتا میں نصف صدی کی مشق وممارست، تجربہ ومہارت، نظر دقیق وفکر عمیق اور نیابت مفتی اعظم ہند نے پندرہویں صدی ہجری کے رُبع اول اور بیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں شارح بخاری کو ''مرجع الفتاویٰ'' کے منصب رفیع پر فائز کردیا یہاں تک کہ اس دور اخیر میں حنفیہ کی ریاست آپ کی ہشت پہلو ذات پر ختم ہوگئی۔

محقق مسائل جدیدہ حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی دام ظلہ استاذ ومفتی جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ جنہوں نے آپ سے فقہ وافتا میں سب سے زیادہ استفادہ کیا، اور عصر حاضر کے مفتیان کرام میں نہایت ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ہیں، وہ حضرت کے فتاویٰ کے خصائص ومحاسن کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

'' میری دانست میں حضرت کے فتاویٰ میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک استاذ فن، ماہر مفتی کے فتووں میں ہونی چاہئیں۔ مثلاً:

(۱) کتاب اللہ سے استدلال۔

(۲) حدیث رسول اللہ سے استدلال۔

(۳) اجماع امت سے استدلال۔

بٹھائے، اور حضرت صدر الافاضل علامہ نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر خزائن العرفان میں اس کے تحت جو افادہ فرمایا ہے اس پر غور کرے کہ افادہ کی ضرورت کیا ہے۔

مزید برآں تفسیرات احمدیہ، مدارک التنزیل، تفسیر صاوی، تفسیر خازن کا بھی مطالعہ کرے۔ شروحِ حدیث میں اشعۃ اللمعات، مرقات، فتح الباری، عمدۃ القاری، (عینی) کی ان احادیث کا ضرور مطالعہ کرے، جن کا تعلق عقائد واعمال سے ہو، اگر پوری مطالعہ کر لے تو کیا کہنا۔ عقائد میں شرح عقائد، المعتمد المستند، اور اعلیٰ حضرت کے تمام رسائل کا مطالعہ کرے۔" (معارف شارح بخاری: ص ۷۱،۸۲،۸۷)

رد ومناظرہ:

ماضی کے اکابر علماے اہل سنت میں شیر بیشۂ سنت مولانا ہدایت رسول قادری برکاتی رام پوری ثم لکھنوی، مناظر اہل سنت مولانا حشمت علی لکھنوی ثم پیلی بھیتی، مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمٰن قادری اڑیسوی، اجمل العلماء مفتی شاہ محمد اجمل حسین سنبھلی علیہم الرحمۃ والرضوان رد ومناظرہ کے مردِ میدان تھے اور ماضی قریب میں شارح بخاری علیہ الرحمہ ان شیرانِ اسلام کی یادگار اور ان کے پرچم حق کے علمبردار تھے۔

یوں تو تدریس، افتا اور تصنیف سب کے سب بہت اہم کام ہیں، مگر بعض وجوہ کی بنا پر مناظرہ سب سے اہم ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تدریس بہت مشکل کام ہے، مگر مدرس جانتا ہے کہ ہمیں کل فلاں کتاب میں فلاں سبق پڑھانا ہے، اس لیے وہ شروح وحواشی اور دیگر معاون کتابوں کی مدد سے اس کی بھرپور تیاری کر لیتا ہے، پڑھنے والے نیاز مند شاگرد ہوتے ہیں، اگر درسی تقریر میں کوئی غلطی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، اس کی تصحیح ہو جاتی ہے، تصنیف میں مصنف ایک موضوع ذہن میں متعین کر کے اس سلسلے میں گہرا مطالعہ کرتا ہے اور حاصل مطالعہ میں سے جو چاہتا ہے سکون واطمینان کے ساتھ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ افتا میں اگرچہ کبھی سوالات بہت پیچیدہ اور اہم ہوتے ہیں مگر مفتی کو غور وفکر اور مطالعہ کا موقع رہتا ہے کہ گھنٹے دو گھنٹے، ہفتے دو ہفتے، مہینے دو مہینے میں جب مسئلہ

حل ہوجائے، جواب لکھے۔ لیکن مناظرہ ان سب سے مختلف ایک جاں گداز اور دل سوز عمل ہے۔ مناظر مناظرہ سے پہلے موضوع کے متعلق موافق ومخالف دلائل وشواہد اور ابحاث ذہن میں بٹھالیتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ بحث اسی دائرہ میں محدود رہے۔ موضوع اور اس کے دلائل کے متعلق کوئی بھی سوال اٹھ سکتا ہے، اور بحث چھڑ سکتی ہے۔ اس لیے اس میں منقولات ومعقولات میں تبحر، اسلامی وعربی علوم وفنون پر عبور تاریخ واحوال زمانہ سے آگہی، حریف ومد مقابل کی شاطرانہ چالوں سے باخبری، اس کی کمزوری پر نظر، تحقیقی والزامی جواب، حملہ ودفاع کا بروقت فیصلہ اور استحضار علمی وتیقظ قلبی جیسے اوصاف کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ نہ صرف ان اوصاف کے ساتھ متصف تھے بلکہ ان میں کمال ومہارت رکھتے تھے۔

آپ نے بہت سے مناظروں میں مختلف حیثیتوں سے شرکت فرمائی، کہیں مناظر اہلسنت کا علمی تعاون کیا، کہیں خود مناظرہ کیا، کہیں مناظرہ کی صدارت کی، درج ذیل مقامات کے مناظروں میں آپ کا سرگرم اور نمایاں کردار رہا۔

(۱) بریلی شریف میں قادیانی سے مناظرہ، بزمانہ طالب علمی (۲) رائے پور ضلع لکھیم پور کھیری (۳) باندو چترا، ضلع پلاموں (۴) بھمن گاؤں، ضلع بستی، سیتاپور (۵) جھریا ضلع دھنباد (۶) کٹک، اڑیسہ (۷) بجرڈیہہ بنارس (۸) سعدی مدن پور ضلع فتح پور (۹) بدایوں۔

وعظ وخطابت:

تقریر وخطابت کی سحر انگیزی اور سرعتِ تاثیر ساری دنیا میں مسلم ہے۔ خود حدیث نبوی میں بھی اس صفت کا بیان موجود ہے کہ ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً وَاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا" خالق لم یزل نے حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ کو دیگر اوصاف حمیدہ کے ساتھ تقریر وتبلیغ اور وعظ وخطابت کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ بحیثیت مقرر مدت دراز سے آپ ملک کے بے شمار شہروں کا دورہ کرتے رہے، حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کی معیت ورفاقت میں بھی آپ نے سیکڑوں بار ہندوستان کے

مختلف علاقوں میں جا کر تقریر و تبلیغ کی ۔ لاکھوں افراد آپ کی تقریر سے متاثر اور بہت سے لوگ معاصی و منکرات سے تائب ہوئے ۔ آپ کی تقریریں پُر مغز، پُر درد، دل پذیر اور پتھر کو موم بنانے والی ہوتی تھیں ۔ جس موضوع پر بولتے بہت جلد اس کے تمام ضروری گوشوں کا احاطہ کر کے ان پر بھر پور روشنی ڈالتے، قرآن و حدیث، اقوال صحابہ و تابعین اور آثار سلف سے استدلال فرماتے ۔ اور کمال یہ ہے کہ اہم سے اہم اور پیچیدہ سے پیچیدہ عنوان پر برجستہ تقریر کرتے، اور اس سے متعلق ایسی معلومات پیش کرتے کہ عوام تو عوام، خواص بھی انگشت بدنداں نظر آتے ۔ خود میں نے آپ کی بہت سی تقریریں سنی ہیں ۔ ”وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین“ کے عنوان پر گہوارۂ علم و ادب لکھنؤ کی سرزمین پر میں نے آپ کی ایسی پُر مغز اور پُر نکات تقریر سنی کہ اس ڈھنگ سے اس عنوان پر آج تک کسی بڑے سے بڑے خطیب اور عالم سے تقریر سننے میں نہ آئی ۔

آپ کی تقریر تبلیغ و اشاعت دین اور احقاق حق و ابطال باطل کی نیت سے ہوتی تھیں، اس لیے ان میں اخلاص بھی ہوتا تھا اور سادگی تھی، درد بھی ہوتا تھا، اور بے خوفی بھی، قوت و توانائی بھی ہوتی تھی اور معانی و مفاہیم کی کثرت بھی، اپنوں کے دل کی ٹھنڈک بھی ہوتی تھی اور منکرین کے لیے تلوار و نیزہ کی مار بھی، عشق کا سوز و ساز بھی ہوتا، اور حق کی آواز بھی ۔

خیر الاذکیاء حضرت علامہ محمد مصباحی دام ظلہ صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ مبارک پور فرماتے ہیں:

” میں نے آپ کی تقریر میں چند خاص باتیں محسوس کیں ۔ (۱) عالمانہ وقار (۲) اعتقادی اور علمی لحاظ سے پختگی (۳) جملوں اور مضامین کی صحت و ندرت (۴) مضمون علمی اور مشکل ہونے کے باوجود بہت آسان انداز میں ایسا بیان کہ عوام کو بھی بخوبی سمجھ میں آئے ۔ (۵) ترتیب میں ایسی عمدگی کہ پورا خطاب ذہن نشیں رہے، اور چاہیں تو اسی ترتیب کے ساتھ سامعین دوسروں کو سمجھا سکیں (۶) ایسا دلچسپ اور موثر خطاب کہ اکتاہٹ نہ ہو (۷) سطحی و غیر تحقیقی باتوں سے مکمل اجتناب ۔

تقریریں کئی طرح کی ہوتی ہیں: (۱) ادق اور علمی جن کو اہل علم ہی سمجھ سکیں (۲) سطحی

اور دلچسپ جن کو عوام تو پسند کریں ، مگر اہل علم حقارت سے دیکھیں (۳) غیر تحقیقی باتوں کی کثرت، علمی و تاریخی لحاظ سے غلط، روایات میں اپنی جانب سے بے جا اضافے، الفاظ کے، جملوں کے، مضامین کے، غلط سیاق وسباق کے پیوند پر پیوند، مگر بیان میں ایسی چاشنی اور زور کہ عوام وجد میں آجائیں۔ ایسی تقریروں سے ان خطبا کے کشکول بھرے ہوتے ہیں، جنہیں رضائے خدا ورسول سے زیادہ خوشنودیِ عوام عزیز ہوتی ہے، اور ثواب آخرت سے زیادہ حُطام دنیا جمع کرنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ (۴) روایت ودرایت اور علم و تحقیق کی رو سے صحیح معلومات کی جامع اور زبان و بیان کے لحاظ سے دلچسپ اور عام فہم جس سے عوام وخواص دونوں نفع اندوز ہوں۔

قسم اول کا دائرۂ نفع محدود ہے، قسم دوم وسوم کی کثرت ہے، ایسی تقریریں اور ایسے خطبا ہر دور میں عوام کے دل ودماغ پر چھائے رہے، مگر صحیح معنی میں خطاب اور خطابت وہی ہے جو چوتھی قسم کے معیار پر کامل ہو۔ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ کی تقریر کیچ قسم سے تعلق رکھتی تھی اور نہایت جامع ،مفید اور بصیرت افروز ہوتی تھی۔ وہ اعتقادات پر ایسے ٹھوس دلائل کے ساتھ خطاب فرماتے کہ مذبذب انسان کا ایمان درست ہوجائے اور صحیح الاعتقاد شخص، راسخ الاعتقاد ہوکر اپنے دین کا مبلغ ہوجائے، عملیات پر بھی ایسی موثر باتیں پیش کرتے کہ انسان انہیں اپنا کر صالح واطاعت شعار ہوجائے۔ علمی تقریبات اور مجمعِ علما میں بھی ایسا مختصر اور نکات ومعارف سے بھرپور خطاب فرماتے جو اُن کے لیے فکر وبصیرت کے نئے دریچے کھول دے، اور علم وآگہی کے نئے گوشے روشن کردے۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔[1] آپ کی خطابت کا علمی رنگ اس وقت خوب خوب نکھرتا جب آپ اپنے مذہبی حریف کے قصر باطل کی دھجیاں بکھیر رہے ہوں، آپ کی بہت سی تقریریں اپنی یادگار آپ ہیں۔ غیر مقلدوں کی تردید میں گجرات کی تقریر ایسی زوردار اور پر مغز تھی کہ عوام تو عوام علمائے کرام کے ذہنوں میں بھی اس کی گونج ایک عرصۂ دراز تک باقی رہی۔ ختم بخاری شریف کی ساعتِ سعید میں جو تعارفی اور تنقیدی تقریر ہوتی تھی اس کا اپنا رنگ ہوتا۔

تحریر وتصنیف:

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان کی فکر وقلم، تحریر وتصنیف اور زبان وادب سے گہری وابستگی ابتدائے عمر سے رہی، یہی سبب ہے کہ طالب علمی کا زمانہ رہا ہو یا عہد شباب، شعور کی پختگی ہو یا کبر سنی، علمی وتصنیفی مصروفیات نے ہمیشہ آپ کے لمحاتِ زندگی کا

(۱) معارفِ شارحِ بخاری، ص ۲۹۰، ۲۹۱۔

احاطہ کیے رکھا۔ تدریس وافتا کی گراں بار ذمہ داریوں کے ساتھ آپ قرطاس وقلم کا بھی حق ادا کرتے رہے، ان کی تحریر وتصنیف نصف صدی پر محیط ہے۔ ابتدا ہی سے آپ نے وقیع مضامین ومقالات لکھے، اور آپ کے سیال قلم نے جس وادی کا رخ کیا، اسے سیراب کیا، جس حق کو چاہا، اس کا چہرہ نکھار کر روشن کر دیا، اور جس باطل پر کمند ڈالی اسے کھینچ کر اپنے پاؤں سے روند ڈالا، گویا کہ کلکِ امجدی میں کلکِ رضا کی حمایتِ حق واستیصالِ باطل کی جلوہ آرائی وکارفرمائی ہے، سطوت وصولت کا غلغلہ وہمہمہ ہے، اور فیضان وتوفیق کا حسین امتزاج ہے۔

مختلف دینی وعلمی موضوعات پر آپ کی قیمتی اور جامع تحریریں اور وقیع وموثر مقالے دبدبۂ سکندری رام پور، نوری کرن بریلی شریف، پاسبان الہ آباد، جام کوثر کلکتہ، استقامت کانپور، اشرفیہ مبارکپور، رفاقت پٹنہ، حجاز جدید دہلی وغیرہ رسالوں میں چھپ کر عوام وخواص کے درمیان مقبول ہوتی رہیں۔ ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور میں التزام وتسلسل کے ساتھ آپ کے منتخب فتاویٰ چھپ کر ماہنامہ کا وقار بلند اور قارئین کی تعداد میں اضافہ کرتے رہے۔ آپ کے مطبوعہ مضامین یکجا کرکے "مقالاتِ شارح بخاری" کے نام سے شائع ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہیں، امید ہے کہ علم وادب کا یہ شاہکار، فکر وآگہی کا سنگم، زبان وبیان کا مرقع، تنقید وتبصرہ کی دستاویز، تحقیق وتدقیق کا شیریں چشمہ، ملی درد وکرب کا آئینہ اور دین وعقیدہ کا بحرِ زخار قارئین کی علمی وفکری پیاس بجھائے گا، ان کے شعور واحساس کو مہمیز کرے گا اور ان کے فکر وعقیدہ کی زنگ صاف کرکے اسے صیقل کرے گا۔

مختلف مدارس اہل سنت کے زمانۂ تدریس میں منتشر طور پر مختلف موضوعات پر کتب ومضامین لکھنے کا عمل جاری رہا، لیکن جامعہ اشرفیہ، مبارک پور آنے کے بعد مولانا یٰسین اختر مصباحی اور مولانا افتخار احمد قادری مصباحی کی درخواست اور اصرار پر آپ نے صحیح بخاری کا ترجمہ لکھنے کا بیڑہ اٹھایا، پھر علامہ محمد احمد مصباحی صدرالمدرسین جامعہ اشرفیہ، مبارک پور کی گزارش پر ترجمے کے ساتھ شرح کا کام بھی شروع فرمایا، بفضلہٖ تعالیٰ ۱۱ر رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ / مطابق ۳۰ر دسمبر ۱۹۹۸ء کو یہ عظیم دینی ومذہبی اور علمی وتاریخی کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچا، جس کی خوشی میں ۲۱ر شوال ۱۴۲۰ھ / مطابق ۲۹ر جنوری ۲۰۰۰ء کو عروس البلاد ممبئی میں "رضا

اکیڈمی'' کے زیر اہتمام دو روزہ عظیم الشان ''جشن تکمیل شرح بخاری'' منایا گیا، جس میں آپ کو چاندی سے تولا گیا، مگر ناظرین و حاضرین اجلاس کی آنکھیں فرط حیرت سے اس وقت پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب آپ نے اسی وقت منبر رسول پر ایک تہائی چاندی رضا اکیڈمی ممبئی کو تصانیف اعلیٰ حضرت کی اشاعت کے لیے اور دو تہائی چاندی ازہرِ ہند جامعہ اشرفیہ مبارک پور کو مستقبل کے زریں منصوبوں کی تکمیل کے لیے وقف کرنے کا اعلان فرمایا: فقیر راقم سطور بھی اس جشن میں موجود تھا، میں نے دیکھا کہ بہت سے حاضرین کی آنکھیں اس تاریخی موقع پر فرطِ حیرت و مسرت سے ڈبڈبا آئیں۔

علمی سطح پر آپ کی تحریریں اور قلمی آثار علمی و تحقیقی ایجاز کا خوبصورت اور قیمتی رنگ لیے رہتی ہیں، باتیں نپی تلی اور پتے کی ہوتی ہیں، مضامین کی فراوانی بھی خوب ہوتی ہے لیکن مفہوم کی ترسیل اور مضامین کی تفہیم کہیں بھی متاثر نہیں ہوتی، جن کا امتیازی وصف تحقیق و تدقیق ہوتا ہے، سرعت تحریر میں اپنا جواب آپ تھے۔ بجرڈیہہ کے مناظرہ میں غیر مقلدین کی ہفتوں میں تیار شدہ مفصل تحریر کے جوابات بہت سرعت کے ساتھ تحریر کرائے جب کہ آپ ان دنوں علیل چل رہے تھے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں میں طویل مقالات و مضامین، لمبے اور تحقیقی فتاویٰ بلکہ کتابیں لکھانا تو عام بات ہے۔

رشحات قلم:

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان کے اشہبِ قلم سے مختلف عنوانات پر متعدد کتابیں معرض تحریر میں آئیں، جو میری ناقص معلومات کے مطابق درج ذیل ہیں:

(۱) **نزهة القاری شرح صحیح البخاری**: $\frac{۲۰\times۳۰}{۸}$ سائز کے پانچ ہزار صفحات پر پھیلا ہوا اسلامی علوم و معارف اور حدیث و سنت کی تحقیقات و تدقیقات کا دائرۃ المعارف، علماے متقدمین و متاخرین اور سلف صالحین کی عربی و فارسی شروح کا عطر مجموعہ ہے جو ۹ جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۲) **اشرفُ السِّیَر**: اس کتاب میں سیرت نبوی کے بنیادی ستون، محمد بن

اسحٰق (۱۵۱ھ/۷۶۸ء) محمد بن عمر الواقدی (۲۰۷ھ/۸۲۲ء) محمد بن سعد (م ۲۳۰ھ/۸۴۴ء) محبّ الدین بن جریر طبری (۳۱۰ھ) پر فن تاریخ وحدیث اور سیرت کے حوالے سے مخالفین کے اعتراضات کے دندان شکن علمی جوابات، سیرت پاک سے متعلق مغربی ظالمانہ اور جاہلانہ اور مشرق کے مرعوبانہ اور معذرت خواہانہ طرزِ عمل پر سیر حاصل تنقیدی و تحقیقی کلام، اور ابتدا سے بعثت نبوی تک سرکار کے احوالِ وکوائف اور آپ کے آبا واجداد کے تعلق سے جامع، پُر مغز اور معلوماتی گفتگو کی گئی ہے۔ $\frac{۳۶×۲۳}{۱۶}$ سائز کے ۲۳۱ صفحات پر مشتمل یک اہم علمی و تحقیقی دستاویز ہے۔

(۳) **اشک رواں**: آزادیِ ہند سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ کی خود غرضی اور مفاد پرستی پر مبنی پُر فریب سیاست پر ضرب کاری، اور اس کی مخالفت اور مسلمانوں کے لیے اسلامی وشرعی نقطۂ نظر سے تیسرے متبادل کی تجویز۔ تقسیم ہند کے بعد ہونے والی مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو کی تباہی وبربادی اور بعد میں انہیں درپیش سیاسی وسماجی، مذہبی وملی پریشانیوں اور رسوائیوں کو اپنی دور بیں نگاہوں سے بھانپ کر اس پر اپنے قلبی وذہنی اضطراب، بے کلی اور بے چینی کا اظہار، اور پھر اس کے تدارک کے لیے مسلمانوں سے دردمندانہ اپیل، یہ سب کچھ اس کتاب میں شامل ہے، شارح بخاری نے پچیس برس کی عمر میں اسلامی سیاست کے موضوع پر یہ کتاب تحریر فرمائی ہے۔ آزادیِ ہند وتقسیم ہند سے پہلے ۱۹۴۶ء کے پُر آشوب وپُر فتن دور میں اس کی اشاعت ہوئی۔

(۴) **اسلام اور چاند کا سفر**: شرعاً چاند پر انسان کا پہنچنا ممکن ہے، اسلامیات اور فلکیات کے اصول وقواعد اور قوانین ومباحث کی روشنی میں اِس مدعا پر محققانہ گفتگو کی گئی ہے جو آپ کے وسعت مطالعہ، ژرف نگاہی، قوت استدلال اور زور بیان کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ یہ $\frac{۳۶×۲۳}{۱۶}$ سائز کے ۴۰ صفحات پر پھیلی ہوئی محققانہ وعالمانہ تحقیقات وابحاث کا حسین گلدستہ ہے۔

(۵) **تحقیقات**: اس میں وہابیوں، دیوبندیوں اور معاندین اہلسنت کے کچھ لایعنی اعتراضات کے مدلل، تحقیقی والزامی جوابات ہیں۔ یہ کتاب $\frac{۳۶×۲۳}{۱۶}$ سائز کے ۲۸۸

صفحات پر مشتمل، دو حصوں میں ہے۔

(۶) متنوں کی سرزمین کون، نجد یا عراق؟ اس کتاب میں نجد و عراق کا ایک گراں قدر، حقیقت افروز اور ایمان افزا تاریخی، جغرافیائی اور دینی و سیاسی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ سائز ۲۳x۳۶/۱۶ کے صفحات پر مشتمل ہے۔

(۷) سنی، دیوبندی اختلافات کا منصفانہ جائزہ: یہ سنی و دیوبندی اختلافات کی بنیاد اور اعیان وہابیہ و دیوبندیہ کی کفری عبارتوں پر غیر جانب دارانہ، فیصلہ کن ابحاث کا خوبصورت علمی گلدستہ ہے، آپ کی یہ کتاب اپنے موضوع پر لاجواب اور بے مثال ہے: یہ ۲۳x۳۶/۱۶ کے صفحات پر مشتمل ہے۔

(۸) اثبات ایصال ثواب: ایصال ثواب کے موضوع پر مصنف کی ایک نئے انداز میں بحث، میلاد و قیام، نیاز و فاتحہ کے سلسلے میں شکوک وشبہات کی وادیوں میں بھٹکنے والوں کے اطمینان کلی کے لیے ایک بیش قیمت، زوردار علمی دستاویز۔ سائز ۲۳x۳۶/۱۶ صفحات: ۸۰۔

(۹) مفتی اعظم ہند اپنے فضل وکمال کے آئینے میں: یہ رسالہ حبر امت، افقہِ ملت سیدنا مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کے حالات، دینی و علمی خدمات اور زریں کارناموں کی آنکھوں دیکھی روداد، اور ان کے اوصاف وکمالات کا بیش بہا، مرقع ہے۔ جو اس مقالہ میں شامل ہے۔

(۱۰) شہادت حسین کا ذمہ دار کون؟ سوانح کربلا کے تعلق سے ایک علمی و تحقیقی تحریر اور شرعی و تاریخی دلائل سے لبریز دل آویز مقالہ۔

(۱۱) مسائل حج وزیارت: یہ زیارت حرمین طیبین اور مناسک حج کے عنوان پر آسان اردو زبان میں پیش قیمت علمی کتاب ہے۔ جو اس مقالہ میں شامل ہے۔

(۱۲) السراج الکامل: اس رسالہ میں صدر الافاضل فخر الاماثل حضرت علامہ نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہ صاحب تفسیر خزائن العرفان کے بعض اقوال کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔

(۱۳) **فرقوں کی تفصیل:** یہ ابتداے اسلام سے عصر حاضر تک بنام اسلام جنم لینے والے فرقوں کے عقائد واحوال پر ایک مختصر اور جامع مقالہ ہے۔ جو جلد اول کے باب دوم میں شامل ہے۔

(۱۴) **تعلیقات فتاویٰ امجدیہ:** یہ فتاویٰ امجدیہ جلد اول ودوم پر آپ کے ان بصیرت افروز، عالمانہ وفقیہانہ حواشی وتعلیقات کا مجموعہ ہے، جو آپ کی علمی گہرائی وگیرائی، فقہی بصیرت اور وسعت فکر ونظر کے آئینہ دار ہیں، فتاویٰ کی جلد اول ۲۰×۳۰/۸ کے چار سو پچیس صفحات اور جلد دوم تین سو اٹھاسی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

(۱۵) **تعلیقات سِنَانِ جانکاہ بَدِلِ غیر مُقلدانِ گمراہ:** یہ اہل سنت وجماعت اور غیر مقلدین کے درمیان بجرڈیہہ، بنارس میں ہوئے تحریری مناظرہ کی روداد ہے اور اس پر ہر تحریر کے شروع میں بڑے قیمتی نوٹ اور حواشی لگائے ہیں، جن سے حضرت کی مناظرانہ صلاحیت، نقاد ذہن، طبعی جودت اور تجزیاتی ذہن وفکری کی عکاسی ہوتی ہے۔

(۱۶) **مقالات شارح بخاری:** یہ دینی ومذہبی، علمی وادبی، تاریخی وسوانحی، فکری وتحقیقی گوناگوں عنوانات پر حضرت کے سیکڑوں بوقلموں مضامین کا مجموعہ ہے، بحمدہ تعالیٰ یہ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوکر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

(۱۷) **مسئلۂ تکفیر اور امام احمد رضا:** اپنے موضوع پر نہایت شاندار، گراں قدر، اور اچھوتی محققانہ ومتکلمانہ تحریر، جو موضوع کے تمام زاویوں کو حاوی، اور شبہات کے سارے تار وپود بکھیرنے والی ہے۔ سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ صفحات: ۴۸

(۱۸) **فتاویٰ شریفیہ:** آپ کے زندگی بھر کے علمی وتحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ، جو ایک اندازے کے مطابق پچھتر ہزار سے زائد فتاویٰ کو محیط ہوگا۔ جلد اول کی ترتیب کا کام ہو رہا ہے، انشاء اللہ مستقبل قریب ہی میں طبع ہوکر لوگوں کی عقائد واعمال کے میدان میں رہنمائی کرے گا۔ اور اہل علم اور ارباب فقہ وفتاویٰ سے خراج تحسین حاصل کرے گا۔

(۱۹) **اذان خطبہ کہاں ہو؟** (افادات)

(۲۰) **تنقید برمحل:** (افادات)

موخر الذکر دونوں کتابیں حضرت کے علمی افادات کا مجموعہ ہیں جنہیں آپ کے تلمیذ ارشد حضرت مولانا عبدالحق رضوی استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور نے جمع فرمایا ہے۔

حاضر جوابی:

گونا گوں اوصاف وکمالات اور فضائل ومحاسن کی جامعیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حاضر جوابی کی دولت سے بھی سرفراز فرمایا تھا، آپ مخاطب کی بات سنتے ہی نہایت برق رفتاری کے ساتھ اس کے تمام گوشوں کا احاطہ کر لیتے اور پھر برجستہ ایسا جواب عنایت فرماتے کہ اگر وہ معاند اور ہٹ دھرم ہے تو لا جواب ہوکر خاموش ہو جاتا، ورنہ مطمئن ہوکر واپس جاتا۔

جولائی ۱۹۹۶ء میں آپ نے پاکستان اور افریقہ کا ایک طویل دعوتی وتبلیغی سفر کیا، اسی موقع سے تنزانیہ کے دار السلطنت ''دارالسلام'' میں ایک شخص نے جسے وہابیوں نے اپنے چنگل میں لے لیا تھا، علم غیب رسول سے متعلق متعدد سوالات کیے ان میں سے ایک سوال یہ تھا:

سوال: جب بتا دیا گیا تو غیب کہاں رہا؟ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے۔ اس کا آپ نے برجستہ یہ جواب دیا:

جواب: یہ دراصل وہابیوں کا مغالطہ عامۃ الورود ہے، جاہلوں میں اس کا بڑا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں، اچھا بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ غیب جانتا ہے یا نہیں؟

وہ بھولا بھالا، اس نے ایمان کی بات کہہ دی کہ'' اللہ تعالیٰ غیب جانتا ہے'' پھر حضرت نے فرمایا: اللہ ہر چیز کو دیکھتا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: دیکھتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا ہے تو وہ اب غیب کہاں رہا؟ یہ سن کر وہ بے چارہ دم بخود ہو گیا، بعد میں حضرت نے اسے سمجھایا کہ یہ غیب ہمارے اعتبار سے ہے، اللہ عزوجل اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اعتبار سے نہیں، جس پر وہ مطمئن ہو گیا اور خوش خوش واپس ہو گیا۔ (معارف شارح بخاری: صفحہ ۳۶۸)

ایک مرتبہ آپ حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کے ہمراہ جونا گڑھ کاٹھیاواڑ کے تبلیغی سفر

پر تشریف لے گئے، اسی سفر کی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

''اسی سفر میں جوناگڑھ کے ایک شیعہ نے حضرت (مفتی اعظم قدس سرہ) کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث قرطاس لے کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی شروع کردی، حضرت (مفتی اعظم) نے پہلے اس کو ڈانٹا کہ تمیز سے بات کرو، ہم حضرت فاروق اعظم کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرطاس کس سے مانگا تھا؟ اس نے کہا: حاضرین سے۔ میں نے کہا: مریض جب کوئی چیز مانگتا ہے تو اس کو مہیا کرنا گھر والوں کا فرض ہوتا ہے۔ حضرت علی اور حضرت فاطمہ پر پہلے یہ فرض عائد تھا کہ قرطاس حاضر کرتے۔ انہوں نے کیوں نہیں حاضر کیا؟ اگر یہ جرم ہے تو تمہارے اعتراض اور نکتہ چینی کے مطابق اس کے سب سے بڑے مجرم حضرت علی، حضرت سیدہ فاطمہ ہیں۔ اس پر اس کی بولتی بند ہوگئی، اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ (حوالہ سابق: ص ۴۱۹)

حق گوئی:

حق گوئی اور بے باکی، ایک داعی، مبلغ، مصلح، مرشد، عالم دین اور مومن کامل کی صفات لازمہ سے ہیں۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حق تعالیٰ نے یہ وصف بھی آپ کی ذات میں خوب ودیعت فرمایا تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ منکرات سے صلح کو حرام سمجھتے تھے اور اس باب میں آپ ذرہ برابر صرف نظر اور چشم پوشی کے قائل نہیں تھے، شرع مطہر کے خلاف کوئی بات دیکھتے تو فوراً اس پر تنبیہ فرماتے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی انجام دہی میں کوئی لچک اور نرمی روا نہیں رکھتے، اور نہ ہی کسی کی رعایت فرماتے۔ بہت سے لوگ آپ کے اس مومنانہ اور مجاہدانہ وصف کو ''شدت'' ''سختی'' اور نہ جانے کن کن الفاظ وکلمات سے تعبیر کرتے تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث نبوی ''مــن

رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ وان لم یستطع فبلسانہ" پر عمل ہوتا تھا۔ اور ارشاد رسالت "السَّاکِتُ عَنِ الْحَقِّ شَیْطَانٌ اَخْرَسُ" ہر وقت آپ کے پیش نظر رہتا تھا۔

دادودہش اور مہمان نوازی:

مہمان نوازی اور سخاوت وفیاضی اخلاق کریمانہ اور صفات مومنانہ میں شمار ہوتی ہیں۔ حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان اوصاف میں بھی منفرد اور نمایاں تھے۔ غائبانہ طور سے تو میں پہلے ہی اس بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا مگر بچشم سر اس وصف کا مشاہدہ اس وقت ہوا جب کہ شوال ۱۴۱۸ھ میں الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں بحیثیت استاذ میرا تقرر ہوا۔ آپ کا روزانہ کا معمول تھا کہ نماز عصر سے فراغت کے بعد اپنے کمرہ کے سامنے برآمدہ میں کرسی پر تشریف رکھتے اور اساتذۂ جامعہ اشرفیہ حاشیوں پر بچھی ہوئی کرسیوں پر تشریف فرما ہوتے۔ آپ بلا ترد د روزانہ اپنی جیب خاص سے عصرانہ کا انتظام فرماتے۔ اس کے علاوہ باہر سے آنے والے مہمانوں کا بھی ایک تسلسل رہتا، جن کی ضیافت کا فریضہ بھی آپ بحسن وخوبی انجام دیتے۔

گیارہ بجے شب میں گیارہ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ کو گیارہ علماے کرام کی موجودگی میں جب نزہۃ القاری شرح بخاری تکمیل آشنا ہوئی تو آپ نے فوراً وسیع پیمانے پر علما اور صلحا کی افطاری اور ضیافت کے اعلیٰ پیمانے پر انتظام کا حکم دیا، آپ کے فرزند اکبر ڈاکٹر محب الحق رضوی انتظام وانصرام میں ہمہ تن مصروف ہوگئے، طرح طرح کے لذیذ کھانوں، پھلوں، میووں اور اشیاے خورد ونوش سے دستر خوان سجایا گیا۔ اسی ہجوم میں حکیم مولانا رمضان علی علیہ الرحمہ کے بڑے صاحبزادے مرغوب احمد، ڈاکٹر صاحب کو لینے آگئے۔ مولانا مرحوم حضرت شارح بخاری کے معاصرین اور رفقا میں شمار ہوتے ہیں۔ مرغوب احمد اور ان کی لڑکی کی علالت کی خبر سن کر حضرت حد درجہ ملول خاطر ہوئے۔ فوراً ڈاکٹر صاحب کو مریضہ کا معائنہ کرکے مرض کی صحیح تشخیص کے بعد ہر طرح کی سہولت بہم پہنچانے کی تاکید اور ہدایت فرمائی،

اور اپنی جیب خاص سے سو روپے نکال کر مرغوب احمد کو عنایت فرمائے، اور بعد میں ملتے رہنے کے لیے بھی آپ نے ہدایت فرمائی۔ (معارف شارح بخاری: ص ۴۴۴)

اوقات کی پابندی:

وقت ایک ایسی انمول دولت ہے جو گذرنے کے بعد کسی طرح واپس نہیں آسکتی۔ وقت کو کام میں لانا اپنی زندگی کو کارآمد بنانا ہے اور وقت کو ضائع کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ عرب کی مشہور حکیمانہ کہاوت ہے: "الوقت هو الحياة فلاتقتلوه"

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان شروع ہی سے اوقات کی حد درجہ قدر فرماتے اور ان کی بھرپور نگہداشت اور پابندی فرماتے تھے۔ ایک لمحہ بھی بیکار ضائع نہیں ہونے دیتے۔ عام علما کا تو یہ حال ہے کہ چھٹی کے ایام اور فراغت کے اوقات سیر و تفریح اور دیگر غیر ضروری امور میں صرف کر دیتے ہیں، اور ان میں مطالعہ کتب، مذاکرۂ علمی، درس تدریس اور دیگر علمی مشاغل کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں، مگر شارح بخاری علیہ الرحمہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا کہ اکیاسی برس کی عمر اور ضعف بصارت کے باوجود اگر کوئی معاون نہیں ملتا تو تنہا دار الافتاء میں بیٹھ کر ٹیبل لیمپ جلا کر خوردبین کی مدد سے باریک اور نہایت چھوٹے حروف والی کتابیں مطالعہ فرماتے آپ نے اپنے اوقات مختلف دینی و ملی، علمی و فنی اور تحریری و تصنیفی کاموں کے لیے بانٹ رکھے تھے، جن کی آپ ہر موسم میں پابندی فرماتے، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔

احساس ذمہ داری:

حضرت فقیہ اعظم ہند علیہ الرحمہ کو اللہ تعالیٰ نے جو منصب جلیل عطا فرمایا تھا اس کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا احساس بھی خوب عطا فرمایا تھا۔ میں نے آپ کی زندگی کا جو دور دیکھا اس میں آپ ایک ممتاز ترین مفتی اور مایہ ناز مناظر کے منصب پر فائز نظر آئے۔ اس کے علاوہ منتظم، مدبر، سیاسی و سماجی سوجھ بوجھ کا مالک اور ماہر تعلیم بھی پایا۔ ان تمام صلاحیتوں کو جس خوبی کے ساتھ آپ نے استعمال فرمایا وہ قابل رشک حد تک بہتر تناسب لیے ہوئے تھا۔ اسی سال سے زائد عمر، عارضۂ قلب اور حاسدین کی

ریشہ دوانیوں کا ملال لیے یہ ضعیف العمر ذات گرامی جس قدر تعمیر امت کے کاموں میں مصروف نظر آئی، باصلاحیت جوانوں کو بھی اتنا منہمک نہ دیکھا۔

فجر کی نماز کے بعد شرح بخاری میں مصروف رہتے، آٹھ بجے دارالافتاء میں تشریف رکھتے، اور بارہ بجے دن تک چار گھنٹے مسلسل فتاویٰ املا کراتے۔ نائبین کے فتاویٰ سماعت فرماتے، اصلاح کرتے، تخصص فی الفقہ کے طلبہ کی فقہی تربیت فرماتے۔ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد پھر دارالافتاء تشریف لاتے اور دو گھنٹے مسلسل کام کرتے، عصر کے بعد عمومی نشست ہوتی جس میں اساتذۂ جامعہ کے ہجوم میں آپ صدر نشیں ہوتے، اس محفل میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، پھر نماز عشاء کے بعد سے لے کر گیارہ بجے شب تک شرح بخاری کا سلسلہ جاری رہتا۔ پھر نماز عشا اور کھانے سے فراغت ہوتی، یہ روز کا معمول تھا، جمعرات و جمعہ کو کام کی شرح میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔

وقت کی بربادی سے بڑھ کر آپ کے نزدیک کوئی نقصان نہ تھا۔ مولانا ارشاد احمد رضوی مصباحی لکھتے ہیں:

ہزاری باغ کے اجلاس میں احقر بھی ساتھ تھا، منتظم حضرات نے جس ٹرین سے واپسی کا ٹکٹ بنوایا، وہ شام کو پانچ بجے تھی، صبح کی ٹرین سے ریزرویشن نہیں ہو سکا، کوردہ علاقہ، بے علم لوگ، حضرت کڑھ کر رہ گئے، اس ملال کا کئی بار اظہار بھی فرمایا کہ سارا وقت بے کار گیا۔ (شارح بخاری نمبر، کنزالایمان دہلی: ص ۲۵۴)

شرح بخاری کا کام سب سے زیادہ رمضان شریف میں ہوتا، تراویح کے بعد نشست جمتی اور عموماً ایک بجے تک کام ہوتا رہتا۔ ذرا سوچیے! اسّی سال کا بوڑھا انسان، روزہ کی مشقت خیزی، افطار اور تراویح کے بعد نوجوان حضرات بھی عموماً خود کو کسی علمی کام کے قابل نہیں پاتے، لیکن اہل سنت کا یہ بوڑھا محسن، سلف کی علمی یادگار، اتنا سارا کام کر کے بھی نہ تھکتا بلکہ خود کو اور توانا محسوس کرتا۔ اور ''شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم'' کی پُرسکون بشاشت چہرہ پر پھیل جاتی۔

ملّی درد:

حضرت فقیہ اعظم ہند کی ذات میں گوناگوں علمی وفنی کمالات، اخلاقی وفکری محاسن کے ساتھ آپ کا سب سے قیمتی وشاندار وصف خلوص وللّٰہیت اور ملت اسلامیہ کے تعلق سے دردمندی کا احساس تھا، بارہا ان کی بھیگی پلکیں افتادِ امت کے ازالے کے واسطے مناجات کرتی نظر آئیں۔ ان کا دردمند دل رب العزت کے حضور سجدوں میں مچلتا دیکھا گیا، ان کے ناتواں بازو اسلامیانِ عالم کی مشکل کشائی میں ایسے مستعد نظر آئے، گویا جواں سالی لوٹ آئی ہو، ان کی آہوں کا درد، دل کا دھواں، احساس کی آنچ، دل کا سوز، جذبوں کی کسک، حوصلوں کی تڑپ، روح کا کرب، جسم کی توانائی، سب کی سب ملت کی فلاح وبہبود کے لیے نذر تھی، ملی دردمندی کے یہی جذبات واحساسات تھے جنہوں نے آپ کو ہمیشہ مضطرب اور آمادۂ عمل رکھا۔ جامعہ اشرفیہ کے ہر نازک موڑ پر کام آئے۔ ہر مشکل میں دست گیری کی۔

۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے وہ لمحات مسلمانوں کے لیے کتنے صبر آزما اور کربناک تھے، جب آر، ایس، ایس، بجرنگ دل، شیوسینا اور وشوہندو پریشد کے انتہا پسندوں، ظالم دہشت گردوں اور ہندو غنڈوں کے ہاتھوں تاریخی بابری مسجد شہید کردی گئی۔ اور ہندوستانی آئین کو دن کے اجالے میں برسرِ عام پیروں تلے روند ڈالا گیا، ملت اسلامیۂ ہند کے لیے ان نازک لمحات اور ہمت شکن اوقات میں حضرت کے تڑپتے جذبات، بھرّائے لہجے، برستی آنکھیں، لہولہان جگر، بارگاہِ خالق لم یزل میں اٹھے ہوئے لرزتے ہاتھ، تھرّاتے لب، کانپتے اعضا، دلدوز چیخوں میں ڈوبی دعائیں سنی گئیں، دل کی گہرائی سے نکلتی آہیں، امت کی بے بسی اور بے کسی کو اجاگر کرتے نالے، شعور واحساس کی پنہائیوں سے بلند ہوتا ہوا دردوسوز بھی کچھ دیکھا گیا۔

۱۹۹۱ء میں خلیج کی جنگ نے اسلامیانِ ہند کے دلوں کو جذبات کا آتش فشاں بنا دیا تھا۔ ہر دل دھڑک رہا تھا، اور ہر آنکھ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی، زندگی کی حرارتیں سرد پڑتی جارہی تھیں، ۱۷/جنوری کی دردناک صبح جب اٹھائیس ملکوں کی سورما ٹیمیں، تنہا شیر دل عراق پر بموں کی بارش کررہی تھیں، تو حضرت کے جواں سال جذبات ضعیفی کے عالم میں بھی

شعلہ بداماں تھے، جذبوں کی حدت اشکوں کی صورت میں اسلامی سوز اور ملی درد کا اظہار کر رہی تھی، ہچکیوں میں ڈوبی ہوئی ان کی دعائیں آج بھی یاد آتی ہیں تو دل کا عالم زیر وزبر ہونے لگتا ہے۔ ۸ ربجے صبح کو سبھی طلبہ کو دارالحدیث میں جمع ہونے کا حکم ہوا، پھر آپ نے مسنون دعائیں، استغفار اور کلمہ طیبہ ورد کرائے، اس کے بعد درد میں ڈوبی ہوئی آواز کیا بلند ہوئی کہ فضاؤں کا سکون غارت ہوگیا، دلوں کی شکیبائی چھن گئی، ہر آنکھ آنسوؤں میں ڈوب گئی، اور آہوں اور سسکیوں نے پوری فضا کو حسرت کا مزار بناڈالا۔

اس طرح کے نہ معلوم کتنے پردرد مواقع آپ کی زندگی میں آئے، ہر موقع پر آپ کو امت مسلمہ اور ملت بیضا کی بے بسی پر روتے بلکتے، اور سوزِ دروں کو اشکوں کی بارش سے ظاہر کرتے دیکھا گیا۔

اسلامی غیرت وحمیت:

اسلامی غیرت وحمیت اور دینی درد وکرب بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی نے اثنائے گفتگو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

إِنِی وَاللهِ لأرىٰ وُجوهاً وانی لأری أشواباً من الناس خليقاً أن يَفِرُّوا وَيَدَعُوْكَ ۔ (صحيح البخاری ج ۱ ص ۳۷۸)

بخدا! میں آپ کے پاس ایسے چہرے اور مختلف قبائل کے ایسے افراد دیکھ رہا ہوں جو آڑے وقت پر آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عروہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

امصص بظرَ اللاتِ، أنحنُ نَفِرُّ عنه ونَدَعُه ۔ (حواله سابق)

اپنے معبود لات کی شرمگاہ چوس، کیا ہم حضور کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

یہ افضل الخلق بعد الرسل سیدنا صدیق اکبر کی دینی غیرت، اسلامی حمیت اور ایمانی جوش ہی تھا جس نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں عروہ بن مسعود کو اتنی سخت بات کہنے پر مجبور کردیا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بعض عرب قبائل میں فتنۂ ارتداد نے سر ابھارا، اور انہوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کرنے کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی سے بھی انکار کر دیا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر مد زکوٰۃ میں ایک رسی بھی چھوٹ جائے گی تو میں اس کے لئے بھی ان سے جہاد کروں گا۔ خلیفہ دوم سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے عرض کیا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ برحق! ان لوگوں کے ساتھ نرمی اور چشم پوشی کیجئے۔ اتنا سننا تھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جلال میں آ گئے، اور حضرت عمر کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

أَجَبَّارٌ فِی الْجَاهِلِیَّةِ وَخَوَّارٌ فِی الْاِسْلَامِ، انه قَدِ انْقَطَعَ الْوَحْیُ وَتَمَّ الدِّیْنُ، أَیُنْقَصُ وَأَنَا حَیٌّ۔

اے عمر! زمانہ جاہلیت میں تم بہت سخت اور بہادر تھے، کیا اسلام لاکر بزدل اور پلپلے ہو گئے، وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا، اور دین اسلام مکمل ہو چکا، کیا میرے جیتے جی اس دین میں کچھ کمی کی جا سکتی ہے؟

کیا "أینقص و أنا حی" سے حضرت صدیق اکبر کا ایمانی تیور، دینی حمیت، اسلامی غیرت اور اسلامی عقائد و اعمال کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانے اور دین کی مکمل حفاظت اور نگہداشت کرنے کا جذبہ بے کراں نمایاں نہیں؟ یقیناً یہ اسی جوش ایمانی، جذبۂ دروں اور غیرت دینی کی کارفرمائی تھی جو انہیں سید الانبیاء، سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ خاص سے تحفہ میں ملی تھی۔

حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ گوناگوں اوصاف و کمالات کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بارگاہِ صدیقی کے اس وصف خاص سے بھی بہرہ مند تھے، اور یہ ان کی کتاب زندگی کا ایک نہایت روشن اور تابناک باب تھا۔ دین اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اگر کسی بد باطن نے کسی طرح کا کوئی حملہ کیا تو تحفظ اسلام اور تحفظ ناموسِ رسالت کی خاطر نتائج کی پرواہ کیے بغیر آپ سینہ سپر ہو گئے، اور اس وقت انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ کتنے لوگ میرے ساتھ ہیں، اور نہ اس کی کوئی پراہ کی کہ سامنے کون ہے، آپ کی اسلامی غیرت

وحمیت جوش میں آئی تو عوام کے درمیان پہنچ گئے، اور انہیں ساتھ لے کر ان کی قیادت کرتے ہوئے بلا خوف وخطر پرچم حق بلند کر دیا۔ وہ چاہے تقسیم ہند کے چند سال بعد الہ آباد کے ہندی اخبار ''امرت بازار پتر کار'' میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ مضمون شائع ہونے پر گھوسی، اعظم گڑھ کے مسلمانوں کو لے کر اس کے خلاف احتجاج کرنے کا معاملہ ہو، یا ۱۹۵۶ء میں اتر پردیش کے گورنر کے، ایم منشی کے زیر اہتمام چھپنے والے ''ریلچس لیڈرس'' نامی فتنہ انگیز کتاب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید توہین کیے جانے پر بریلی شریف میں احتجاجی جلسہ وجلوس کا موقع ہو، یا قصبہ بھنگا ضلع بہرائچ میں ایک ہندو پنڈت کی شانِ رسالت میں زبان درازی کرنے پر وہاں کی نئی مسجد کے افتتاحی اجلاس میں اس کی زبان درازی کا جواب دینے، اسلام وپیغمبر اسلام کی حقانیت اجاگر کرنے اور ہندوؤں اور ان کے دیوتاؤں کے گندے کرتوتوں کو برملا بیان کرنے کا معاملہ ہو، جس کے نتیجے میں آپ کو جیل بھی جانا پڑا، قید وبند کی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں اور اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں، اور ایک طویل عرصے تک مبارکپور اعظم گڑھ سے بہرائچ کچہری جاکر پیشیوں کی مشقتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ (واقعات کی تفصیل کے لیے رئیس التحریر علامہ یٰسین اختر مصباحی کی تحریر کردہ کتاب ''شارح بخاری'' کا مطالعہ کریں)

یوں ہی ہر واقف کار کو علم ہے کہ پورے ہندوستان میں جب بھی دینی اور مذہبی معاملات میں فضا گرم ہوتی، اور کوئی بھی بد مذہب انبیاء، اولیاء، سلف صالحین وبزرگان دین کے خلاف زہر افشانی کرتا، یا عقائد ومعمولات اہل سنت کے خلاف بکواس کرتا یا چیلنج مناظرہ دیتا تو آپ کو یارائے ضبط نہ رہتا، آپ سراپا اضطراب بن جاتے، اور جب تک اسے دندان شکن اور مُسکت جواب نہ دے لیتے، آپ کو سکون وقرار نہ ملتا، تمام برادران اہل سنت آپ کی اس نمایاں صفت اور ممتاز ادا سے واقف تھے، اس لیے ایسے مشکل وقت اور نازک گھڑی میں سب کی نگاہیں آپ پر جاکر ٹک جاتیں، جامعہ اشرفیہ کے ایک نامور فرزند ادیب شہیر مولانا بدر القادری مصباحی، مقیم حال ہالینڈ آپ کے اس وصف خاص کی ترجمانی کرتے ہوئے یوں نغمہ سنجی فرماتے ہیں:

تیرے ہوتے اہل سنت پہ کھلے کس کی زباں
فتنۂ اشرار کو رو کے تو وہ دیوار ہے

رزم گاہِ حق وباطل کی فضائیں ہیں گواہ
یوں مروڑا آج تک شل پنجۂ اشرار ہے

اور بدمذہبوں کی شر انگیزی اور دشمنانِ اسلام کی فتنہ پروری فرو ہوجاتی تو دوسرے شعلہ بار، دھواں دھار تقریر کرنے والے خطبا کو بلایا جاتا۔ اس پر کبھی کبھی حضرت موصوف طنز ومزاح کے انداز میں دیوانِ حماسہ کا یہ شعر پڑھتے۔

وَاِذَا تَكُوْنُ كَرِيْهَةٌ اُدْعٰى لَهَا
وَ اِذَا يُحَاسُ الْحَيْسُ يُدْعٰى جُنْدُبٗ

جب جنگ ہوتی ہے تو مجھے بلایا جاتا ہے اور جب حَیس (ایک قسم کا مخصوص کھانا) تیار کیا جاتا ہے تو جندب کو دعوت دی جاتی ہے۔

دینی غیرت وحمیت اتنا بڑا وصف کمال ہے کہ اگر حضرت کے اندر اس کے سوا اور کوئی فضل وکمال نہ بھی ہوتا تو یہ آپ کی مغفرت اور رفع درجات کے لیے کافی تھا۔ تسکین قلب کے لیے مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی کا درج ذیل ارشاد پڑھیے، آپ فرماتے ہیں:

امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک عالم صاحب کی وفات ہوئی، ان کو کسی نے خواب میں دیکھا، پوچھا آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ فرمایا: جنت عطا کی گئی، نہ علم کے سبب، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس نسبت کے سبب جو کتے کو راعی کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر وقت بھونک بھونک کر بھیڑوں کو بھیڑیے سے ہوشیار کرتا رہتا ہے۔ مانیں نہ مانیں یہ ان کا کام ہے، فرمایا کہ بھونکے جاؤ، بس اسی قدر نسبت کافی ہے، لاکھ ریاضتیں، لاکھ مجاہدے اس نسبت پر قربان، جس کو یہ نسبت حاصل، اس کو کسی مجاہدے کی ضرورت نہیں، اور اسی میں کیا ریاضت تھوڑی ہے؟ جو شخص عزلت نشیں ہوگیا، نہ اس کے قلب کو کوئی تکلیف پہنچ سکتی ہے، نہ اس کی آنکھوں کو، نہ اس کے کانوں کو۔ اس سے کہیے جس نے

او کھلی میں سر دیا ہے، اور چاروں طرف سے موسل کی مار پڑ رہی ہے۔ (الملفوظ ج ۳ ص ۳۸)

اگر آپ حضرت فقیہ اعظم ہند شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا سرسری جائزہ لیں تو محسوس کریں گے کہ زمانہ طالب علمی سے لے کر تادم آخر آپ نے دین و مذہب کے تحفظ کا کام کیا، اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک کا تعاقب کیا، اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کا ترکی بہ ترکی جواب دیا، اور پوری زندگی یہی پیغام دیتے رہے۔

میری قسمت کی قسم کھائیں سگانِ بغداد
ہند میں رہ کے بھی دیتا رہوں پہرا تیرا

اخیر میں اپنے مدعا کی تائید کے طور پر مخدوم گرامی خیر الاذکیاء صدر العلماء حضرت علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ، صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے گرانقدر تاثر کو پیش کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں جو موصوف نے اپنے چند مشاہدات وتاثرات کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے:

" دینی وملی غیرت واحساس ان میں معاصرین سے زیادہ دیکھتا ہوں، جب بھی اسلام وسنیت، یا اکابر دین وملت پر کوئی حملہ آور ہوتا ہے تو وہ بے تاب ہو جاتے ہیں، اور اس کے دفاع کے لیے اپنی ممکنہ تدبیر سے باز نہیں آتے۔" (تقدیم شارح بخاری مولفہ مولانا یٰسین اختر مصباحی ص ۱۰)

اہل علم کا اعزاز واکرام:

حضرت فقیہ اعظم ہند کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ آپ اہل علم اور اربابِ فضل کا کھلے دل سے اعزاز واکرام فرماتے تھے۔ جامعہ میں جو علمائے دین آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ شگفتہ روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا استقبال فرماتے، حسبِ موقع چائے ناشتہ، کھانا پانی کا اپنی جیبِ خاص سے انتظام فرماتے، خواہ وہ معاصر ہوں یا اصاغر، اقران ہوں یا تلامذہ۔

جامعہ کے فارغین اور آپ کے تلامذہ جب نیاز مندانہ حاضر ہوتے تو آپ ان سے

بے تکلف ہوکر ملاقات کرتے ، ان کی خیریت وعافیت دریافت فرماتے، حسبِ ضرورت مناسب مشوروں سے بہرہ مند فرماتے، ان کے قیام وطعام کا انتظام فرماتے۔

اکابرین یا نمایاں وجاہت رکھنے والے حضرات تشریف لاتے تو ان کے واسطے فرش راہ ہوجاتے، مارہرہ مطہرہ کے مشائخ وسادات میں سے کوئی تشریف لاتے، تو پھر عقیدتوں کا عالم مت پوچھیے، دیدہ ودل فرشِ راہ کردیتے، قدم بوسی، دست بوسی میں سبقت فرماتے۔ محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفےٰ قادری دامت برکاتہ یا عزیز ملت علامہ عبدالحفیظ دام ظلہ سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ، یا خیر الاذکیاء علامہ محمد احمد مصباحی مدظلہ تشریف لاتے تو آپ کھڑے ہوکر استقبال فرماتے، اور ان کے اعزاز میں اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک یہ حضرات اپنی نشست گاہوں پر تشریف نہ رکھتے، یہ سب آپ کی اعلیٰ ظرفی، کشادہ قلبی اور وسعت فکرونظر کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

خودداری اور عزت نفس:

خودداری، عزتِ نفس اور غیرت وحمیت آپ میں بلا کی تھی، بڑی سے بڑی پریشانی جھیل لیتے، مگر اپنی پریشانی اور تنگ دستی کا اظہار یا کسی کے سامنے حسنِ طلب کو بھی روا نہیں رکھتے تھے۔ ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ آپ کو دردِ گردہ کی شدید شکایت ہوئی، کرب واذیت میں مبتلا ہوئے، کسی طرح علاج کرایا، علاج کے لیے رقم پاس نہیں تھی، ناچار اپنی وہ کتابیں فروخت کردیں جنھیں آپ عزیز اور نہایت عزیز رکھتے تھے، فروختگیِ کتب کا عمل آپ کے اوپر کتنا شاق گزرا، اور دل پر پتھر رکھ کر کس طرح آپ نے یہ کتابیں فروخت کیں اس کا اندازہ کچھ وہی کرسکتا ہے جو کتابوں کی قدر وقیمت سے آشنا ہو۔ اس وقت آپ کے صاحبزادگان یا آپ کے عصائے پیری حضرت مولانا عبدالحق رضوی مصباحی یا اس طرح کے دیگر مقامی وغیر مقامی افراد بھی ایسی پوزیشن میں نہ تھے کہ آپ کے لیے کچھ کرسکیں، آپ کے احباب ومخلصین میں سے کوئی بندۂ خدا رازداری کے ساتھ شریکِ درد وغم ہوا ہو تو نہیں معلوم۔ مگر ظاہری حال یہی تھا کہ یہ سب پریشانیاں آپ نے تنِ تنہا جھیلیں، مگر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز

کر کے یا اشارۃً و کنایۃً کسی طرح بھی تعاون کی درخواست کر کے اپنی خودداری اور عزت نفس کا سودا نہیں کیا۔

عشق رسول:

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان کو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ تعلق اور گہرا عشق تھا، جس کے اثرات آپ کی نشست و برخاست اور زندگی کے لمحات سے اطاعت وفرماں برداری کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔ سچ ہے ع:

اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

اور یہی وجہ تھی کہ آپ کی زبان ذکرِ محبوب و دیارِ محبوب سے ہمیشہ تر رہتی ہے: مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ (جس شخص کو کسی چیز سے محبت ہوتی ہے اس کا تذکرہ کثرت سے کرتا ہے) اور ایسا کیوں نہ ہو کہ عشقِ رسول ایک مومن کی متاعِ زندگی، سرمایۂ حیات، اصلِ ایمان بلکہ ایمان کی بھی جان ہے۔

جان ہے عشقِ مصطفیٰ، روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزا، نازِ دوا اٹھائے کیوں

اللہ کی سر تا بقدم شان ہیں یہ — ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں — ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

آپ کی تحریریں پڑھیے، آپ کی کتابیں دیکھیے، اور آپ کے مضامین ومقالات کا مطالعہ کیجئے تو آپ کے عشقِ رسول کی جلوہ سامانیاں قدم قدم پر دیکھنے کو ملیں گی۔ آپ کے سفر نامۂ حج، نزہۃ القاری شرح صحیح البخاری اور متعدد مقالات ومضامین میں اس کی وافر شہادتیں موجود ہیں۔

بارہا کا مشاہدہ ہے کہ جب کبھی حاجیوں کا قافلہ دیارِ حبیب کا رخ کرتا اور زیارت حرمین طیبین کے لیے جانے والا کوئی کاروانِ شوق آپ سے ملاقات کو حاضر آتا تو آپ کا عشق انگڑائیاں لینے لگتا، وفورِ شوق اور فرطِ جذبات سے آپ کا پیمانۂ صبر چھلک پڑتا اور بے

اختیار آنکھیں اشک بار ہو جاتیں، اور دل کا عالم زیر وزبر ہو جاتا، بھیگی ہوئی پلکوں کے سائے سرکار کی بارگاہ ناز میں حاضری کی سعادت کی دعا، خادمانہ سلامِ عقیدت پیش کرنے کی گزارش کرتے۔

۱۹۹۷ء کی بات ہے، حضرت کا دوسرا سفرِ حج تھا، جامعہ اشرفیہ میں عازمینِ حج اساتذہ وارا کین کو استقبالیہ پیش کیا جاتا ہے، حضرت کے لیے بھی استقبالیہ کی خصوصی نشست رکھی گئی، حضرت کی فرمائش پر خاص اس سفر کے واسطے جاں نثارِ حافظ ملت، حسان الہند جناب بیکل اتساہی نے درد وسوز میں ڈوبی ہوئی ایک نظم کہی تھی جس کا پہلا مصرع تھا۔ ع

تب وے سکھی مجھے چندری منگائے دے، جانا ہے پی کی نگریا
موہے جانا ہے پی کی نگریا

عشق کے سوز میں ڈوبی ہوئی یہ نظم کیا پڑھی گئی کہ پوری فضا اشکوں میں ڈوب کے رہ گئی، یادِ حبیب میں آہوں کا ایک سلسلہ تھا جو تھمنے کا نام ہی نہ لیتا، اس مستزاد کا ایک ایک بند صبر وشکیب کی دنیا پر قیامت سے کم نہ تھا۔ اس محفلِ شوق میں ان آنکھوں کو اشکِ محبت بہاتے دیکھا گیا جو کبھی اشک آلود نہ ہوتی تھیں، حضرت فقیہ اعظم کی وارفتگیِ شوق کا تو عالم ہی کچھ اور تھا، زار وقطار رو رہے تھے۔ آپ کی پُرسوز آہوں سے دارالحدیث کا پورا گنبد گونج رہا تھا، در وبام پہ ایسا سکتہ طاری تھا جیسے یہ بھی غمِ ہجر کے مارے اس عاشقِ رسول کی آہوں اور سسکیوں کا ساتھ دے رہے ہوں، جامعہ اشرفیہ کے بعد گھوسی میں استقبالیہ دیا گیا، بنارس جامعہ حنفیہ غوثیہ میں خصوصی استقبال رہا۔ ہر جگہ حضرت نے یہ نظم فرمائش کر کے سنی، اور اپنی آہوں کی سوغات محبوب دو جہاں روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کرم میں پیش کر کے عاشقی کی دستاویز پر مہر ثبت کرالی۔

سوئے اتفاق کہ اس سفر میں حضرت کو ممبئی سے لوٹنا پڑا، سعودی ایمبیسی نے ویزا بند کر دیا تھا، اور پانچ ہزار سے زائد عازمینِ حج کو اس سعادت سے محرومی ہاتھ آئی، حضرت بھی حاضریِ بارگاہِ عرش جاہ سے محروم رہے۔ اس محرومی کا داغ حضرت کے دل پر اتنا گہرا تھا کہ اساتذۂ جامعہ آپ کی کبیدہ خاطری سے اداس ہو ہو جاتے، بارہا مُناجات میں اشک بار

ہوتے بلکہ بلکتے دیکھا گیا، مولانا افتخار صاحب اعظمی مصباحی سابق استاذ جامعہ اشرفیہ جو عرصہ دراز سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں ان کے نام جوابی مکتوب میں آپ نے لکھوایا:

" مولانا! سیدہ طیبہ طاہرہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو اِس ناکارہ غلام کا خصوصی سلامِ نیاز پیش کر کے عرض کر دیں، وہ اپنے بابا جان آقائے دوجہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس ناکارہ، سیاہ کار غلام کے واسطے سفارش کر دیں کہ حضور کم سے کم ایک بار **اور اِس** سیاہ کار کو حاضری کی اجازت مرحمت فرمادیں، جب تک حاضری نہ ہوگی، چین نہ آئے گا، اور اس محرومی کا داغ دل سے نہ جائے گا۔"

یہ جملے املا کراتے وقت آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب چکی تھیں، بالآخر آپ کے دل کی لگن پوری ہوئی، اور چند ماہ بعد ہی عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی، پھر حج کو تشریف لے گئے۔ اس طرح حج وعمرہ کی سعادت اور دیارِ رسول کی مہمانی نصیب ہوئی۔ (شارح بخاری نمبر: کنزالایمان دہلی: ص ۲۵۱)

حضرت مولانا یٰسین اختر مصباحی ومولانا افتخار احمد قادری مصباحی جب زیارت حرمین طیبین کے لیے تشریف لے گئے، اور آپ کے پاس شرفِ حضوری کا خط لکھا، تو آپ نے انتہائی رقت انگیز، پُرسوز اور والہانہ انداز میں جواب لکھوایا:

" حرمین طیبین کی حاضری کے موقع پر ناکارہ کو والہانہ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ سرکار بے کس پناہ کی بارگاہ میں سلام پیش کرنے کے بعد یہ معروضہ پیش کر دیں کہ کبھی اس سگِ بے ہنر کو بھی حاضری کا موقع عنایت فرمائیں، اور کیا لکھیں۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے "

(حجاز جدید دہلی: مئی، جون ۱۹۹۱ء)

مولانا ارشاد احمد رضوی سہسرامی لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ احقر کو ایک فتویٰ املا کرا رہے تھے، اسی دوران مولانا روم کی مثنوی کا ایک شعر لکھوایا جس کا مفہوم یہ تھا کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ

کو خرید کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روے زیبا پہ نچھاور کر دیا، یہ شعر لکھواتے لکھواتے رو پڑے۔ (شارح بخاری نمبر: کنز الایمان دہلی ص ۲۵۲)

یہ سب کچھ عشق رسول ہی کی کرشمہ سازیاں تھیں جو آپ کی ذات میں شروع ہی سے پائی جاتی تھیں، بارگاہِ رسالت سے عشق و شیفتگی اور والہانہ تعلقِ خاطر ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ بیس برس کی عمر ہی سے بعد نماز جمعہ درود رضویہ پڑھنے کے عامل تھے۔ ۱۹۹۸ء میں جامعہ اشرفیہ میں نماز جمعہ سے قبل تقریر کے دوران آپ نے درود شریف کے فضائل بیان کرتے ہوئے اس کے پڑھنے کی تاکید فرمائی، اور مذکورہ بالا حقیقت کا انکشاف فرمایا۔

تربیت کا انوکھا انداز:

حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اصلاح وتربیت کا بھی ملکہ عطا فرمایا تھا، وہ اہل تعلق پر نرمی بھی رکھتے، اورانہیں مناسب ہدایت وتنبیہ سے برابر سنوارتے رہتے۔ کبھی نرمی سے سمجھاتے، کبھی سختی کو بروے کار لاتے، کبھی ڈانٹتے پھٹکارتے، کبھی شفقت کا ہاتھ پھیرتے، سختی اور نرمی کے اِس امتزاج اور تربیت کے اس انوکھے انداز میں شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کی یہ نصیحت ان کے پیشِ نظر تھی:

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چوں فاسد کہ جراح و مرہم نہ است

مولانا ارشاد احمد رضوی سہسرامی لکھتے ہیں:

ہم لوگوں سے اگر فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جاتی، فتاویٰ کی ترسیل میں تاخیر ہوتی تو بہت رنجیدہ ہوتے، فرماتے: میں اور مفتی نظام الدین جب دو آدمی دارالافتاء میں تھے، تو ایک استفتا بھی باقی نہ رہتا، اور نہ ہی ضائع ہوتا، اب آپ چھ سات حضرات ہیں لیکن پھر بھی کام نہیں سمٹتا، جب کہ حضرت کا عالم یہ تھا کہ سات مفتی حضرات کے مجموعی کام سے زیادہ تنِ تنہا کام کرتے۔ جو سرعتِ تحریر، تجربہ اور مہارت حضرت کو میسر تھی، دوسروں کو اس کا شمہ بھی کہاں نصیب! (شارح بخاری نمبر: کنز الایمان دہلی: ص ۲۵۳)

خود راقمِ سطور نے بارہا دارالافتاء کے مفتیانِ کرام پر تاخیرِ جواب کے سلسلے میں

اظہار برہمی کرتے اور پھر انہیں سنجیدگی سے شفقت آمیز لہجے میں یوں سمجھاتے ہوئے سنا:

''ابھی آپ لوگ دوسرے کے سہارے چل رہے ہیں جب خود پر پڑے گی تو سمجھ میں آئے گا۔فتویٰ بھیجنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ مان لیجئے کسی سے کلمۂ کفر صادر ہوا، اس نے آپ کے پاس سوال بھیجا، اب آپ نے جواب دینے میں تاخیر کردی، اسی دوران اس کا آخری وقت آگیا، اب وہ کیا کرے، اسے حکم ہی نہیں معلوم ! اسی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا، اب بتائیے اس کا وبال کس پر ہوگا؟ اسی لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ جواب جلد از جلد بھیجا جائے۔کم از کم مستفتی کو اصل حکم تو معلوم ہو جائے، تحقیق و تدقیق اور حوالوں کی کثرت کا کام بعد میں ہوتا رہے گا''۔

عصری نشست میں کبھی کبھی علمائے اشرفیہ کو یوں نصیحت فرماتے:

''آپ حضرات خود کو مناظرے کے واسطے تیار کریں۔ اہل سنت کے عقائد دلائل کے ساتھ مستحضر رکھیں، سلف کی عربی شروحِ حدیث کا مطالعہ کریں، عیسائیوں، آریوں، شیعوں، قادیانیوں، وہابیوں، مودودیوں، دیوبندیوں کے باطل افکار کا گہرائی سے احتسابی مطالعہ کریں، ان کا مضبوط دلیلوں کے ساتھ تنقیدی جائزہ لیں، احتسابی گوشے نوٹ کرلیں، حوالے میں پیش کی جانے والی کتابیں خود ذاتی طور سے خرید لیں، پھر آپ جب حمایتِ حق کی خاطر باطل کے سامنے کھڑے ہوں گے تو مولائے کریم خود ہی ذہن کی گرہیں کھول دے گا، اور ایسے ایسے اچھوتے جوابی گوشے سامنے آئیں گے کہ آپ خود حیرت زدہ رہ جائیں گے۔حق کی حمایت کرنے والوں کی غیب سے مدد ہوتی ہے۔ ہاں کوشش ضرور شرط ہے''۔

(شارح بخاری نمبر: کنزالایمان دہلی ص ۲۵۴)

میرے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد کوثر خاں نعیمی صدرالمدرسین جامعہ عربیہ اظہار العلوم، نیا بازار، جہاں گیر گنج کو تمام معمولات سلسلہ امجدیہ رضویہ، رضویہ برکاتیہ، قادریہ کی اجازت اور سلسلہ عالیہ رضویہ برکاتیہ کی اجازت وخلافت دیتے ہوئے یوں نصیحت فرماتے ہیں:

''یاد رکھیں! اسے دنیا طلبی کا ذریعہ نہ بنائیں، بلکہ خلقِ خدا کو راہ پر لگانے کا ذریعہ

بنائیں، مخلوق سے کوئی طمع کوئی امید نہ رکھیں، ہمارے سلسلے کی بنیاد ان تین چیزوں پر ہے: طمع مت کر، منع مت کر، جمع مت کر۔ ارادت مند بخوشی کچھ دیں اگر چہ شے حقیر ہو قبول کرلیں، مگر زراندوزی نہ کریں، اسے صرف کر دیں، پھر دروازہ بند نہ ہوگا"

محمد شریف الحق امجدی

۹ر رمضان ۱۴۱۴ھ/مطابق ۲۱ر فروری ۱۹۹۴ء (ایضا: ص ۱۲)

ادیب شہیر مولانا بدر القادری مصباحی کو ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:

" روزانہ قرآن کریم کی تلاوت مع ترجمہ وتفسیر، بہار شریعت کا مطالعہ، اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی تصنیفات کا مطالعہ، پھر اپنے ذوق کی جس کتاب کا چاہیں مطالعہ کریں، مُشیرِ دینیات کے لیے دینیات کا اسپشلسٹ ہونا لازم ہے، میری نیک دعائیں آپ کے ساتھ ہیں"۔ (ایضا ص ۲۰۵)

"معارف شارح بخاری" کے لیے احقر نے بعنوان "شارح بخاری کے شیوخ واساتذہ" ایک طویل مقالہ لکھا، اور جب اُسے حضرت کو سنانے لگا تو مختلف مقامات پر حذف واضافہ کرایا، اور لفظی ومعنوی اصلاح فرمائی اور ایک مقام پر مجھ سے فرمایا: رکو، دو باتیں یاد رکھنا، ان پر ہمیشہ عمل کرنا۔ (۱) جہاں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان کا نام آئے وہاں نام کے ساتھ "مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام" ضرور لکھنا۔ (۲) اور جہاں اپنے بزرگوں کا تذکرہ آئے تو انہیں مناسب آداب والقاب سے یاد کرنا، اور خبر دار خبر دار! ان سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا کہ اس سے فائدہ کی بجائے نقصان ہوگا۔

ادیب اہل سنت مولانا محمد اسلم بستوی مصباحی شیخ الحدیث انوار القرآن بلرام پور رقم طراز ہیں:

" میں نے حضرت شارح بخاری کی ذات سے بے حد استفادے کیے، میرے وہ باضابطہ استاذ نہیں، لیکن ایسے مربی تھے جو کسی استاذ سے کم نہیں ہوتا۔ میرے اوپر اُن کے بیحد احسانات ہیں، ان کے بارِ قرض سے شاید میں زندگی بھر سبکدوش نہ ہوسکوں، میرے ابتدائی

تحریری کاموں کا تمام تر مرجع ''اردو ادب'' ہی رہا۔ میری نثری و نظمی تحریریں ہندوپاک کے ادبی رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر رہی تھیں، اس زمانے میں حضرت شارح بخاری نے میرے قلم کے رخ کو موڑنے کے لیے ایک موثر نصیحت فرمائی، ارشاد فرمایا: آپ کے ادبی کاموں سے صرف ''اردو ادب'' کو فروغ یا فائدہ ہوسکتا ہے لیکن ملت و مسلک کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اس لیے آپ اپنی تحریر کو ہوا کے رخ پر چلنے دینے کے بجائے مذہب وملت کی طرف موڑ دیجیے، اس سے دو آتشہ فائدہ ہوگا۔ ہمارے مسلک کو ایک جدید قلم کار مل جائے گا، اور ''اردو ادب'' کو بھی بدستور فائدہ ہوتا رہے گا، اس لیے کہ آپ کی ساری تحریریں اردو ہی میں ہوں گی۔ بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے ''مذہبی ادب'' کے فروغ کی طرف اپنے قلم کو موڑ دیا۔ (شارح بخاری نمبر: کنز الایمان: ص ۲۵۸)

اکابر کی معتمد علیہ شخصیت:

انہی وہبی اوصاف اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اکابر اہلسنت نے ہمیشہ آپ پر اعتماد فرمایا، اور متعدد اہم مواقع پر آپ کو مقدم رکھا، اور آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ آپ پر اتنا اعتماد فرماتے کہ رمضان شریف میں صحیح خواں حافظ نہ ملنے کی وجہ سے سورۂ تراویح پڑھتے اور عشا وتراویح کے لیے آپ کو امام بناتے، اور خود آپ کی اقتدا میں نماز ادا فرماتے۔ حالانکہ دیگر علما بھی موجود ہوتے۔ (شارح بخاری: ص ۴۶، ۴۷)

حضور مفتی اعظم، حضرت مجاہد ملت، حضرت حافظ ملت، حضرت محدث اعظم پاکستان، حضرت سید العلماء، حضرت احسن العلماء، حضرت محدث اعظم ہند رحمہم اللہ نے مختلف مواقع پر بدمذہبوں کے مقابلے میں آپ کو پیش پیش رکھا اور کئی بار از راہ کرم باصرار صدارت کی شہ نشین پر بٹھایا، کٹک، اڑیسہ کے مشہور مناظرہ میں حضرت مجاہد ملت قدس سرہ نے آپ کو صدرِ مناظرہ مقرر فرمایا۔ جوناگڑھ، کاٹھیاواڑ کے دعوتی سفر کے موقع پر حضرت مفتی اعظم علیہ الرحمہ نے ایک شیعہ معترض کے حدیثِ قرطاس کو لے کر اعتراض و نکتہ چینی اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر کیچڑ اچھالنے پر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے

آپ کو موقع دیا۔ (ایضا: ص۵۲)

بڑہل گنج ضلع گورکھپور میں حضرت محدث اعظم ہند کے نام ایک دیوبندی مولوی کا چیلنجِ مناظرہ آیا، جس کا جواب لکھنے کے لیے آپ نے حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ کا انتخاب فرمایا اور شارح بخاری کے مناظرانہ جواب کو سن کر حضرت محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، اور دیوبندی مولوی کو سانپ سونگھ گیا۔ (ایضا: ص۵۵)

حافظ ملت علیہ الرحمہ کو آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ اگر مبارک پور میں کوئی مناظرہ کے لیے کہیں سے مناظر طلب کرتا تو آپ اسے حکم دیتے کہ مفتی شریف الحق صاحب کو ضرور مدعو کرو۔ نیپال کی سرحد مدھوبنی، دریا پور، ضلع مالدہ (بنگال) باندو چترا ضلع پلاموں (بہار) کے مناظروں میں حافظ ملت ہی کی طلب پر آپ نے شرکت فرمائی۔ (ایضا: ص۶۱)

سید العلماء حضرت علامہ سید آل مصطفےٰ قادری برکاتی مارہروی آپ پر بہت اعتماد فرماتے۔ آل انڈیا سنی جمعیۃ العلماء کی میٹنگوں میں آپ کو صدر بناتے۔

(معارف شارح بخاری: ص۲۵۱)

اور احسن العلماء حضرت علامہ سید حسن میاں قادری برکاتی قدس سرہ علم اور معاملات دونوں شعبوں میں آپ کو معتمد سمجھتے اور بعض اہم مسائل میں بھی آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ (ایضا: ص۲۵۴)

درج بالا حقائق وشواہد کی روشنی میں اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ اپنے اکابرین کے کس قدر معتمد اور منظورِ نظر تھے، اور ان کی رس اور حقیقت میں نگاہیں آپ کے جوہر فن کی کتنی قدر شناس تھیں۔ (وذٰلک فَضْلُ اللہِ یُوتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ)

جامعہ اشرفیہ سے والہانہ تعلق:

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ سے آپ کو عشق وشیفتگی اور جنون ودیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ جامعہ کے عروج وارتقا کی طرف بڑھتے ہوئے ہر قدم سے شاداں وفرحاں، اور اس کے ہر نقصان وخسران سے غمزدہ وافسردہ ہوجاتے۔ وصال سے

تقریباً دو مہینہ پہلے ایک مرتبہ دورانِ گفتگو آپ نے اِس راقم سطور سے فرمایا:

" مولانا! جامعہ اشرفیہ سے مجھے اس قدر گہرا قلبی لگاؤ صرف اس لیے ہے کہ یہ حافظِ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی علمی یادگار، علم ومعرفت کا حسین مینار اور اسلام وسنیت کا مضبوط قلعہ ہے، قوم مسلم کی صلاح وفلاح کا راز اس کے عروج وارتقا اور ترقی وبقا میں مضمر ہے۔"

اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ آپ کا مادرِ علمی بھی الجامعۃ الاشرفیہ تھا جس کے چشمۂ فیاض سے آپ نے سیرابی حاصل کی اور علمی وفنی اسلحوں سے لیس ہوکر اسلام وسنیت کے بے باک مجاہد بنے۔ پھر اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری چوبیس سال یہیں کے شعبہ قضا وافتا کے صدر، مجلس شرعی کے سرپرست، ناظم تعلیمات اور مجلس شرعی کے رکن رکین کی حیثیت سے گزارے۔ اور آغوش اشرفیہ ہی میں اپنی جان جاں آفریں کے حوالہ کی۔

آخر گِل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بذلہ سنجی:

شارحِ بخاری خاموش طبع، متین اور سنجیدہ طبیعت بزرگ تھے، علمی مشاغل کی وجہ سے لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم ہوتا، لیکن مخلص احباب کے جھرمٹ میں بہترین جلیس اور شگفتہ مزاج بذلہ سنج نظر آتے، اور ایسے لطائف وظرائف ایجاد کرتے، جو اردو ادب کے نادر نمونے ہوتے۔ اس وقت کوئی اجنبی انسان مشکل ہی سے یہ باور کرتا کہ یہی وہ بزرگ ہیں جو دارالافتاء میں وقار وتمکنت کے پہاڑ معلوم ہوتے ہیں۔

ایک بار بڑھیا ضلع بستی جلسے میں جا رہے تھے، روڈ سے بڑھیا کا راستہ خام اور دشوار گزار ہے۔ بارش کا زمانہ تھا، پھر راستے میں ایک ندی بھی پڑتی تھی، سواری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، دعوت دینے والے نے یہ بتایا تھا کہ روڈ سے بمشکل چار فرلانگ ہوگا لیکن فاصلہ کتنا ہے وہ بہت سے لوگوں کو معلوم ہے۔ جب آپ چلتے چلتے گھبرا گئے تو ساتھ والوں سے پوچھا، ارے بھائی! بڑھیا کتنی دور ہے؟ کسی نے کہا وہ دیکھیے، بتی نظر آ رہی ہے، حضرت نے بے

ساختہ فرمایا: نظر آنے کو تو آسمان کے تارے بھی نظر آرہے ہیں ۔ یہ بتاؤ کہ ان تاروں کی نسبت قریب ہے یا دور؟ اگر آپ کے اس قسم کے جملے جمع کر لئے جائیں تو اردو ادب کے سرمایہ میں اچھا خاصا اضافہ ہو جائے۔

ترجمان اہل سنت:

مجدد اسلام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی ذات گرامی کتاب وسنت کی پیروی، سلف صالحین کے اتباع، عشق رسالت پناہی ومحبت اولیاء اللہ، احقاق حق اور ابطال باطل سے عبارت ہے ۔ آپ نے پوری زندگی مذاہب باطلہ اور افکار فاسدہ کے خلاف قلمی ولسانی جہاد فرمایا، اور توحید خداوندی وعشق نبوی کا درس دیا، انہیں اوصاف ومحاسن کی بنا پر حضرت شارح بخاری کو اعلیٰ حضرت قدس سرہ سے والہانہ لگاؤ تھا، وہ اپنے آپ کو مخالفین ومعاندین واعدا وحاسدین کے تیر ونشتر کا نشانہ بنانا تو گوارہ کر لیتے مگر فکر رضا کے خلاف منظر عام پر آنے والے کسی چھوٹی سی چھوٹی تحریک اور مہم کو برداشت نہیں کرتے ۔ اس طرح کا کوئی بھی موقع رہا ہو، دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ سب سے پہلے آپ ہی خرمن باطن پر برق تپاں بن کر گرے ہیں، اور اپنی تحریر وتقریر کے شعلوں سے اس کو خاکستر بنایا ہے ۔ آپ امام احمد رضا کے مسلک عشق وعرفان کے سچے ترجمان تھے، آپ کی تقریروں کے علاوہ تحریروں میں بھی اس کے جلوے جا بجا نظر آتے ہیں، تحقیقات، فتنوں کی سرزمین کون؟ منصفانہ جائزہ، امام احمد رضا اور مسئلہ تکفیر، اذان خطبہ، تنقید برمحل، اشرف السیر اور آپ کے بے شمار فتاویٰ اسی سلسلۃ الذہب کی انمول کڑیاں ہیں۔

نمایاں خصوصیات:

بقول استاذ گرامی خیر الاذکیاء حضرت علامہ محمد احمد مصباحی شیخ الجامعہ جامعہ اشرفیہ، مبارکپور آپ کی ذات درج ذیل خصائص بارزہ کی حامل ہے:

(۱) دینی وملی غیرت واحساس میں معاصرین پر فائق تھے، جب بھی اسلام وسنیت، یا اکابر دین وملت پر کوئی حملہ آور ہوتا ہے تو وہ بے تاب ہو جاتے ہیں، اور اس کے دفاع کے

لیے اپنی ممکنہ تدابیر سے باز نہیں آتے۔

(۲) علم میں وہ رسوخ حاصل تھا کہ جب کسی خاص موضوع پر لکھنے یا بولنے پر آتے تو بہت جلد اس کے تمام گوشوں کا احاطہ واستحضار کر کے بھر پور روشنی ڈالتے۔

(۳) فقہی جزئیات کا استحضار، حالات زمانہ پر نظر، سائلین کے فکر ومزاج سے آگاہی، بعض سائلوں کی چالاکی وعیاری سے باخبری اور دیگر لوازم سے آراستگی ایسی تھی کہ زمانہ دراز سے فتاویٰ کا برجستہ املا کراتے تھے، دیکھنے اور پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مناسب اور برمحل جواب دیا گیا ہے، جو کسی ماہر مفتی کا نتیجۂ قلم ہے یا کافی غور وخوض اور محنت وتیاری کا ثمرہ۔

(۴) جماعت اور اداروں کے احوال پر بھی نظر رکھتے، اور اپنے طویل تجربات کی روشنی میں بڑی قیمتی رہنمائی اور لاجواب عقدہ کشائی سے نوازتے۔

(۵) اصلاح وتربیت کا بھی خاص ملکہ رکھتے تھے اور اہل تعلق کو مناسب ہدایت وتنبیہ سے برابر سنوارتے رہتے تھے۔

(۶) عرصہ دراز تک تدریس، افتا، تبلیغ وتقریر کا جو وسیع تجربہ تھا اس میں انفرادیت کے ساتھ تحریر وتصنیف، سرعت تحریر اور حسن تفہیم میں یکتائے زمانہ تھے۔ (مقدمہ شارح بخاری)

فیضان مارہرہ مطہرہ:

شارح بخاری علیہ الرحمہ پر ابتداے شباب سے آخری وقت تک سرکاران مارہرہ مطہرہ ومشائخ برکاتیہ کا ابر فیض وکرم برستا رہا، جس سے آپ کا ظاہر وباطن نہال وشاداب ہوتا رہا۔ اس فیضان وکرم کی ابتدا اس وقت ہوئی جب کہ آپ نے مسلمانوں کے سیاسی موقف اور کانگریس ومسلم لیگ کے سلسلے میں ''اشک رواں'' نام کی ایک کتاب لکھ کر شائع کی جسے تاج العلماء حضرت مولانا سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی زیب سجادہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے مطالعہ فرما کر بے حد پسند فرمایا اور پھر خود ایک خط شارح بخاری کے نام تحریر فرمایا، دعاؤں سے نوازا، اور حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے۔ اسی دوران بہار وبنگال

میں مسلم کش فسادات ہوئے، مسلمانوں کی مالی امداد کے لیے ایک وفد لے کر سید العلماء حضرت مولانا سید آل مصطفیٰ قادری برکاتی مارہروی، بہار کے مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے شہر گیا پہنچے وہیں آپ سے شارحِ بخاری کی پہلی ملاقات ہوئی، اور آپ نے انہیں شفقتوں، عنایتوں سے نوازا۔ پھر تقریبا آج سے چالیس برس پہلے آپ پہلی مرتبہ عرس نوری کے موقع پر مارہرہ مطہرہ حاضر ہوئے، سید العلماء واحسن العلماء حضرت سید حسن میاں کی خدمت میں پہنچ کر نیاز مندانہ ملاقات کی اور اسی موقع پر سید العلماء کے حکم پر آپ کی پہلی تقریر ہوئی جو مقبول ہوئی اور اسی موقع پر آپ کے عرض کرنے پر سید العلماء نے احسن العلماء کو حکم دیا کہ دربار میں ان کی مخصوص حاضری کرادیں، تقریبا دو بجے رات میں جب آپ کی حاضری ہوئی تو آپ شاہانِ برکاتیہ کے روحانی فیوض و برکات سے مالا مال ہوگئے۔ اس کے بعد سے برابر عرس قاسمی میں آپ وہاں حاضر ہوتے رہے، اور قل شریف سے پہلے کی تقاریر میں آخری تقریر آپ کی ہونے لگی اور یہ سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا، حضرت احسن العلماء آپ پر خصوصی کرم فرماتے تھے اور علم و معاملات دونوں شعبوں میں آپ کو معتمد سمجھتے تھے۔ کوئی شخص آپ سے فتویٰ کے بارے میں پوچھتا تو فرماتے کہ شارح بخاری سے استفتا کرو، اُن کا جو فتویٰ ہوگا وہی ہمارا فتویٰ ہوگا۔ خانقاہِ مارہرہ مطہرہ سے آپ کا یہ روحانی رشتہ تادم وصال اسی طرح برقرار رہا۔ شہزادۂ سید العلماء حضرت سید حسنین میاں نظمی، وشاہزادگانِ احسن العلماء حضرت سید محمد امین میاں سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ، حضرت سید افضل میاں، حضرت سید اشرف میاں اور حضرت سید نجیب میاں سب سے محبت واخلاص کا رشتہ ویسے ہی تھا جیسے ان کے بزرگوں کے ساتھ تھا، علمی و دینی معاملات میں استفادہ کی روایت بھی برقرار تھی۔

فقیہ اعظم ہند کا خطاب:

شارح بخاری کے ہمہ جہت علمی کمالات ومحاسن، دینی وملی کارناموں، فقہ وافتا میں ذروۂ اختصاص تک پہنچنے اور اقران ومعاصرین پر فائق ہونے کی بنا پر ہندوپاک کے علمائے دین ومفتیانِ شرع متین پر آپ کی سیادت وریاست سب کے نزدیک مسلم تھی، اسی لیے بعض

اہل علم نے آپ کے لیے ”فقیہ اعظم ہند“ کے خطاب کی تجویز رکھی، ان میں سر فہرست حضرت مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی پرنسپل آر ویدک یونانی طبیہ کالج دہلی ہیں، جس کی تائید رئیس القلم علامہ ارشد القادری بانی جامعہ نظام الدین دہلی، علامہ یٰسین اختر مصباحی بانی دار القلم دہلی، اور مفتی محمد میاں ثمر دہلوی جیسے سر برآوردہ علمائے اہل سنت نے کی، پھر عرس قاسمی ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء کے مبارک و مسعود موقع پر امین ملت حضرت ڈاکٹر سید امین میاں قادری برکاتی سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے قل سے پہلے علمائے اعلام و مشائخ اسلام کے جمِ غفیر میں اس کا اعلان فرمایا، اعلان کے سنتے ہی ”فقیہ اعظم ہند“ ”اور شارح بخاری“ کے نعروں سے ساری فضا گونج اٹھی۔

حلیہ مبارکہ:

حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قد میانہ، رنگ گندمی، پیشانی کشادہ، ناک تناسب کی حد تک بلند، داڑھی کے بال ہلکے اور سفید تھے، اکثر اوقات ٹوپی کے ساتھ عمامہ استعمال فرماتے، کرتا کلی دار سفید اور شلوار پہنتے، جو سنت کے مطابق ٹخنوں سے اوپر نصف پنڈلی کے قریب ہوتی، کرتا پر اکثر صدری اور کبھی کبھار جبہ پہنتے، رومال بھی استعمال فرماتے۔ صفائی پسند ہونے کی وجہ سے لباس صاف ستھرے ہوتے، افراط و تفریط سے دور اور اعتدال پسند تھے، تکلف، تصنع اور بناوٹ کو پسند نہیں فرماتے، چہرہ باوقار، بارعب اور نورانی اور بیاسی برس کے ہونے کے باوجود آواز نہایت بلند تھی، جلالِ علم و جمال باطن، پختگی عقل و ذکاوتِ ذہن اور استقامتِ قلب کے جامع تھے۔

ازواج واولاد:

شارح بخاری کی پہلی شادی آپ کے ماموں حافظ عبدالرحمٰن ساکن مدن پور ضلع دیوریا کی منجھلی صاحبزادی مسماۃ زینب سے ۲۰/ربیع الآخر ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ جن کے بطن سے ایک فرزند محمد حبیب الحق تولّد ہوئے۔ ۱۴/ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ/۲۳/جنوری ۱۹۵۱ء کو آپ کی زوجہ کا اور ۱۲/شعبان ۱۳۷۶ھ/۱۵/مارچ ۱۹۵۷ء کو محمد حبیب کا انتقال ہو گیا۔ دوسرا

نکاح زوجۂ اولیٰ کی وصیت کے مطابق ان کی چھوٹی بہن مسماۃ نور النساء بنت حافظ عبدالرحمٰن سے بتاریخ ۲۲؍رجب ۱۳۷۰ھ/۲۸؍اپریل ۱۹۵۱ء کو ہوا، زوجۂ ثانیہ سے پانچ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی کی ولادت ہوئی، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) **محمد محب الحق**: جامعہ عربیہ انوار القرآن بلرام پور سے جلالین، مشکوٰۃ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹری کا پانچ سالہ کورس بی، یو، ایم، ایس مکمل کیا۔ آج کل اپنے وطن قصبہ گھوسی مدھوبن روڈ پر واقع اپنی ڈسپنسری ایک کامیاب طبیب کی حیثیت سے چلارہے ہیں۔ صاحب اولاد ہیں، مفتی اعظم ہند سے شرف بیعت حاصل ہے۔ سنجیدہ ومتین، خوش اخلاق وخوش اطوار مہمان نواز ہیں۔

(۲) **محمد مطیع الحق**: بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔

(۳) **محمد وحید الحق**: الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے متوسطات تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس وقت فیض العلوم محمد آباد گوہنہ ضلع مئو میں مدرس ہیں۔ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔

(۴) **محمد جمید الحق**: الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے فارغ عالم اور حافظ ہیں۔ چند سالوں سے زمبابوے افریقہ میں دینی وتبلیغی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بال بچے بھی ساتھ رہتے ہیں۔ صاحب سجادہ ہیں۔

(۵) **محمد ظہیر الحق**: گھریلو کاروبار میں مصروف ہیں۔ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔

(۶) **طلعت فاطمہ**: قصبہ گھوسی میں ان کی شادی مولوی خورشید انور مصباحی سے ہوئی۔ صاحب اولاد ہیں۔

مطبوع تذکرے:

درج ذیل کتابوں میں آپ کا تذکرہ وسوانح موجود ہے:

(۱) ماہنامہ حجاز جدید دہلی، بابت فروری ۱۹۹۰ء؍رجب ۱۴۱۰ھ شمارہ ۲۔ جلد۳۔ از

علامہ بدرالقادری ہالینڈ (۲) تذکرہ علماے اہل سنت: از مولانا محمود احمد رضوی (۳) خلفاے مفتی اعظم: از مولانا شہاب الدین بہرائچی (۴) تذکرہ خلفاے مفتی اعظم: از مولانا سلطان رضا نوری (۵) حدیث نبوی کے اردو تراجم: از مولانا محمد عاصم اعظمی (۶) سوغاتِ رضا: مطبوعہ رضا اکیڈمی: از مولانا مفتی محمد نسیم مصباحی (۷) معارف شارح بخاری، مرتبہ علامہ محمد احمد مصباحی و مولانا یٰسین اختر مصباحی وغیرہ (۸) شارح بخاری: از مولانا یٰسین اختر مصباحی۔ یہ کتاب اردو کے ساتھ انگریزی، گجراتی اور ہندی زبانوں میں بھی طبع ہو چکی ہے (۹) شارح بخاری نمبر، ماہنامہ کنزالایمان دہلی (۱۰) فقیہ اعظم ہند نمبر: ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور (۱۱) شارح بخاری نمبر، روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ (۱۲) شارح بخاری نمبر، روزنامہ آواز ملک وارنسی۔

وصال:

۶ رصفر ۱۴۲۱ھ/ ۱۱ رمئی ۲۰۰۰ء بروز جمعرات آپ نے الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور اعظم گڑھ میں نماز فجر اور وظائف و معمولات کی ادائیگی کے بعد دل کے دورہ پڑنے کی وجہ سے پانچ بج کر چالیس منٹ پر اچانک اس دار فانی سے دارِ جاودانی کی طرف کوچ کیا، اور یہ علم وفن کا راز داں اور استقامت وثابت قدمی کا کوہِ ہمالیہ ہمیشہ کے لیے آغوشِ زمین میں محوِ خواب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کیا خبر تھی موت کا یہ حادثہ ہو جائے گا
یعنی آغوشِ زمیں میں آسماں سو جائے گا

نفیس احمد مصباحی بارہ بنکوی

استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ، یوپی

مورخہ ۵ ر ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ ۷ ر فروری ۲۰۰۳ء

بروز جمعہ مبارکہ

(باب اول)

تفسیرات

و

تشریحات

تفسیر

شارح بخاری فقیہ عصر حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی قدس سرہ نے قرآن کریم کی تفسیر کے گراں قدر سلسلے کا بھی آغاز فرمایا تھا لیکن سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے پہلے رکوع کی تفسیر تک ہی یہ سلسلہ قائم رہ سکا۔ اس کے بعد دوسری علمی مصروفیات خصوصاً شرح بخاری کے عزم نے اس کی تکمیل کے لیے مہلت نہ دی، ورنہ ایک عظیم شاہ کار تفسیر بھی ہمارے سامنے ہوتی۔

یہ تفسیر جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے ترجمان ماہنامہ اشرفیہ میں دسمبر ۱۹۷۸ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کے شماروں میں قسط وار شائع ہوئی۔ اب وہی قیمتی تفسیر یکجا شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

(مرتب)

سورہ فاتحہ کے فضائل

فضائل:

اس سورۂ پاک کے فضائل بے شمار ہیں، احادیث اس باب میں کثیر ہیں، ان میں سے چند ذکر کی جاتی ہیں۔

ا۔ حدیث قدسی ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ''فاتحۃ الکتاب'' میرے عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ (روح البیان)

۲۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ قرآن کی دو تہائی کے برابر ہے۔ (روح المعانی)

۳۔ سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل ایک قوم پر عذاب نازل فرمانے کو طے کر لیتا ہے، اتنے میں اس قوم کے بچوں میں سے کوئی بچہ "الحمد للہ رب العالمین" پڑھتا ہے، اللہ عزوجل اسے سنتا ہے، تو اس کی برکت سے چالیس سال عذاب موقوف فرما دیتا ہے۔ (تفسیر کشاف)

۴۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: کیا میں تمہیں ایسی سورہ نہ بتاؤں کہ اس کے مثل نہ توریت میں کوئی سورہ ہے، نہ انجیل میں، نہ قرآن میں۔ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! ضرور بتایئے۔ فرمایا: یہ سورۂ فاتحہ ہے۔ یہ سبع مثانی ہے۔ یہ قرآن عظیم ہے۔ (تفسیر کشاف)

اس حدیث میں سورۂ فاتحہ کو سبع مثانی اس لیے فرمایا گیا کہ اس میں بالاتفاق سات آیتیں ہیں۔ مثانی اس لیے فرمایا کہ یہ ہر نماز میں کم از کم دو بار پڑھی جاتی ہے۔ قرآن عظیم اس لیے فرمایا کہ قرآن مجید میں جو کچھ مفصلاً ہے وہ سب اس میں مجمل ہے۔ بعض عرفا نے

فرمایا: جو کچھ قرآن میں ہے وہ سب سورۂ فاتحہ میں ہے۔ اور سورۂ فاتحہ میں جو ہے وہ سب بسم اللہ میں ہے اور جو کچھ بسم اللہ میں ہے وہ سب بسم اللہ کی با میں ہے اور جو کچھ با میں ہے وہ سب اس کے نقطے میں ہے۔

۵۔ اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت سعید بن معلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد اقدس میں نماز پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے بلایا۔ میں حاضر نہیں ہوا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حاضر ہوا اور معذرت کی، یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں نماز پڑھ رہا تھا کہ فرمایا: کیا اللہ عزوجل نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ اور رسول کو جواب دو جب وہ بلائیں۔ اور فرمایا: کیا میں تم کو قرآن کی سب سے بڑی سورہ نہ بتاؤں؟ اس کے پہلے کہ مسجد سے باہر جاؤں۔ حضور نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ جب ہم مسجد سے چلنے لگے تو آنحضور کو ہم نے یاد دلایا کہ حضور نے وعدہ فرمایا تھا کہ تم کو قرآن مجید کی سب سے بڑی سورہ بتاؤں گا۔ فرمایا: یہ الحمد للہ رب العالمین ہے۔ یہ سبع مثانی اور قرآن مجید ہے، جو مجھے دیا گیا ہے۔ (بخاری شریف)

۶۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں جبرئیل حاضر تھے۔ اچانک اپنے اوپر ایک سخت آواز سنی اور سر اقدس اوپر اٹھایا اور فرمایا: یہ آواز آسمان کے ایک دروازے کے کھلنے کی ہے جو سوائے آج کے کبھی نہیں کھلا۔ اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا ہے۔ یہ فرشتہ آج سے پہلے زمین پر کبھی نہیں اترا۔ اس نے سلام کیا اور کہا آپ کو دو نور کی بشارت ہو جو آپ کو دیئے گئے۔ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ فاتحۃ الکتاب اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں۔ ان کے کسی حرف کو جو بھی پڑھے گا وہ اسے دیا جائیگا۔ (مسلم شریف)

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: فاتحۃ الکتاب میں ہر بیماری سے شفا ہے۔

۸۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سفر میں تھے۔ ایک جگہ ہم نے پڑاؤ کیا، وہاں ایک لونڈی آئی۔ اس نے کہا کہ ہمارے قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ ہمارے آدمی موجود نہیں، تم میں کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟

ہم میں سے ایک ایسا آدمی اٹھا جس کے بارے میں ہمارا یہ گمان نہ تھا کہ یہ جھاڑ پھونک جانتا ہے۔ اس نے جا کر اسے جھاڑا، اس نے اس شخص کو تیس بکریاں دیں اور ہم سب کو دودھ پلایا۔ یہ شخص جب لوٹا تو ہم نے اس سے پوچھا کہ کیا تو جھاڑ پھونک جانتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں ام الکتاب (سورۂ فاتحہ) سے جھاڑتا ہوں۔ ہم نے اس بات کا کہیں تذکرہ نہیں کیا۔ جب مدینہ طیبہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو سارا واقعہ بیان کیا۔ حضور نے فرمایا: بہت خوب وہ کیسے جانتا تھا کہ رقیہ ہے۔ ان بکریوں میں سے مجھے بھی ایک حصہ دو۔

(بخاری شریف)

خاصیت:

کسی بھی مشکل کے حل کے لیے کسی بھی دعا کی مقبولیت کے لیے سورۂ فاتحہ کا یہ عمل مجرب ہے۔ صبح صادق کے طلوع ہوتے ہی فجر کی سنت پڑھ کر اکتالیس بار اس طرح سورۂ فاتحہ پڑھے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے میم کے زیر کو الحمد کے لام کے جزم سے ملائے۔ بیچ سے ہمزہ وصلی (الف) گرا دے، اول آخر کم از کم تین تین بار درود شریف اس کے بعد اپنے مقصد کی دعا کرے، دعا قبول ہوگی۔ مجرب ہے۔ جتنا حضور قلب توجہ الی اللہ کرے، اسی قدر جلد حاجت برآئے گی۔ کوشش یہ کرے کہ فرض سے پہلے یہ وظیفہ پورا کرلے۔ لیکن اگر فرض کی جماعت شروع ہوجائے تو جماعت میں شریک ہوجائے، بعد میں تعداد پوری کرے۔

سورۂ فاتحہ

آیات: (۷) سورۃ الفاتحہ مکیہ: رکوع: (۱) کلمات: (۱۴۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۂ فاتحہ کے متعدد نام ہیں: فاتحہ، فاتحۃ الکتاب، ام القرآن، سورۃ الکنز، سورۃ الحمد، سورۃ الدعاء، سورۃ المناجاۃ، سورۃ التفویض، سورۃ السوال، سورۃ الصلوٰۃ، کافیہ، وافیہ، شافیہ، شفاء، ام الکتاب، فاتحۃ القرآن، سبع مثانی، نور، رقیہ، سورۃ التعلیم۔

اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ فاتحہ میں سات آیتیں ہیں۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ، سورۂ فاتحہ کا جز ہے یا نہیں۔ صحیح یہی ہے کہ بسم اللہ، سورۂ فاتحہ کا جز نہیں، اور نہ کسی اور سورت کا۔ سورتوں کے مابین فصل کے لیے ہے۔

سورۂ فاتحہ کے بارے میں تین قول ہیں۔ مکی ہے، مکی اور مدنی دونوں ہے۔ یعنی دو بار نازل ہوئی۔ ایک بار مکہ میں، ایک بار مدینہ میں۔ ایک قول یہ ہے کہ آدھی مکے میں نازل ہوئی، آدھی مدینے میں۔

مکی ان سورتوں یا آیتوں کو کہتے ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں۔ مدنی ان کو کہتے ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔ اگر چہ وہ بعد ہجرت مکے میں نازل ہوئی ہوں۔ جیسے آیہ کریمہ: "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" یہ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں نازل ہوئی۔

سورۂ فاتحہ میں سے نہ کوئی آیت ناسخ ہے نہ کوئی منسوخ۔

اللہ عزوجل نے اپنی عظیم کتاب بسم اللہ سے شروع فرما کر بندوں کو تعلیم دی ہے کہ اپنے ہر نیک و جائز کام بسم اللہ سے شروع کریں۔ اس لیے ہر نیک و جائز کام بسم اللہ سے

شروع کرنا مستحب ہے۔ ناجائز و حرام کام بسم اللہ سے شروع کرنا منع ہے۔

اللہ:۔ یہ لفظ مشتق نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ (خازن) بلکہ یہ اس ذات کا نام ہے جو معبود برحق، واجب الوجود، قدیم یعنی ازلی ابدی ہے۔ اور تمام صفات کمالیہ کی جامع ہے اور یہ نام اسی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ کسی دوسرے پر اس کا اطلاق نہ کبھی ہوا ہے اور نہ جائز ہے۔

الرحمن الرحیم: رحمٰن، رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں۔ دونوں صفت مشبہ کے صیغے ہیں، دونوں مبالغہ کے لیے ہیں۔ مگر رحمٰن میں مبالغہ زیادہ ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ سب سے بڑا مہربان یعنی جو اتنا مہربان ہو کہ اتنا مہربان ہونا دوسرے کے لیے ممکن نہ ہو۔ اسی لیے رحمٰن کا اطلاق اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور پر جائز نہیں۔ حتیٰ کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی نہیں۔ اگرچہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحمۃ اللعالمین ہیں۔ بخلاف رحیم کے اس کا اطلاق ذات باری تعالیٰ کے علاوہ خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر قرآن مجید میں ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌo (توبہ)

اس سے ظاہر ہوا کہ اسمائے حسنیٰ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں جیسے رحمٰن، قدوس، صمد۔ دوسرے وہ جن کا اطلاق ذات باری تعالیٰ کے علاوہ دوسروں پر بھی صحیح ہے۔ جیسے رؤف، رحیم، علی، حی، سمیع، بصیر، علیم، حفیظ، وغیرہ اگرچہ دونوں کے اطلاق میں معانی کا بہت بڑا فرق ہے۔ اللہ عزوجل کی ہر صفت واجب، قدیم، غیر متناہی، ذاتی، غیر مخلوق ہے۔ اور مخلوق کی ہر صفت ممکن، حادث، متناہی، عطائی، مخلوق ہے۔ اللہ عزوجل رحیم ہے اس معنی کر کے اس کی صفت رحمت واجب، قدیم، غیر متناہی، ذاتی، غیر مخلوق ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحیم ہیں اس معنی کر کے آپ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صفت رحمت ممکن، حادث، متناہی، عطائی اور مخلوق ہے۔

اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ بعض کلمات کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہوتے ہیں، ان کا اطلاق اللہ عزوجل کے علاوہ دوسرے پر صحیح نہیں اگرچہ

اس کلمہ کا معنی اشتقاق لغوی دوسرے میں پایا جائے۔ جیسے یہی لفظ رحمٰن ہے از روئے لغت اس کا معنی مہربان کے ہے، اور بلاشبہہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مہربان ہیں۔ مگر آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو "رحمٰن" کہنا منع ہے۔ رحیم کہتے ہیں۔ دوسری مثال عزوجل کی ہے، ان کے معنی ہیں، عزت والا، جلال والا، اس میں کسی مسلمان کو شبہہ نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عزت وجلال والے ہیں۔ خود قرآن مجید میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ o (منافقون)

اللہ اور رسول اور مومنین ہی کے لیے عزت ہے۔

مگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام نامی کے ساتھ عزوجل کہنا منع ہے۔ اس منع کا یہ مطلب نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ساری کائنات سے زیادہ عزت جلال والے نہیں بلکہ وہ ساری کائنات سے زیادہ عزت وجلال والے ہیں، مگر لفظ عزوجل کا استعمال چوں کہ اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہے، اس لیے اس لفظ کو نام نامی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ استعمال کرنا منع ہے۔

رحمت میں مبالغہ کا مطلب ہوتا ہے: رحمت میں زیادتی۔ یہ زیادتی باعتبار کم (مقدار) کے ہو یا باعتبار کیف کے ہو۔ رحمٰن میں یہ زیادتی اگر باعتبار کم (مقدار) کے مراد لی جائے تو چوں کہ دنیا میں اللہ عزوجل کی رحمت عام ہے، مومن، کافر، انسان، حیوان سب کو۔ یہ رحمت کی زیادتی مقدار میں ہوئی۔ اور آخرت میں اللہ عزوجل کی رحمت صرف مسلمین کے ساتھ خاص ہوگی۔ کافر اس سے محروم رہیں گے۔ اس لحاظ سے کہا جاتا ہے:

یا رحمن الدنیا ورحیم الاخرۃ۔

اور اگر رحمٰن میں رحمت کی زیادتی باعتبار کیف ملحوظ ہو تو یوں کہا جاتا ہے:

یا رحمن الدنیا والاخرۃ ورحیم الدنیا۔

اس لیے کہ دنیا کی نعمت کتنی ہی عظیم ہو آخرت کی نعمت کے مقابلے میں حقیر ہے۔

کلام کا اسلوب یہ ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے رحیم کو پہلے مذکور ہونا چاہیے تھا، اور رحمٰن کو بعد میں۔ مگر اللہ عزوجل نے رحمٰن کو پہلے ذکر کیا اور رحیم کو

بعد میں۔ اس لیے کہ رحمٰن اگر چہ صفت ہے مگر چوں کہ یہ اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہے، اس لحاظ سے بہ منزلہ علم کے ہوگیا اور علم صفت پر مقدم ہوتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ

سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہاں کا پالنے والا، سب سے بڑا مہربان رحمت والا، یوم جزا کا مالک ہے۔

الحمد:

دو کلمے سے مرکب ہے۔ الف لام (ال) اور حمد۔ یہ مصدر ہے۔ اور الف لام جنس کا بھی ہوسکتا ہے، اور استغراق کا بھی۔ زبان سے کسی کی واقعی خوبی بیان کرنے کو حمد کہتے ہیں خواہ کسی نعمت کی عطا پر ہو، خواہ بغیر اس کے۔ کسی نعمت کی عطا پر نعمت دینے والے کی عظمت کو زبان یا دیگر اعضا سے ظاہر کرنا یا اس کی عظمت کا اعتقاد رکھنا شکر ہے۔ شکر کی اعلیٰ قسم یہ ہے کہ دل میں اعتقاد کے ساتھ زبان سے اظہار کیا جائے۔ حدیث میں ہے:

الحمد رأس الشکر ما شکر اللہ من لم یحمدہ۔

حمد بہترین شکر ہے جس نے اللہ کی حمد نہیں کی، اس نے شکر نہیں کیا۔

اس میں راز یہ ہے کہ اعتقاد کی کسی کو کیا خبر۔ اعضا کے اعمال میں اس کا احتمال ہے کہ تمسخر تو نہیں۔ مگر دل کے ساتھ زبان سے جو شکر ہوگا وہ ان دونوں سے زیادہ واضح غیر مشکوک ہوگا۔

للہ:

میں لام اختصاص کے لیے ہے۔ یعنی سب تعریف اللہ ہی کے ساتھ خاص ہے اس کے سوا کوئی ایسا نہیں جو تمام تعریف کا اہل ہو۔ اس لیے کہ حمد واقعی خوبی بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ تو جس میں جتنی خوبی ہو اتنی ہی بیان کرنی حمد ہوگی، اس سے زیادہ بیان کرنا جھوٹ ہوگا۔ سوائے اللہ عزوجل کے کوئی ایسا نہیں جو تمام خوبیوں سے متصف ہو۔ اس لیے اس کے سوا کوئی حمد کا اہل نہیں۔ اور چوں کہ اللہ علم ہے اس ذات کا جو تمام صفات کمالیہ جملہ خوبیوں کے ساتھ متصف ہے۔ اس لیے وہ سب تعریف کا مستحق ہے۔ ذرا غور کرنے سے واضح

ہو جائے گا کہ یہ جملہ دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی۔

رب:

مصدر تربیت کے معنی میں ہے۔ کسی چیز کو رفتہ رفتہ اس کے کمال تک پہنچانے کو تربیت کہتے ہیں، جسے اردو میں پالنا کہتے ہیں۔ یہ مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ یعنی پالنے والا۔ عرب کے عرف میں ''رب'' بلا اضافت اللہ عزوجل کے لیے خاص ہے۔ اضافت کے ساتھ دوسرے کے لیے بھی بولا جاتا ہے، جیسے قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول مذکور ہے:

اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ......فَیَسْقِیْ رَبَّـــــهٗ خَمْـــرًا

دونوں جگہ یہ معنی آقا ہے، مگر اردو میں رب یا پروردگار، اضافت کے ساتھ بھی مخلوق کے لیے نہیں بولا جاتا۔

اَلْعٰـــــلَمِیْنَ:

عالَم کی جمع ہے۔ اس پر الف لام استغراق کا ہے معنی میں 'سب' کے۔ عالم اصل میں علم یعلم کا اسم آلہ ہے۔ جیسے ختم یختم سے خاتم ہے۔ عالم کے معنی ہیں: جاننے کا ذریعہ۔ دنیا کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز اپنے صانع اللہ عزوجل کے جاننے کا ذریعہ ہے۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ورق دفتریست معرفت کردگار

درختوں کے سبز پتے ہوش والوں کی نگاہ میں اللہ عزوجل کی معرفت کے دفتر کے ورق ہیں۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف سبز پتے ہی نہیں۔ سوکھا پتا بھی۔ صرف ورق ہی نہیں بلکہ کائنات کا ہر ہر ذرہ اس کی معرفت کا دفتر ہے۔ اس معنی اشتقاق کی مناسبت سے، اللہ عزوجل کے ماسوا کو عالم کہتے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے جمع لانے کی ضرورت نہ تھی مگر چوں کہ عالم کی انواع کثیر ہیں، اگر واحد ہوتا تو اس کا شائبہ تھا کہ کوئی کسی قسم کی تخصیص کا پہلو نکالتا، اس کے ازالے کے لیے الف لام استغراق کے ساتھ جمع لایا گیا تا کہ جمیع عالم کے

احاطے پر نص ہو جائے، کسی طرح کسی تخصیص کا پہلو نہ نکل سکے۔

العالمین ، جمع سالم ہے، اور جمع سالم پر الف لام جمع قلت کی علامت ہے۔ حالاں کہ عالم کثیر ہے۔ یہاں جمع کثرت لانی مناسب تھی۔ یہاں جمع قلت لانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عالم کتنا ہی کثیر ہو مگر اللہ عزوجل کی شان ربوبیت کے آگے قلیل ہے۔ اس لیے کہ اللہ عزوجل کی یہ صفت دیگر صفات کی طرح غیر متناہی بالفعل ہے اور عالم کتنا ہی کثیر ہو، بہر حال متناہی ہے۔ اور غیر متناہی کے سامنے متناہی کی کیا حیثیت؟ عالم کتنا ہی کثیر ہو اقل قلیل ہوگا۔

اس کلام کی خوبی یہ ہے کہ یہ اللہ عزوجل کی اعلیٰ درجے کی حمد بھی ہے اور سننے والے کو اللہ کی حمد پر ابھارنے والا بھی، اس طرح کہ جب اللہ ہی تمام جہاں کا پالنے والا ہے اور سننے والا بھی عالم کا ایک فرد ہے۔ اپنے پالنے والے کی حمد وستائش انسانیت کا مقتضی تو لامحالہ اس کے دل میں یہ ولولہ پیدا ہوگا کہ اللہ عزوجل کی حمد کرے۔

نیز کسی کی عیال داری میں بہت زیادہ افراد ہوں تو جو سنتا ہے، عش عش کرتا ہے۔ کمال ہے اتنے لوگوں کو پالتا ہے۔ اللہ عزوجل چوں کہ سارے جہاں کا پالنے والا ہے وہ بھی اس حسن وخوبی سے کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے تو اس صفت کا تصور آتے ہی بے ساختہ زبان پر آئے گا۔ الحمد للہ رب العالمین۔ ایک شخص جب بہت سے لوگوں کی پرورش کرتا ہے تو ہزار شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہمیشہ غلط ہی نہیں ہوتیں کبھی کبھی صحیح بھی ہوتی ہیں۔ ماں باپ کی شفقت اولاد پر مسلم ہے، لیکن ہزار ایسے واقعات ہیں کہ ماں باپ کا رجحان بعض اولاد کی جانب زیادہ اور بعض کی جانب کم ہوتا ہے، پھر اس رجحان کا اثر داد و دہش پر بھی پڑنے لگتا ہے۔ میاں بیوی کا تعلق نسل انسانی کی بقا کا ضامن ہے مگر یہاں میاں بیوی کے کتنے لطیفے حقوق کی ادائیگی سے متعلق جنم لیتے رہتے ہیں۔ بھائی بھائی کی محبت بھی ضرب المثل ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ مثل بھی:

سگ باش برادر خرد مباش

اس لیے یہاں کوئی یہ شبہہ کرسکتا تھا کہ اللہ اکیلا سارے جہاں کا پالنے والا ہے تو

کہیں یہاں بھی اس قسم کی بے اعتدالی تو نہیں؟ اس لیے اس کے بعد فرمایا:

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ:

نہیں یہاں کسی بے اعتدالی کا گذر نہیں۔ اس لیے کہ وہ رحمٰن سب سے بڑا مہربان بھی ہے اور رحیم رحمت والا بھی۔ کسی کو دینا کسی کو محروم کرنا، کسی کو زیادہ کسی کو کم دینا یہ رحمت ومہربانی کے منافی ہے۔ دیتا سب کو ہے مگر بقدر ظرف دیتا ہے۔ اس لیے کہ داد و دہش میں ظرف کا لحاظ نہ کرنا کبھی رحمت کے بجائے ظلم بن جاتا ہے۔ ایک باپ کے دو بیٹے ہیں۔ ایک سعید، صالح۔ دوسرا شقی، شریر، جواری، شرابی۔ ظاہر ہے تقاضائے شفقت یہ ہے کہ سعید وصالح پر جتنی ہو سکے داد و دہش کی جائے۔ دوسرے کو ایک پھوٹی کوڑی نہ دی جائے۔ پہلے کو نہ دینا رحمت کے مقتضٰی کے خلاف۔ دوسرے کو دینا رحمت کے منافی۔ اس باریک نکتے کا جلوہ اللہ عزوجل کی شان ربوبیت میں قدم قدم پر موجود ہے۔

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ: یوم جزا کا مالک ہے۔

مالک اسے کہتے ہیں جو اپنی ملک میں جو چاہے جیسے چاہے، جب چاہے تصرف کرے۔ یہ تصرف بجا بھی ہوسکتا ہے اور بے جا بھی۔ مگر جو مالک عاقل ودانا ہوگا وہ اپنی ملک میں کبھی بے جا تصرف نہیں کرے گا۔ پہلے معلوم ہو چکا کہ اللہ عزوجل تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے۔ اسے لازم کہ تمام صفات غیر کمالیہ سے پاک ہو۔ خصوصا صفات نقص سے اس لیے، وہ ظلم ولغو سے منزہ ہے، حکمت والا ہے۔ اس لیے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوگا۔ رحمٰن رحیم ہے، اس لیے بھی اس کا تصرف ظلم وتعدی سے پاک ہوگا۔ اب اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ عزوجل یوم جزا کا مالک ہے جو عدل وانصاف کے ساتھ بلکہ رحمت وکرم کے ساتھ اس دن لوگوں کو بدلہ دے گا۔ نہ کسی کی حق تلفی ہوگی، نہ کسی پر ظلم ہوگا، نہ کوئی مستحق محروم رہے گا۔

اللہ عزوجل آج بھی سارے جہاں کا مالک ہے۔ یوم جزا کا بھی مالک رہے گا پھر یوم جزا کی تخصیص کی کیا وجہ؟ آج یعنی اس دنیا میں بھی اگر چہ مِلک حقیقی اللہ عزوجل ہی کی ہے مگر بہت سے ایسے ہیں کہ خدا کے وجود کے منکر ہیں۔ یہ خدا کی ملکیت کے کیسے قائل ہوں

گے۔ بہت سے خدائی میں شرکت کے دعوے دار ہیں اور اپنی اپنی اگر چہ مجازی، عارضی ہی ملکیت کے دعوے دار تو بھی ہیں، مگر یوم جزا قیامت کے دن کا معاملہ ایسا ہوگا کہ ملحدین ومشرکین بھی مان لیں گے کہ اس کا وجود ہے اور صرف وہی مالک ہے۔

نیز اس دن سب کی عارضی مجازی ملکیت بھی ختم ہو جائے گی۔ خالص اللہ عزوجل ہی کی ملکیت باقی رہے گی۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (مومن)

اس خصوصیت کی وجہ سے یوم جزا کا مالک فرمایا۔

انسان کی پانچ قسمیں ہیں:۔

اول: وہ جو ذہین، فطین، اور فراخ دل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ صاحب کمال کو اس کے کمال سے پہچان لیتے ہیں، اور اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

دوم: جو انعام واکرام کے بعد ہی کسی کے کمال کو جانتے ہیں، اور اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

سوم: وہ جو انعام واکرام پا کر بھی اس شبہے میں گرفتار رہتے ہیں کہ شاید یہ انعام واکرام کسی غرض کی وجہ سے ہے۔ غرض نکل جانے کے بعد بند ہو جائے گا۔ ایسے لوگوں کو اگر یہ توقع ہو کہ آئندہ بھی یہ فیضان کرم جاری رہے گا تو ممدوح کی مدح وستائش میں لگے رہتے ہیں۔

چہارم: وہ سافل سرشت، غافل لوگ جو کسی باکمال کے کمال کو صرف کمال سے پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور صلاحیت رکھتے بھی ہیں تو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ دادو دہش بھی انہیں اعتراف کمال پر آمادہ نہیں کرتی، ان کی افتاد طبع یہ ہے کہ جب تک انہیں مار کا ڈر نہ ہو سیدھے نہیں ہوتے۔

پنجم: وہ اسفل وارذل جو مار کی دھمکی سے بھی راہ راست پر نہیں آتے۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لیے حمد الٰہی پر آمادہ کرنے کے لیے اللہ عزوجل کا تصور ہی کافی ہے۔ دوسری قسم کے لوگوں کے لیے اس کی صفت ربوبیت ورحمت کا اعتقاد حمد الٰہی بجالانے کے لیے کافی ہے

۔رہ گئے تین اخیر قسم کے لوگ تو ان کے لیے فرمایا گیا:

یوم جزا کا مالک ہے۔اگر اس کی حمد کرو گے، اس کا اس دن بھی اچھا صلہ پاؤ گے، اور اگر اس کی حمد نہیں کرو گے، اس کا شکر نہیں کرو گے۔ ناشکری کی سزا پاؤ گے۔اور جو اس پر بھی اس کا شکر گزار بندہ نہ ہوسکا۔وہ ضرور ناشکری کی سزا پائے گا۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ:

اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

سابقہ آیتوں میں اس کا بیان تھا کہ اللہ عزوجل تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے، اور سارے عالم کو اس دنیا میں بھی ان گنت نعمتوں کا عطا فرمانے والا ہے اور یوم جزا میں بھی مستحقین کو عطا فرمائے گا۔تو ایسے عظمت والے کرم والے کی عظمت دل میں بھی راسخ ہونی چاہئے اور زبان کو بھی اس کی مدح میں مشغول ہونا چاہیے۔اور جوارح کو بھی اس کی برتری اور علو کو اپنے افعال سے ظاہر کرنا چاہیے۔اس لیے اب بندہ اظہار عبودیت کرتے ہوئے عرض کرتا ہے۔

اے سارے کمالات کا جامع! اور سارے جہان کا پالنے والا! سب سے بڑا مہربان، رحمت والا! اے یوم جزا کا مالک! جب تو ایسا ہے اور تیرے ان کمالات میں کوئی شریک نہیں ـــــ تو ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

کسی کے لیے انتہائی تذلل، فروتنی، عاجزی کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔اس حد تک کہ اس کے آگے فروتنی کی کوئی حد نہ ہو، اس کا دارو مدار اعتقاد پر ہے، اور اگر انتہائی حد سے کچھ کم ہے تو یہ تعظیم ہے۔اس کو یوں سمجھئے۔سارے علما حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ بے کس پناہ کی حاضری کے آداب میں لکھتے ہیں:

یقف کمایقف فی الصلوٰۃ (ھندیہ: فتح القدیر ، طحطاوی)

یوں کھڑا ہو جیسے نماز میں کھڑا ہوتا ہے۔

یعنی ہاتھ باندھ کر۔یوں ہی تمام دنیا میں دستور ہے کہ بزرگان دین کے حضور تلامذہ نیاز مند دوزانو بیٹھتے ہیں۔مگر یہ عبادت نہیں تعظیم ہے، مگر نماز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا بلکہ

رکوع اور سجدے کے مابین بے ہاتھ باندھے کھڑا ہونا اور قعدہ میں دوزانو بیٹھنا عبادت ہے۔
افعال باعتبار ظاہر کے یکساں ہیں، مگر ایک جگہ تعظیم دوسری جگہ عبادت، ایسا کیوں؟

تذلل اور خضوع کے مختلف درجے ہیں۔ ایک درجہ وہ ہے جو چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ جو بیٹا باپ کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو ہر سعید نو عمر بوڑھے بزرگ کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو ہر ان پڑھ دیندار عالم دین کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ جو ہر مرید اپنے پیر کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو عامہ مسلمین اولیائے کرام کے لیے کرتے ہیں۔ ایک وہ ہے جو ہر مسلمان صحابہ کرام کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو ہر امتی اپنی نبی کے لیے کرتا ہے۔ ان سب سے اوپر وہ خضوع اور تذلل ہے جو بندہ اپنے معبود کے لیے کرتا ہے۔ سات پہلے والے خضوع وتذلل تو ہیں مگر غایت خضوع اور تذلل نہیں۔ غایت خضوع اور تذلل انتہائی عاجزی وفروتنی وہ ہے جو بندہ اپنے معبود کے لیے کرتا ہے، یہی درجہ عبادت ہے۔

عبادت کے افعال میں سب سے زیادہ جو عبادت کے ساتھ مختص ہے وہ سجدہ ہے مگر سجدہ بھی مطلقا عبادت نہیں، ورنہ ہر سجدہ عبادت ہوتا۔ اور اللہ عزوجل کے سوا کبھی کسی اور کے لیے سجدہ کرنا شرک ہوتا، اور کسی شریعت میں جائز نہ ہوتا۔ حالاں کہ اگلی شریعت میں سجدۂ تعظیمی غیر خدا کے لیے نہ صرف جائز بلکہ بعض جگہ فرض تھا مثلا فرشتوں کو جو حکم تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ اگر یہ سجدہ فرض نہ ہوتا تو سجدہ نہ کرنے اور اس سے انکار کرنے کی وجہ سے ابلیس کافر اور راندۂ بارگاہ نہ ہوتا۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ سجدہ بھی اگر غایت خضوع وتذلل سے نہ ہو تو عبادت نہیں تعظیم ہے۔ اسی وجہ سے ہماری شریعت میں سجدۂ عبادت غیر خدا کے لیے شرک ہے مگر سجدۂ تعظیمی شرک نہیں حرام ہے۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ کسی فعل کے عبادت ہونے اور نہ ہونے کا دارومدار انسان کے اعتقاد پر ہے اگر کوئی کام کسی کے لیے اس تصور کے ساتھ کیا جائے کہ ہم اپنے بس میں جتنی فروتنی جتنا تذلل رکھتے ہیں، بس اسی کے لیے ہے تو یہ کام عبادت ہوگا اور اگر تصور میں فروتنی

وتذلل کچھ کم رہا تو عبادت نہیں تعظیم ہے۔

عبادت چوں کہ غایت خضوع انتہائی تذلل کا نام ہے، اور غایت خضوع اور تذلل صرف اسی کے حضور کرنا تقاضائے عقل وخرد ہے، جو سب سے زیادہ عظمت وجبروت والا ہو، اور وہ ذات صرف اللہ عزوجل ہی کی ہے۔ اس لیے اللہ عزوجل کے سوا کسی اور کی عبادت مقتضائے عقل کے منافی ہے۔

بندے نے 'ایاک نعبد' کہہ کر جب اپنی یہ حیثیت متعین کردی کہ میں اس وقت رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوں، اس سے خطاب کررہاہوں، اور بادشاہ کی بارگاہ میں حاضری کے وقت بادشاہ کے علاوہ کسی اور سے عرض مطلب کرنا انتہائی حماقت ہے تو عرض کرتا ہے۔

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○

اے اللہ! اس وقت جب کہ ہم تیری عبادت کررہے ہیں، تیری بارگاہ میں حاضر ہیں، صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں، تیری بارگاہ میں حاضری کے وقت کسی اور سے کیا مانگیں۔ "ایاک نعبد" کے بعد اس کے ساتھ "ایاک نستعین" عرض کرنا قرینہ ہے کہ حالت عبادت میں جب کہ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضری ہے اس کے سوا اور کسی سے مدد چاہنا، آداب بارگاہ کے منافی ہے۔ لہذا اس سے یہ استدلال کرنا کہ اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور سے مدد طلب کرنا شرک ہے، باطل ہوگیا۔

یا یہ کہا جائے گا کہ یہ حصر، حصر اضافی ہے۔ مشرکین کے معبودان باطل کے اعتبار سے۔ کیوں کہ مشرکین اپنے معبودوں کی عبادت بھی کرتے تھے، اور ان سے مدد بھی مانگتے تھے، تو مومن موحد ان کے اس غلط عقیدے پر تعریض کرتے ہوئے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے کہ اے اللہ ہم ان باطل معبودوں سے بے زار ہیں، ہم ان باطل معبودوں کو نہ پوجیں نہ ان سے مدد چاہیں، ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں، اور صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں، ان باطل معبودوں سے نہیں۔

ورنہ اگر حصر حقیقی مانا جائے اور اس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ اللہ عزوجل کے سوا کسی

سے مطلقا مدد مانگنا جائز نہیں، شرک ہے۔ تو لازم آئے گا کہ تمام دنیا کے کل مسلمان مشرک ہو جائیں۔ اس لیے کہ ہر شخص زندگی میں قدم قدم پر غیروں سے مدد مانگتا ہے، لیتا ہے۔ اور اگر یہ تخصیص کی جائے عوام سے مانگنا جائز اور انبیا و اولیا سے شرک یا زندوں سے مدد مانگنا جائز اور مزارات میں آسودگان سے شرک۔ تو یہ تخصیص بے جا ہوگی۔ اس لیے شرک میں زندہ، مردہ، نبی، امتی، ولی، عامی کی تخصیص نہیں۔ اللہ عزوجل کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں، شرک ہے۔

تو کیا انبیا و اولیا کی عبادت شرک اور عوام کی ثواب ہے۔ وفات پانے والوں کی عبادت شرک اور زندوں کی طاعت۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے دین کے ساتھ عقل بھی چھین لی گئی ہو۔ اسی طرح جب پوری امت کا اس پر عملی اعتقادی، قولی، اجماع ہے کہ اپنے کاموں میں اپنے متعلقین اپنے بزرگوں سے مدد مانگنی اور لینی جائز ہے اور یہ ایاک نستعین کے منافی نہیں تو انبیا و اولیا سے بعد وصال بھی مدد مانگنا بلا کسی ادنیٰ شائبہ ممانعت کے جائز ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی قدس سرہ السامی نے احیاء العلوم میں فرمایا:

من یستمد فی حیاتہ یستمد بعد مماتہ۔

جس سے زندگی میں مدد مانگی جا سکتی ہے اس سے بعد وصال بھی مانگی جا سکتی ہے۔

اور سیدی احمد بن مرزوق مغربی قدس سرہ نے فرمایا: یہ دیار مغرب کے صف اول کے اولیا و فقہا میں ہیں:

وصال شدہ کی امداد زندہ سے زیادہ قوی ہے

اس پر شیخ ابو العباس حضرمی نے فرمایا:

یہ بات بالکل صحیح ہے اس لیے کہ وصال یافتہ بزرگ بارگاہِ حق جل مجدہ میں حاضر ہے۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہ ''اشعۃ اللمعات'' میں یہ تینوں اقوال نقل کر کے فرماتے ہیں کہ:

اس بارے میں بزرگانِ دین کے اقوال شمار سے باہر ہیں۔

یہی شیخ اسی ''اشعۃ اللمعات'' میں اور عارف باللہ ملا عبد الرحمٰن جامی قدس سرہ ''نفحات الانس'' میں فرماتے ہیں۔ شیخ ابو الحسن قرشی نے فرمایا:

میں ایسے چار بزرگوں کو جانتا ہوں جو اپنے اپنے مزارات میں ویسے ہی تصرف کرتے ہیں جیسے زندہ۔ شیخ معروف کرخی، شیخ عبدالقادر گیلانی (غوث اعظم)، شیخ عقیل منجی، اور شیخ حیات حرانی قدس اللہ اسرارہم۔

اس پر حضرت محدث دہلوی قدس سرہ نے فرمایا: ان چار ہی میں حصر نہیں۔ انہوں نے جو دیکھا اور پایا بیان کیا اور اگر نظر دقیق سے دیکھا جائے تو انبیا، اولیا سے مدد مانگنا حقیقت میں اللہ عزوجل ہی سے مدد مانگنا ہے۔ اس لیے کہ انبیائے کرام اور اولیائے عظام اپنے اپنے وابستگان دامن کو جو امداد کرتے ہیں، وہ اللہ کی دی ہوئی قوت اس کے عطا کردہ اختیار اور اس کے اذن سے کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد منقول ہے:

"اِنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـٴَـةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ" (۳/۱۳)

میں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی مورت بناتا ہوں۔ پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فوراً پرندہ ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے۔ اور مادر زاد اندھے کو اور سفید داغ والے کو اچھا کرتا ہوں، اور میں مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے۔

اور یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ بادشاہ اپنی رعایا کے کاموں کو سرانجام دینے کے لیے جن افراد کو مقرر کرے، تو رعایا کا ان افراد سے مدد مانگنا حقیقت میں بادشاہ ہی سے مدد مانگنا ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ اللہ عزوجل نے انبیائے کرام اور اولیائے عظام کو لوگوں کی امداد، دستگیری، فریادرسی، مشکل کشائی، حاجت روائی کی قوت دی ہے یا نہیں۔ یہ بخاری شریف کی اس حدیث قدسی سے ظاہر ہے جو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

ما یزال العبد یتقرب الی بالنوافل حتی احببته فاذا احببته فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی

بھا، (زاد الشیخ الدھلوی فی الاشعة) وفؤاده الذی یعقل به ولسانه الذی یتکلم به فبی یسمع وبی یبصر وبی یبطش وبی یمشی (اشعة اللمعات: ص ۱۹۳۔۱۹۴، ج۲)

بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔ پھر جب اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ (دوسری روایت میں اتنا زیادہ ہے) اور اس کا دل ہو جاتا ہوں جس سے وہ جانتا ہے، اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے، (دوسری روایت میں یوں ہے) تو وہ مجھی سے سنتا ہے اور مجھی سے دیکھتا ہے اور مجھی سے پکڑتا ہے اور مجھی سے چلتا ہے۔

اللہ عزوجل ہاتھ پاؤں، زبان، دل، آنکھ، کان سے منزہ ہے۔ اور کسی بندے کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، زبان، دل ہونے سے اور زیادہ منزہ ہے، پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے، اسے راس المفسرین امام فخر الدین رازی کے قلم حق رقم سے سنئے فرماتے ہیں:

"کذالک العبد اذا واظب علی الطاعات بلغ الی المقام الذی یقول الله کنت له سمعا وبصرا فاذا صار نور جلال الله سمعا له سمع القریب والبعید واذا صار ذالک النور بصرا له رای القریب والبعید واذا صار ذالک النور یدا له قدر علی التصرف فی الصعب والسهل والبعید والقریب"

(تفسیر کبیر: سورہ کہف: ج ۲۱ ص:۹۱)

ایسے ہی جب بندہ نیکیوں پر پابندی کرتا ہے تو اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ عزوجل اس کے لیے یہ فرماتا ہے کہ میں اس کا کان اور آنکھ ہو جاتا ہوں۔ پس جب اللہ کے جلال کا نور اس کے لیے کان ہو گیا تو وہ دور و نزدیک کی سب سنے گا اور جب یہ نور اس کی آنکھ ہو گیا تو دور و نزدیک سب دیکھے گا، اور جب یہ نور اس کا ہاتھ ہو گیا تو سخت نرم زمین دور و نزدیک ہر جگہ تصرف پر قادر ہو جائے گا۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو محبوب بنالیتا ہے تو اس کے کان میں یہ قوت پیدا کردیتا ہے کہ وہ دور کی بھی آواز سنتا ہے اور قریب کی بھی، پست بھی اور بلند بھی۔ اور اس کی آنکھ میں یہ قوت پیدا کردیتا ہے کہ وہ دور کی چیزوں کو بھی دیکھتی ہے اور نزدیک کی بھی ظاہر چیزوں کو بھی اور پوشیدہ چیزوں کو بھی۔ اور اس کے ہاتھ میں یہ قوت پیدا کردیتا ہے کہ وہ پہاڑ، میدان، خشک وتر، دور ونزدیک ہر جگہ تصرف کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کی متفقہ عقائد کی کتابوں میں تصریح ہے: "کرامات الاولیا حق" اولیا کی کرامت حق ہے۔

علامہ ابوالبرکات نسفی قدس سرہ اس کی تفصیل میں فرماتے ہیں:

"فتظهر الكرامة على طريق نقض العادة للولى من قطع المسافة البعيدة فى المدة القليلة فظهور الطعام والشراب واللباس عند الحاجة والمشى على الماء والطيران فى الهواء وكلام الجماد والعجماء واندفاع المتوجه من البلاء وكفاية المهم عن الاعداء.

ولی سے ما فوق العادت کرامت ظاہر ہوتی ہے۔ لمبی مسافت تھوڑی دیر میں طے کرنا، کھانے اور پینے کی چیز اور لباس ضرورت کے وقت مل جانا، پانی پر چلنا، فضا میں اڑنا، جماد اور بے زبان کا کلام کرنا، اپنی طرف توجہ کرنے والے کی بلا دور کرنا، دشمنوں کے شر سے بچانا۔

اسی پر علامہ سعد الدین تفتازانی قدس سرہ فرماتے ہیں:

وامثال هذا اكثر من ان يحصىٰ (شرح عقائد : ص۱۰۷)

اس کی مثالیں ان گنت ہیں۔

الغرض! قرآن واحادیث، اقوال سلف وخلف سے یہ ثابت ہے کہ اللہ عزوجل نے انبیائے کرام تو انبیائے کرام، اولیائے عظام کو بھی یہ قدرت دی ہے کہ وہ لوگوں کی دادرسی ودست گیری، مشکل کشائی، حاجت روائی، فرمائیں، اس لیے انبیائے کرام واولیائے عظام سے مدد مانگنا، حقیقت میں اللہ عزوجل ہی سے مدد مانگنا ہے۔ اس لیے انبیائے کرام اور

اولیائے عظام سے مدد مانگنا "ایاک نستعین" کے منافی نہیں۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

ہم کو سیدھا راستہ چلا۔ راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا۔ نہ ان کا جن پر غضب ہوا، اور نہ بہکے ہوؤں کا۔

کسی سے مانگنے کا سب سے موثر طریقہ یہی ہے کہ پہلے منعم کی حمد وستائش کی جائے پھر اس کے ساتھ اخلاص و نیازی مندی ظاہر کی جائے۔ پھر سوال کیا جائے۔ اللہ عزوجل نے غایت کرم سے اپنے بندوں کو یہ طریقہ تعلیم فرمایا۔ پہلے اس کی حمد کی گئی، اس کے اوصاف کمالیہ کا ذکر کیا گیا، پھر اس کی بارگاہ میں عجز ونیاز ظاہر کیا گیا۔ اس کے بعد سوال کیا گیا اور سوال بھی وہ کہ اس سے اہم اس سے اعظم دوسرا کوئی سوال ہی نہیں۔ سوال میں منعم کی حیثیت کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ سوال جب اسی منعم سے ہے جو رب العالمین ہے تو اس سے معمولی سوال کم ہمتی ہے۔ اس لیے سوال میں وہ تلقین کیا گیا جو سب سے اہم واعظم ہے۔ منعم جب مائل بکرم ہو تو صرف اپنی ذات کے لیے سوال کم ظرفی ہوگی، اس لیے تعلیم دی گئی کہ صرف اپنے لیے نہ مانگے بلکہ اپنے تمام رفقا کے لیے مانگے۔ اس لیے جمع کی ضمیر ذکر کی گئی۔

ہدایت کا معنی ہے شفقت ومہربانی کے ساتھ کسی کو منزل تک پہنچانا۔ یہ منزل مختلف ہے، معاشی، سیاسی، مذہبی وغیرہ وغیرہ۔ یہاں کسی منزل کی تخصیص نہیں کی گئی۔ یہ اشارہ دیتے ہوئے کہ ہماری منزل کوئی بھی ہو اے اللہ! ہر منزل تک ہمیں اپنے کرم سے پہنچا۔ خواہ وہ منزل دینی ہو خواہ دنیوی۔ معاشی ہو یا سیاسی، جسمانی ہو یا روحانی۔

پھر اسباب ہدایت چار ہیں: وجدان، حواس، عقل، وحی۔ تین اول اسباب میں قدم قدم پر ٹھوکر کا اندیشہ ہے۔ مختلف جذبات ان تینوں کو مغلوب کر لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسان بہک جاتا ہے۔ ان چاروں میں نرالی ترتیب ہے۔ وجدان غلطی کرتا ہے تو حواس اس کو بچاتے ہیں۔ حواس غلطی کرتے ہیں تو عقل اس کی دست گیری کرتی ہے اور جب عقل ٹھوکر

کھاتی ہے تو اس کو صحیح راہ پر لگانے کے لیے وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس عرض کا ایک مفہوم یہ بھی ہوتا ہے کہ اے اللہ! ہمارے وجدان کو اور ہمارے حواس اور ہماری عقل کو غلط روی سے بچا، اور وحی کی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچا۔ ایک مومن جو سیدھے راستے پر گامزن ہے یہ دعا اس لیے مانگ رہا ہے کہ کہیں نفس، شیطانی جذبات وغیرہ ہمیں اس سیدھے راستے سے ہٹا نہ دے۔ اس لیے اندیشے کے تحت وہ ثبات قدمی استقامت اور تادم آخر اس پر دوام کا سوال کر رہا ہے۔

علاوہ ازیں ہدایت کے درجات مختلف ہیں۔ عوام کے اور خواص کے اور سالکین کے اور واصلین کے اور ابرار کے اور مقربین کے اور صدیقین کے اور صلحا کے اور شہدا کے اور انبیائے کرام کے اور مومن بندہ ایک درجے کے بعد دوسرے درجے پر ترقی کا سوال کر رہا ہے۔ گویا عرض کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہی درجے پر ہمیں روک مت دے، اپنے کرم سے یکے بعد دیگرے درجات پر ترقی عطا فرماتا رہ۔ "صراط الذین انعمت علیھم" سے اس کی طرف بھی اشارہ ہے۔

صراط مستقیم: سے یا تو مراد ہر ایک نیک مقصود کا راستہ خواہ وہ کوئی ہو، یا خاص اسلام مراد ہے۔ یا قرآن مراد ہے، یا خلق نبوی مراد ہے۔ یا صحابہ کرام اور اہل بیت عظام مراد ہیں۔

بندے نے صراط مستقیم پر ثبات کی دعا مانگی، اللہ عزوجل خوب جانتا ہے کہ سیدھی راہ کیا ہے؟ بارگاہِ ایزدی میں درخواست کے لیے اتنی عرضی کافی تھی۔ "ہمیں سیدھے راستے پر چلا" مگر قرآن مجید صرف دعا و مناجات کا مجموعہ نہیں یہ خلق خدا کی دوامی اور کامل رہنمائی کا نسخہ کیمیا بھی ہے۔ اس لیے صراط مستقیم کی توضیح کے لیے اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو بھی ذکر فرما دیا، تاکہ حق کے متلاشی کو دشواری نہ پیش آئے۔

صراط مستقیم کا مثبت پہلو یہ ہے کہ صراط مستقیم وہ ہے جس پر چل کر لوگ کامیاب ہو چکے ہیں۔ اور اللہ عزوجل کے انعام بے کراں سے سرفراز ہوئے ہیں۔ یہاں ان کا تذکرہ اجمال کے ساتھ ہے، مگر سورۂ نساء میں ان کی تفصیل مذکور ہے۔ "فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ

اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ" انہیں ان کا ساتھ ملے گا جس پر اللہ نے احسان کیا، یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور نیک لوگ۔

اب اس درخواست کا ماحصل یہ ہوا کہ ہمیں انبیا صدیقین شہدا صالحین کے راستے پر چلا۔ اب یہ درخواست اتنی مکمل ہوگئی کہ اس میں کہیں خلا نہیں۔ مگر سوائے ملحدین کے تمام مذہب والے اس کے مدعی ہیں کہ ہم انبیا وصدیقین شہدا اور صالحین کے راستے پر ہیں۔ اس لیے غلط دعویداروں کے گمان فاسد کو ختم کرنے کے لیے منفی پہلو کو بھی ذکر فرمایا کہ یہ بھی ساتھ ساتھ ذہن میں رکھو کہ جو قومیں غضب الٰہی کی مورد بنیں اور جو گمراہ ہوگئیں وہ راہ راست پر نہیں اس لیے یہ بھی غرض کرو کہ مورد غضب اور گمراہ قوموں کے راستے سے بچائے رکھ۔ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ اپنے مدلول کے لحاظ سے عام ہے۔ اور مراد ہر گمراہ قوم ہے۔ خواہ یہود ہوں خواہ نصاریٰ، اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب، مجوس ہوں یا مشرکین، دہریے ہوں یا ملحدین سب کو شامل ہے۔

مگر بہت سے مفسرین نے "مغضوب علیھم" سے یہود مراد لیا ہے۔ اور ضالین سے نصاریٰ اس تخصیص کا سبب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جن انبیائے کرام پر ایمان کا ادعا کرتے ہیں ان کے نبی ہونے ان کے مذہب کے برحق ہونے کا اعتراف قرآن مجید میں بار بار کیا گیا ہے۔ ان کے فضائل ومناقب سے قرآن مجید مالا مال ہے۔ ان کے اوپر نازل شدہ کتابوں کی جگہ جگہ تصدیق فرمائی گئی ہے اس لیے ان دونوں کو اپنے ذاتی اعتقاد کے علاوہ قرآن مجید کے اعتراف صداقت کی وجہ سے بہت بڑا غرہ تھا کہ ہم لوگ صراط مستقیم پر ہیں، ہم انبیا وصدیقین، شہدا وصالحین کے راستے پر ہیں حالاں کہ ان کا یہ غرہ تین وجہ سے باطل تھا۔ اول یہ کہ انہوں نے نبی کے لائے ہوئے دین کو بدل ڈالا۔ دوم یہ کہ کتاب الٰہی میں تحریف کر ڈالی۔ سوم یہ کہ اسلام نے سارے دین کو منسوخ کر دیا۔ ان کے اس غرہ فاسدہ پر تعریض کے لیے خصوصیت سے فرمایا گیا کہ صراط مستقیم یہود جیسے مورد غضب قوم اور نصاریٰ جیسے گمراہ قوم کا طریقہ نہیں۔

نیز اس میں تنبیہ ہے کہ جو صراط مستقیم سے ہٹے گا وہ غضب الٰہی کا مستحق ہے اور گمراہ

ہے۔ یہود کو مغضوب علیہم فرمانا اور نصاریٰ کو ضالین سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ یہود کی حالت نصاریٰ سے بہت زیادہ بدتر ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے اس بدنصیب قوم پر اللہ عزوجل نے جتنا زیادہ احسان فرمایا ہے اگلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں مگر اس بدطینت قوم نے بجائے شکر کے جتنی ناشکری کی ہے اور جتنی سرکشی کی ہے اور جتنا تمرد کیا اور کسی قوم نے نہیں کیا۔

احکام: سورتوں کی ابتدا میں جو بسم اللہ ہے یہ قرآن مجید کا جز ہے، مگر سورۂ فاتحہ یا کسی سورہ کا جز نہیں۔ اس پر دلیل یہ حدیث ہے جسے امام مسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: میں نے صلوٰۃ اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھے آدھ تقسیم کردی ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا جب بندہ "الحمد لله رب العالمين" کہتا ہے تو اللہ عزوجل فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی۔ (الحدیث)

اس حدیث میں "صلوٰۃ" سے سورہ فاتحہ کا مراد ہونا متعین ہے، اور اسے شروع فرمایا "الحمد لله" سے تو معلوم ہوا کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کا جز نہیں، اور جب سورہ فاتحہ کا جز نہیں تو کسی سورہ کا جز نہیں لعدم القائل بالفصل، بسم اللہ کا نزول دو سورتوں کے مابین فصل کے لیے ہے۔ سورۂ نمل میں جو بسم اللہ ہے وہ سورۂ نمل کا جز ہے۔

جہری نمازوں میں بھی بسم اللہ کو آہستہ پڑھیں گے۔ سورۂ فاتحہ میں بالاتفاق سات آیتیں ہیں۔ ہم احناف کے نزدیک "انعمت علیھم" ایک آیت ہے اور غیر المغضوب علیهم ولا الضالین الگ آیت۔

اور شوافع وغیرہ جو بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جز مانتے ہیں وہ بسم اللہ کو ایک آیت اور انعمت علیهم سے آخر تک کو ایک آیت کہتے ہیں۔ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، جو قصداً نہ پڑھے تو نماز واجب الاعادہ ہے اور بھول کر نہ پڑھے تو سجدۂ سہو واجب۔

امام کے پیچھے مقتدی کو قرآن مجید پڑھنا مطلقاً منع ہے۔ اس کے اطلاق میں سورہ فاتحہ بھی داخل ہے۔ مقتدی کو سورہ فاتحہ کا بھی پڑھنا منع ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

جب قرآن پڑھا جائے تو اسے بغور سنو اور چپ رہو امید کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ یہ اپنے عموم کے لحاظ سے نماز و غیر نماز دونوں کو شامل ہے۔ علاوہ ازیں امام ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔ جب تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور جب وہ قراءت کرے تو چپ رہو۔

نیز صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب امام قراءت کرے تو چپ رہو۔ نیز امام محمد نے موطا میں اور امام ترمذی نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جو امام کے پیچھے ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔

سورۂ بقرہ

سورۂ بقرہ مدنی ہے، اس میں دوسو چھیاسی یا ستاسی آیتیں، چالیس رکوع، چھ ہزار اکیس الفاظ، اوربیس ہزار حروف ہیں۔

فضائل:

امام مسلم سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنالو۔ (کہ گھروں میں اللہ عزوجل کا ذکر نہ کرو) شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے، جس میں 'سورۂ بقرہ' پڑھی جاتی ہے۔

یہی امام سیدنا ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن پڑھا کرو۔ قرآن قیامت کے دن اپنی تلاوت کرنے والوں کا شفیع ہوگا۔ دو نورانی سورتیں سورۂ بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو۔ یہ دونوں بادل یا چھتری بن کر یا قطار در قطار پرندوں کے جھنڈ کی طرح قیامت کے دن آئیں گی اور اپنی تلاوت کرنے والوں کی حمایت میں جھگڑا کریں گی۔ سورۂ بقرہ پڑھو، یہ برکت ہے، اس کا چھوڑنا حسرت ہے، باطل پرست اس کی استطاعت نہیں پاتے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ وہ ایک رات سورۂ بقرہ کی تلاوت کررہے تھے، ان کا گھوڑا ان کے پاس ہی بندھا تھا، اچانک وہ بھڑکا، یہ چپ ہوگئے تو گھوڑا بھی ساکن ہوگیا، دوبارہ تلاوت شروع کی تو گھوڑا پھر بھڑکا، انہوں نے تلاوت بند کردی، تو گھوڑے نے بھی بھڑکنا بند کردیا، اب تلاوت شروع کی تو گھوڑا پھر بھڑکا، انہوں نے اب تلاوت بند کردی۔ ان کے بچے بھی قریب ہی سوئے ہوئے تھے یہ ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گھوڑے کے بھڑکنے سے بچے کو چوٹ لگ جائے یہ اپنے بچے کو گھوڑے سے دور کرکے باہر نکلے تو دیکھا کہ فضا میں

ایک چھپر ہے، جس میں چراغوں کے مثل کچھ روشن چیزیں ہیں، صبح کو خدمت اقدس میں حاضر ہوکر پورا واقعہ سنایا تو حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اسید! اسے پڑھا کرو، یہ فرشتے تھے جو تمہاری تلاوت سننے آئے تھے، اگر تم اسے پڑھتے رہتے تو صبح کو لوگ انہیں دیکھتے۔ کسی سے چھپتے نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث میں وارد ہے کہ فرمایا: ہر چیز کا ایک سنام ہوتا ہے اور قرآن کا سنام سورۂ بقرہ ہے، سنام کے معنی اونٹ کے کوہان کے ہیں۔ یہاں مراد بلندی ہے۔ (صاوی)

ایک حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے پوچھا: قرآن کا کون سا حصہ افضل ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول جانیں۔ فرمایا: ''سورۂ بقرہ'' پھر دریافت فرمایا کہ سورۂ بقرہ کا کون سا حصہ افضل ہے۔ صحابہ نے عرض کیا اللہ ورسول جانیں۔ فرمایا: آیۃ الکرسی، خالد بن معدان نے فرمایا: سورۂ بقرہ قرآن کا خیمہ ہے۔

حضرت ابن عربی نے فرمایا: سورۂ بقرہ میں ۱۷ ہزار حکم اور ہزار نہی ہیں۔ ہزار خیر ہے۔ ہزار حکمتیں ہیں۔ اسے یاد کرنا برکت ہے۔ اس کا چھوڑنا حسرت ہے، باطل پرست مثلاً جادوگر اس کی استطاعت نہیں پاتے، جس گھر میں پڑھی جائے تین دن تک وہاں شیاطین داخل نہ ہوں گے۔

فوائد:

جس گھر میں جن خبیث اور جادو کا اثر ہو اس گھر میں باوضو باطہارت ایک ہفتہ سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جائے آسیب کا عمل دخل ختم ہو جائے گا۔

خلاصہ:

یہ سورہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، مگر مصحف شریف میں ابتدا میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ حسب ارشاد ربانی رکھی گئی۔ اس لیے کہ یہ سورۂ پاک دلائل وآیات کے ساتھ ساتھ کثیر اعمال وعقائد کا خزانہ ہے، مکہ معظمہ میں اسلام کے بلا واسطہ حریف صرف مشرکین تھے۔ جو

بے علم ان پڑھ وحشی خونخوار طرح طرح کے اوہام وخرافات وغیرہ انسانی افعال کے عادی تھے، وہ نہ قیامت کے قائل تھے نہ اعمال وعقائد کی جزا وسزا کے نہ کتب الٰہیہ پر ایمان رکھتے تھے، نہ نبوت کے قائل تھے، اس لیے مکی سورتوں میں ایسے مضامین زیادہ تھے جو براہ راست ان کی جہالت وضلالت کی بیخ کنی کرنے والے تھے۔

مگر جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو براہِ راست یہاں تصادم یہود سے ہوا۔ مدینہ طیبہ کے اصل باشندے اگر چہ انصار کرام تھے، جن کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام تھی، مگر مدینہ طیبہ پر اقتدار اصل میں یہود کا تھا، وہ ہر طرح انصار پر بالا دستی رکھتے تھے، مدینہ طیبہ کی زرخیز زمین ان کے قبضے میں تھی، تجارت ان کے ہاتھ میں تھی، وہ چالاک عیاد تھے، یہود بزعم خویش نہ صرف اہل مدینہ بلکہ پوری دنیا سے اپنے کو برتر جانتے تھے، توریت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان کا بھی دعویٰ رکھتے تھے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ میں تشریف لانے کے بعد جب انصار مسلمان ہوگئے، اور قرب وجوار کے باشندے بھی اسلام قبول کرنے لگے، تو یہود کو صاف نظر آیا کہ اب ان کے دن گئے، اس لیے اگر چہ بظاہر انہوں نے دوستی کے معاہدے کی حامی بھرلی مگر در پردہ اسلام کی جڑ کاٹنے میں انہوں نے کوئی کمی نہیں کی۔ اسلام کے بنیادی عقائد واعمال پر بے جا اعتراضات حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے طرح طرح کے سوالات، نکتہ چینی حتی کہ آپ کے قتل کی کوشش، دسیسہ کاری، انصار ومہاجرین کو لڑانے کی سازش، انصار کو بھڑکانے کی ترکیب اوران سب پر مستزاد یہ کہ اپنی قوم اپنے مذہب کی فوقیت کا پروپیگنڈہ۔

یہود کے علاوہ یہودی سازش سے منافقین پیدا ہوئے، مکہ میں صرف دو فریق تھے یا تو کھلے مخالف یا کھلے مومن۔ یہاں مار آستین وجود میں آئے۔ ان کا فتنہ بہت سنگین تھا، یہ قسمیں کھا کھا کر ایمان کا دعویٰ کرتے، نمازیں پڑھتے، جہاد میں شریک ہوتے مگر اسلام اور مسلمان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔

یہ وجوہ تھے جن کی وجہ سے عام خطاب کے بجائے یہود ومنافقین بھی خاص طور سے

مخاطب بنائے گئے۔ اور مشرکین کے ساتھ یہود و منافقین پر بھی رد شروع ہوا۔ اب اس کی ضرورت شدید تھی کہ اسلام کے عقائد و اعمال کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ان کی خوبیاں بیان کی جائیں، دلائل و براہین پیش کیے جائیں تاکہ چالاک کیا د حریف کی ترکیب کارگر نہ ہو۔

اس لیے اس سورہ میں قرآن کے کتاب الٰہی ہونے اور پیغمبر اسلام کے رسول اللہ ہونے، وجود باری، توحید باری، اس کے صفات کمالیہ کے اثبات، قیامت، جنت و دوزخ، جزا سزا، بعث بعد الموت پر دلائل و براہین ذکر کیے گئے۔

اور علاوہ عبادت کے بہت سے معاملات کے قوانین نازل ہوئے، اور جب اسلام کے قدیم حریف کفار مکہ نے بزور شمشیر، اسلام کو مٹانا چاہا تو جہد البقا کے بطور دفاع کی اجازت دی گئی اور جنگ و صلح کے حکا بیان ہوے۔

الحاصل یہ سورہ پاک اسلام کے اصول و فروع کے کثیر حصہ پر حاوی ہے۔ اس لیے خالد بن معدان نے فرمایا کہ سورۂ بقرہ قرآن کا خیمہ ہے، جیسے ایک خیمے میں صاحب خیمہ کی ضروریات کی اشیا موجود ہوتی ہیں، اسی طرح ایک صاحب بصیرت کو صاف نظر آئے گا کہ سورۂ بقرہ میں اس کے عقائد و اعمال کی درستگی اور نکھارنے کے لیے بہت کچھ مذکور ہے۔

الٓمٓ:

چند سورتوں کے شروع میں حروف تہجی مفرد یا مرکب مذکور ہیں، جیسے الٓمٓ، الٓر، حٰمٓ، صٓ، نٓ وغیرہ۔ ان کو مقطعات قرآنیہ کہتے ہیں۔ یہ متشابہات میں سے ہیں۔ قرآن مجید کی اپنے معانی پر دلالت کے واضح اور خفی ہونے کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں۔ محکم اور متشابہ۔

محکم: وہ ہے جس کی دلالت اس کے معنی پر واضح ہو۔

متشابہ: وہ ہے جس کی دلالت اس کے معنی پر واضح نہ ہو (جلالین)

متشابہ کے بارے میں تین مذاہب ہیں: اسلم، احکم، زائغ۔

اسلم: یہ ہے کہ اس کا علم اللہ عزوجل کے حوالے کیا جائے اور کوئی تاویل نہ کی جائے۔

احکم: یہ ہے کہ اس کی تاویل کی جائے مگر ایسی تاویل نہ کی جائے جو محکمات کے

معارض ہو۔

زائغ: وہ لوگ ہیں جو ایسی تاویل کرتے ہیں جو محکمات کے معارض ہے۔

زائغین کا مذہب ناقابل اعتبار ہے، رہ گئے اسلم اور احکم ان دونوں کی تائید صحابہ وسلف سے ملتی ہے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہر کتاب میں کچھ راز ہیں۔ اور اللہ عزوجل کا راز قرآن میں اوائل سور ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہر کتاب کی کچھ منتخب باتیں ہیں، اور اس کتاب قرآن کی منتخب بات، حروف تہجی (مقطعات) ہیں۔ (خازن)

ان دونوں ارشادات سے مذہب اسلم اختیار کرنے والے حضرات دلیل لاتے ہیں ،مگر خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا:

یا کھیعص یاحم عسق (بیضاوی)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مقطعات اللہ عزوجل کے اسما ہیں۔ اور یہ ایک تاویل ہے، اس لیے اس سے مذہب احکم کی تائید ہوتی ہے۔

اب تاویل کرنے والوں کے اس بارے میں کثیر اقوال ہیں:

۱۔ یہ حروف تہجی کے اسما ہیں۔

۲۔ قرآن کے اسما ہیں۔

۳۔ یہ سورتوں کے اسما ہیں۔

۴۔ ہر حرف اللہ عزوجل کے کسی اسم کا رمز ہے۔ مثلاً الف: اسم جلالت اللہ کا، لام: لطیف کا۔ میم مجید کا۔

۵۔ یہ حروف اللہ عزوجل کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہیں۔ مثلاً الف: الاء اللہ (اللہ کے انعام) کی جانب، لام: اللہ عزوجل کے لطف کی جانب، میم: اللہ عزوجل کے ملک کی جانب۔

۶۔ یہ اشارے ہیں فرشتوں کے اسما کی جانب۔

۷۔ یہ اشارے ہیں کسی نبی کے نام کی جانب۔

۸۔ الف سے اللہ کی جانب، لام سے جبرئیل کی جانب، میم سے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب اشارہ ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر اتری ہے۔ (صاوی، روح البیان وغیرہ)

۹۔ سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: الف میں چھ ایسی صفت ہیں جو اللہ عزوجل کی چھ صفات کے مماثل ہیں۔

۱۔ ابتدا: اللہ عزوجل اول ہے۔

۲۔ سیدھا ہونا: اللہ عزوجل عادل ہے، جو ظلم نہیں کرتا۔

۳۔ انفرادیت: اللہ عزوجل فرد واحد ہے۔

۴۔ کسی حرف کے ساتھ نہ ملنا: اللہ عزوجل تمام موجودات سے منفرد ہے۔

۵۔ سب حروف الف کے محتاج ہیں۔ مگر الف کسی کا محتاج نہیں: اللہ عزوجل غنی مطلق ہے، اور ساری خلق اس کی محتاج۔

۶۔ الف کے معنی الفت کے ہیں: اللہ عزوجل ہی اس لائق ہے کہ اس سے الفت کی جائے۔ (روح المعانی)

۱۰۔ الف کا مخرج حلق کا اندرونی ابتدائی حصہ اور لام کا مخرج وسط زبان اور میم کا مخرج دونوں ہونٹ ہیں۔ حروف کے مخارج کی ابتدت اندرن حلق اور انتہا ہونٹ ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے '**حم' 'عسق**' سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنے محاربے کا استخراج فرمایا۔

ابوالحکم عبدالسلام بن برجان نے اپنی تفسیر میں "**الم، غلبت الروم**" سے اس وقت جب کہ نصاریٰ کا بیت المقدس پر قبضہ تھا۔ اس کے فتح کی تاریخ ۵۸۳ھ کا استخراج کیا۔ سید المکاشفین سیدنا محی الدین ابن عربی قدس سرہ نے بھی فتوحات میں اسی حصے سے اور ایک اور طریقے سے فتح بیت المقدس کی تاریخ کا استخراج فرمایا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حضور

اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مقطعات کا علم ہے ورنہ خطاب لغو ہوگا۔

اس پر دلیل یہ حدیث ہے کہ جبرئیل امین جب سورۂ مریم لے کر حاضر ہوئے اور پڑھا: کاف، تو حضور نے فرمایا: میں نے جان لیا۔ پھر جب پڑھا: **ھا**: تو فرمایا: میں نے جان لیا۔ جب پڑھا: **یا**: تو فرمایا: میں نے جان لیا۔ جب پڑھا: **عین**: تو فرمایا: میں نے جان لیا۔ پھر جب پڑھا: **صاد**: تو فرمایا: میں نے جان لیا۔ جبرئیل نے متحیر ہوکر عرض کیا: آپ نے کیسے جان لیا؟ میں نے تو نہیں جانا۔ (روح البیان، بیضاوی، روح المعانی)

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو سید الانبیا ہیں۔ حضور کی امت کے اولیائے کرام ان کے معانی جانتے ہیں۔ (روح المعانی)

فائدہ:

یہ حروف اس کی دلیل ہیں کہ قرآن مجید حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں۔ اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دنیا میں کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا۔ اور جس نے پڑھنا لکھنا نہ سیکھا ہو وہ اپنی فطری صلاحیت سے فصیح سے فصیح کلام بول سکتا ہے مگر کسی کلمے کی ہجے نہیں کرسکتا۔ نہ یہ بتا سکتا ہے کہ اس کلمے میں کون کون حروف تہجی ہیں۔ بلکہ وہ سرے سے ان حروف تہجی کو جانے گا ہی نہیں۔ مگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس کلام کے بارے میں دعویٰ فرمایا کہ اللہ عزوجل کا کلام ہے اس میں نہایت مرصع حسن ترتیب کے ساتھ حروف تہجی موجود ہیں۔ تو ماننا پڑے گا کہ یہ کلام حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے، حقیقت میں اللہ عزوجل ہی کا ہے۔

مشرکین قرآن مجید کی تلاوت کے وقت شور مچاتے کہ نہ خود قرآن مجید سنیں نہ دوسروں کو سننے دیں۔ جب یہ مقطعات نازل ہوئے اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی تلاوت کی تو وہ یہ عجیب وغریب کلمہ سن کر متحیر ہوجاتے کہ آخر اس کے معنی کیا ہوں گے۔ اور اس سوچ میں خاموش ہوجاتے۔

لطیفہ:

جب الم نازل ہوا تو یہودیوں نے کہا کہ الف کے ایک عدد لام کے تیس، میم کے

چالیس۔ کل میزان اکہتر ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت اکہتر سال باقی رہے گی، ہم اس امت میں شامل ہو کر کیا کریں۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا تو یہودیوں نے کہا اس کے علاوہ اور کچھ ہے تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے المص تلاوت فرمایا، تو یہودیوں نے کہا یہ اس سے زیادہ ہے، ایک سو اکسٹھ۔ اب انہوں نے پوچھا اس کے علاوہ اور کچھ ہے، تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے المر کی تلاوت کی، اس کے عدد دو سو اکہتر ہیں تو وہ جاہل مبہوت ہو کر بولے کہ آپ نے ہم پر خلط ملط کر دیا۔ ہم کس کو لیں۔ (تفسیر زاہدی)

تناسب:

اس کے قبل سورۂ فاتحہ تھی جو محکم ہے، اس کے معانی اس کے کلمات سب پر واضح ہیں۔ سورۂ بقرہ کی ابتدا مقطعات سے کی، جس کے معانی ہم کو معلوم نہیں۔ یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی دونوں قسموں کی جانب کہ اس کا کچھ حصہ محکم ہے، جس کے معانی واضح ہیں، اور کچھ حصہ متشابہ ہے، جن کے معانی معلوم نہیں۔ تاکہ ابتدا ہی سے قاری دونوں قسموں پر مطلع ہو کر ہوشیار رہے۔ قرآن مجید میں ہر جگہ معانی معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے۔ محکمات میں حتی المقدور غور وفکر، تلاش وجستجو کرے اور متشابہات کا علم اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سپرد کرے۔

خواص:

مقطعات قرآنیہ کے بے شمار خواص ہیں، جو شخص تمام مقطعات کا اپنے نام کے عدد دونا روزانہ طلوع فجر کے وقت پڑھنے پر مداومت کرے وہ عزیز خلائق ہو، اس کا سب پر رعب ہو، ہمیشہ ہر کام میں مظفر ومنصور رہے، کبھی رزق کی تنگی نہ ہو، ان کا مجموعہ یہ ہے۔

الم، المص، الر، المر، کھیعص، طہ، طسم، طس، یس، ص، حم، حم، عسق، ق، ن۔

اور اگر **الم** و **حم** کو چھ بار اور **الر** کو پانچ بار **طسم** دو بار پڑھے تو

تاثیر زیادہ ہوگی۔

ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَارَیْبَ فِیْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ o الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ o

ترجمہ: اس عظیم الشان کتاب میں کوئی شک نہیں۔اللہ کا خوف رکھنے والوں کے لیے ہدایت ہے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کو کما حقہ ادا کرتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں سے خرچ کرتے ہیں۔

مناسبت:

سورۂ فاتحہ میں بندوں نے اللہ عزوجل سے دعا کی تھی کہ ہم کو صراط مستقیم پر چلا۔اب اللہ عزوجل کی طرف سے بندے کو مژدہ دیا جاتا ہے۔اے بندے! تجھے صراط مستقیم پر ثابت رکھنے کے لیے یہ عظیم الشان کتاب ہم نے اتاری ہے جو ہر شک وشبہہ سے بالاتر ہے، اور ہمارا خوف رکھنے والوں کے لیے مطلوب تک پہنچانے کی کفیل ہے۔گویا یہ ارشاد بندے کی سابقہ دعاؤں کی مقبولیت کی نوید ہے۔

ذالک ــــــ کا معنیٰ 'وہ' ہے، جو دور کے اشارے کے لیے آتا ہے۔یہ ارشاد کتاب کا جز ہے۔اور چوں کہ کتاب قریب تر ہے،اس لیے بجائے "ذٰلک" کے "ھـذا" آنا چاہئے تھا، جس کا معنیٰ "یہ" ہے۔کتاب کی عظمت شان ظاہر کرنے کے لیے ذٰلک کا لفظ استعمال فرمایا۔

"اس میں کوئی شک نہیں" کا محمل دو ہے۔ایک یہ کہ اس کے ارشادات کا حرف حرف حق ہے۔کہیں کوئی غلط بات نہیں۔دوسرے یہ کہ اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔اس معنی کو پہلا معنی لازم ہے۔اس لیے کہ جب یہ یقینی طور پر اللہ کی کتاب ہے اور اللہ عزوجل صادق القول ہے تو اس کے ارشادات حق ہیں، جن میں کسی غلطی کا امکان نہیں۔اس لیے اس میں کسی شک وشبہہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور جو لوگ کسی طرح کا شک کرتے ہیں، وہ یا تو اپنے دل کی بیماری کی وجہ سے شک کرتے ہیں یا جہالت وسفاہت کی بنا پر ورنہ اس کے کتاب الٰہی ہونے کے دلائل اتنے ٹھوس

ونا قابل انکار ہیں کہ جو بھی ذی عقل انصاف پسند ان کو بغور دیکھے گا تو اسے کوئی چارۂ کار نہیں سوائے اس کے کہ مان لے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔

اور یہی حال اس کے مضامین کا ہے کہ ہر ہر ارشاد کی صداقت کے دلائل اتنے قوی ہیں کہ ان کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

اللہ کا خوف رکھنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔

ہدایت کے دو معنی ہیں۔ ایک راستہ دکھانا، دوسرے مطلوب تک پہنچانا۔ یہاں دوسرا معنی متعین ہے۔ اس لیے کہ ہدایت کو متقیوں کے لیے خاص فرمایا اور مطلوب تک پہنچنا ان متقیوں ہی کے لیے خاص ہے۔ جن کے اوصاف ان آیات میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ لوگ مطلوب تک رسائی نہیں حاصل کرسکتے۔ لہذا قرآن، ہدایت بمعنی ایصال الی المطلوب متقیوں کے علاوہ دوسرے افراد کے لیے نہیں۔ اس بنا پر تخصیص ہوئی کہ یہ کتاب اللہ کا خوف رکھنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔ یعنی انہیں ان کے مطلوب حقیقی تک پہنچانے والی ہے۔ ہدایت کے مفعول ثانی کا ترک عموم پر دلالت کرتا ہے کہ یہ متقیوں کو ان کے ہر مطلوب تک پہنچانے والی ہے۔ خواہ وہ مطلوب دینی ہو یا دنیوی، جسمانی ہو یا روحانی، مذہبی ہو یا معاشی، سیاسی ہو یا سماجی۔

تقویٰ کے معنی ڈرنے کے ہیں۔ اور ڈرنے کے لیے لازم ہے کہ جس سے ڈر ہو اس کی فرماں برداری کی جائے۔ یہاں اللہ عزوجل سے ڈرنے والے مراد ہیں۔ تو حاصل یہ ہوا کہ متقی وہ ہے جو اللہ عزوجل کا تابع فرمان ہو۔ فرماں برداری یہ ہے کہ جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے انہیں کرے اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، ان سے دور رہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے فرمایا: تقویٰ کے سات درجے ہیں:

۱۔ کفر سے بچنا

۲۔ بدمذہبی سے بچنا

۳۔ ہر گناہ کبیرہ سے بچنا

۴۔ ہر گناہ صغیرہ سے بچنا

۵۔ شبہات سے بچنا

۶۔ شہوات سے بچنا

۷۔ اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور کی طرف توجہ سے بچنا

ان میں ہر بعد والا درجہ پہلے والے سے اعلیٰ ہے۔ اور ساتواں اخص خواص کے ساتھ خاص ہے۔ تیسری اور چوتھی آیتوں میں ان متقیوں کی کچھ علامتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلی علامت:

غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ غیب کے معنی لغت میں غائب شدہ چیز کے ہیں، اور یہاں مراد وہ چیزیں ہیں جو بداہت عقل اور حواس پنج گانہ یعنی باصرہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ، لامسہ کی دسترس سے باہر ہوں۔ یعنی جسے بداہت عقل یا حواس سے نہ جانا سکے۔

اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس پر کوئی دلیل قائم ہو۔

دوسرے وہ چیز جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو۔ (تفسیر بیضاوی)

یہاں دلیل عام ہے، خواہ عقلی ہو، خواہ سمعی، جس غیر پر دلیل قائم ہو وہ عطائی ہے اور جس پر کوئی دلیل عقلی یا سمعی نہ قائم ہو وہ ذاتی خاصہ باری تعالیٰ ہے۔ جن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم غیب سوائے اللہ عزوجل کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ اس سے مراد یہی ذاتی ہے، جو خاصہ الوہیت ہے۔ اور جن آیتوں میں انبیائے کرام کے لیے علم غیب کا اثبات ہے، ان سے مراد عطائی ہے۔

یہاں خاص بات یہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ متقیوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایمان نام ہے دل سے کسی بات کے سچ جاننے کا، اسی کو تصدیق بھی کہتے ہیں۔ اور تصدیق علم کی قسم ہے تو ثابت ہوا کہ متقیوں کو غیب کا علم حاصل ہے۔ کیوں کہ تصدیق بے علم کے محال ہے، تو ثابت ہو گیا کہ ہر مسلمان غیب جانتا ہے۔ مگر وہ اقل قلیل ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کو غیب جاننے والا غیب کا عالم نہیں کہتے۔ کیوں کہ عالم ہونے کے لیے معتد بہ علم کا حاصل ہونا لازم ہے۔ جس طرح ہر مسلمان بہت سے عقائد و احکام کا علم رکھتا ہے، مگر عالم نہیں کہتے۔ عالم اسے کہتے ہیں جو ایک معتد بہ مقدار علم رکھتا ہو، اسی طرح علم

غیب میں بھی ہے۔

اس سے مراد یہاں اللہ عزوجل ک ذات، صفات، فرشتے، وحی، احوال قبر، حشر ونشر جنت ودوزخ وغیرہ ہیں۔ ان چیزوں کو کوئی بھی نہ حواس سے معلوم کرسکتا ہے نہ بداہت عقل سے۔

دوسری علامت:

نماز کو کما حقہ ادا کرتے ہیں۔ کما حقہ ادا کرنے کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ پابندی کے ساتھ اس کے وقت پر اس طرح ادا کرتے ہیں کہ نہ قضا ہوتی ہے نہ مکروہ وقت میں ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ نماز کو اس کے تمام شرائط وآداب ظاہری وباطنی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ نماز کے شرائط اور آداب ظاہری کتب فقہ میں مصرح ہیں۔ آداب باطنی کی بنیاد احسان ہے، جسے حدیث جبرئیل میں بیان فرمایا:

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک.

یوں عبادت کرو گویا تم اپنے معبود کو دیکھ رہے ہو۔ یہ نہ ہوسکے تو کم از کم یہ ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

یعنی کسی بھی عبادت کے وقت اتنا حضور قلب ہو کہ بندے کے ذہن میں یہ تصور جما ہو کہ ہم اللہ عزوجل کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ احسان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ اگر کسی کی رسائی اس اعلیٰ درجہ تک نہ ہو، تو احسان کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم یہ تصور ہو کہ ہم کو اللہ عزوجل دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں تصور کا نتیجہ ہوگا کہ بندے کا ذہن غیر اللہ سے صاف ہوگا۔ عاجزی، فروتنی، خشوع وخضوع ہوگا۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ نماز میں ایسی لذت ملے گی کہ نماز کے مقابلے میں دونوں جہاں کی نعمتیں ہیچ محسوس ہوں گی۔

اے کہ می گوئی چرا جامے بجانے می خری
ایں سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

ان آداب ظاہری وباطنی کا مختصر بیان، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جو خوب اچھی طرح وضو کرکے انہیں ان کے وقت پر کامل خشوع

وخضوع کے ساتھ ادا کرے، اس کے لیے اللہ عزوجل کا وعدہ ہے کہ اسے بخش دے گا اور جوایسا نہ کرے اس کے لیے کوئی وعدہ نہیں، چاہے بخشے چاہے عذاب دے۔

تیسری علامت:

ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے، اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ "ممّا" میں من تبعیضیہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ تقویٰ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، سب خرچ کریں بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا کافی ہے، بلکہ عوام کے لیے کل کا کل خرچ کرنا منع ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

"وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل)

اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا مت رکھ اور نہ بالکل کھول رکھ کہ تو بیٹھ جائے، لوگ ملامت کریں اور تو پچھتائے۔

رہ گئے خواص جو مقام رضا وتسلیم پر فائز ہیں کہ ان کے دل پر مال کی موجودگی اورعدم موجودگی سب برابر ہے۔ ان کے معاملات الگ ہیں۔

خرچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جہاں اللہ عزوجل نے انہیں خرچ کرنے کی اجازت دی ہے اور جہاں حکم دیا ہے، وہیں خرچ کرتے ہیں۔ یہ زکوٰۃ اور دیگر تمام مصارف خیر صدقات ونوافل کو شامل ہے۔ ان علامتوں کی یہ ترتیب اس بنا پر ہے کہ ایمان سب پر مقدم ہے۔ بے ایمان کا کوئی عمل خیر کارآمد نہیں۔ ایمان کے بعد عبادات میں سب سے اہم نماز ہے۔ اسی وجہ سے نماز کا مکلف ہر بالغ عاقل مسلمان ہے۔ مال دار ہو یا تنگ دست، آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، تندرست ہو یا بیمار، مسافر ہو یا مقیم بخلاف دیگر فرائض کے کہ ان میں اتنا عموم نہیں۔ مثلاً روزہ ہے کہ بیمار اور مسافر کو حاملہ اور دودھ پلانے والی کو بہ شرائط یہ اجازت ہے کہ رمضان میں نہ رکھیں، دوسرے دنوں میں رکھیں۔ شیخ فانی کو اجازت ہے کہ روزے کے بجائے کفارہ ادا کرے۔ زکوٰۃ صرف صاحب نصاب آزاد بالغ پر فرض ہے، وہ بھی سال میں صرف ایک بار، وہ بھی وسعت کے ساتھ کہ فوراً ادائیگی واجب نہیں۔ زندگی میں جب بھی ادا

کرے، ادا ہی ہوگی۔ حج زندگی میں صرف ایک بار فرض ہے، وہ بھی ایسے شرائط کے ساتھ کہ ان سب کا تحقق بہت کم ہوتا ہے۔ اس لیے نماز کو مقدم فرمایا۔ روزہ اور حج اس وقت تک فرض نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے ان دونوں کا تذکرہ یہاں نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ أُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

اور جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو (اے محبوب) تم پر اتارا گیا اور جو تم سے پہلے اتارا گیا، اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ اس طریقہ پر ہیں جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے، اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

ان آیات میں سلسلہ وار متقیوں کی علامتیں بیان ہو رہی ہیں۔ تین علامتیں ان سے پہلے کی آیات میں مذکور تھیں، چوتھی علامت یہ بتائی گئی کہ متقی وہ لوگ ہیں جو ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر من جانب اللہ اترا ہے۔ پانچویں علامت یہ بتائی گئی کہ وہ لوگ اگلے انبیائے کرام پر جو کچھ اترا ہے، اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ چھٹی علامت یہ بتائی گئی کہ یہ لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

ما انزل:

عام ہے، خواہ وہ فرشتے کے واسطے سے اتارا گیا ہو یا فرشتے کے واسطے کے بغیر ہو۔ مثلاً اللہ عزوجل نے نبی سے خود کلام فرمایا ہو یا نبی کے دل میں القا فرمایا ہو۔ ان پر ایمان لانا ویسا ہی ضروری ہے جیسے ان پر ضروری ہے جو بواسطہ ملک ہو۔

ان علامات میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان بالغیب مطلقا معتبر نہیں۔ معتبر وہی ہے جو وحی الٰہی کے مطابق ہو۔ جیسے ہنود، مجوس، بدھشت وغیرہ۔ سینکڑوں ان دیکھی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مثلاً دیوی، دیوتا، اہرمن، تناسخ، آواگون، نرک، سورگ وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ معتبر نہیں۔ اس لیے کہ وحی ربانی کے مطابق نہیں، بلکہ اس کے خلاف ہے، اسی طرح عبادت کرنا اور نیکی کے نام پر خرچ کرنا وہی معتبر ہے جو وحی کے مطابق ہو ورنہ سب بے کار مفت کی مشقت اور اضاعت مال ہے۔

یہ یہود ونصاریٰ کا رد ہے۔ یہود کو یہ زعم تھا کہ چوں کہ ہم توراۃ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمیں کسی اور کتاب پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ یوں ہی نصاریٰ انجیل پر ایمان کو کافی جانتے تھے، یہ ان کی جہالت تھی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ محض توراۃ وانجیل یا کسی سابقہ آسمانی کتاب پر ایمان کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تمام اگلی کتابوں پر ایمان لایا جائے اور ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید پر بھی ایمان لایا جائے۔ اگر اگلی کتابوں پر ایمان ہو مگر قرآن پر ایمان نہ ہو تو اب یہ ایمان بے کار ہے۔

اور بہ نظر دقیق اگلی کتابوں پر ایمان مستلزم ہے، قرآن پر ایمان کو اس لیے کہ تمام اگلی کتابوں میں قرآن وصاحب قرآن کا ذکر موجود ہے اور سب میں قرآن وصاحب قرآن پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ اس لیے اگلی کتابوں پر صحیح ایمان اسی کا ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہے۔ قرآن کی تکذیب اگلی تمام کتابوں کی تکذیب ہے۔ اسی کو بیان فرمایا کہ متقی یعنی مومن وہ ہے جو قرآن پر بھی ایمان رکھتا ہو اور اگلی کتابوں پر بھی ایمان رکھتا ہے۔

قرآن پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مذکور تمام باتوں پر تفصیلی طور پر ایمان رکھا جائے۔ ان سب کو تفصیلی طور پر حق مانا جائے اور اگلی کتابوں پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اجمالی طور پر ان سب کو حق مانا جائے۔

یہ آیت حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ جب اسلام کا یہ مطالبہ ہے اللہ عزوجل کے تمام انبیا کو حق مانیں، ان پر نازل شدہ کتاب پر ایمان لائیں تو اگر بالفرض حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہوتا تو جیسے وما انزل من قبل فرمایا گیا ہے، وما انزل من بعد بھی ضرور فرمایا جاتا۔ وما انزل الیک وما انزل من قبلک پر اقتصار اس کی دلیل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔

آخرت سے مراد قیامت کے بعد کا عالم ہے۔ آخرت پر یقین اسلام کا بہت اہم مسئلہ ہے، اور یہ یقین انسان کے اللہ عزوجل کی طرف رجوع اور شریعت کی پابندی کی بنیاد ہے، جس کے دل میں یہ یقین جتنا راسخ ہوگا، اس کے دل میں اتنا ہی اللہ عزوجل کا خوف ہوگا، اتنا ہی

زیادہ وہ اعمال صالحہ اخلاق حسنہ سے آراستہ اور معاصی وسیئات سے بےزار ہوگا۔

یقین کے تین درجے ہیں: علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔

علم الیقین: وہ درجہ ہے جو کسی چیز کے بارے میں سن کر یا صحیح غور وفکر کے بعد حاصل ہوتا ہے

عین الیقین: وہ درجہ ہے جو کسی چیز کے بارے میں اسے دیکھ کر حاصل ہوتا ہے۔

حق الیقین: وہ درجہ ہے جو کسی چیز کے بارے میں اسے دیکھنے کے بعد برتنے پر حاصل ہوتا ہے۔

آخرت پر یقین کا علم الیقین کے درجہ تک ہر مسلمان مکلّف ہے۔ پھر اپنی اپنی استعداد مجاہدہ، ریاضت، انابت الی اللہ، شغل باللہ کے ساتھ ساتھ یہ ترقی کرتا رہتا ہے، تو عین الیقین تک پہنچتا ہے، پھر مزید ترقی کر کے حق الیقین تک۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ عین الیقین اولیائے کرام کا درجہ ہے اور حق الیقین انبیائے کرام کے ساتھ خاص ہے۔ (روح البیان)

متقیوں کی علامتوں کے بعد تقویٰ کا ثمرہ بیان ہوا کہ جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور مذکورہ اوصاف کے ساتھ متصف ہیں، یہی لوگ ہر طرح پر مقصد میں مکمل طور پر کامیاب ہیں۔ فلاح ہر قسم کی مکمل کامیابی کو کہتے ہیں۔ خواہ دنیوی ہو، خواہ اخروی۔ اب مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ دنیا میں بھی کامیاب ہیں، اور آخرت میں بھی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

جو لوگ کفر پر اڑے ہیں، انہیں تم ڈراؤ یا نہ ڈراؤ دونوں یکساں ہے۔ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر کر دی، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

تناسب:

انسان کی تین قسمیں ہیں:

مومن مخلص: جوزبان سے بھی اسلام کی حقانیت کا اقرار کرتے ہیں، اور دل سے بھی اس کو حق مانتے ہیں۔

خالص کافر: جوزبان سے بھی اپنے کفر کا اقرار کرتے ہیں، اور ان کے دل میں بھی کفر بھرا ہے۔

منافق: جوزبان سے اسلام کے حق ہونے کا اقرار کرتے ہیں، مگر ان کے دل میں کفر بھرا ہوا ہے۔ ابتدائی پانچ آیتیں مومنین مخلصین سے متعلق تھیں۔ یہ دو آیتیں خالص کافروں کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد تیرہ آیتوں میں منافقین کے احوال مذکور ہیں۔

یہ آیتیں ابو جہل وغیرہ ان ضدی ہٹ دھرم سرکشوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی حقانیت کے دلائل قاہرہ وبراہین ساطعہ روز روشن کی طرح ظاہر وباہر دیکھے۔ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ کفر پر اڑے رہے، حق واضح ہونے کے بعد بھی اسے قبول نہیں کیا۔ یہ ان سرکشوں کی نفسانی کیفیت کا بیان ہے۔ گویا یہ فرمایا جارہا ہے۔ سمجھایا بجھایا اسے جاتا ہے جو سمجھا بوجھا نہ ہو۔ سب کچھ سمجھنے کے بعد اپنی ضد پر اڑے رہنے والے کا علاج یہی ہے کہ اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا گیا:

فَذَرْهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ○

اب انہیں چھوڑ دو اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جب کسی شخص کا کوئی لڑکا نالائق نکل جاتا ہے، تو شفیق باپ پہلے اسے سمجھاتا ہے، جب سمجھانے سے نہیں مانتا تو اسے انعام واکرام کی امید دلاتا ہے، روشن مستقبل کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس پر بھی نہیں مانتا تو اسے ڈارتا ہے، دھمکاتا ہے، کچھ سزا بھی دیتا ہے۔ اب بھی اگر وہ راہِ راست پر نہیں آتا تو یہی کہتا ہے: جانے دو کمبخت کو اب اسے سمجھانا بجھانا، ڈرانا دھمکانا بے کار ہے۔ یہی صورت یہاں پر ہے۔ پہلے ان سرکشوں کو نرمی سے سمجھایا بجھایا گیا، اس پر راہِ راست پر نہیں آئے۔ تو دنیا وآخرت کی کامیابی کی امید دلائی گئی، اس پر بھی حق قبول نہیں کیا تو انہیں ڈرایا دھمکایا گیا۔ کئی موقع پر بطور عبرت دنیا میں سزائیں بھی ملیں، پھر بھی انہوں نے حق قبول نہیں کیا، تو اب فرمایا جاتا ہے کہ انہیں ان کی

حالت پر چھوڑ دو۔ یہ لوگ ایمان قبول کرنے والے نہیں۔

اس میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سعی بلیغ کے باوجود ان سرکشوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو انتہائی صدمہ اور افسوس رہتا تھا۔ یہاں تک کہ فرمایا گیا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ○ (الکہف)

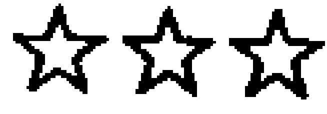
تو تم مارے افسوس کے اپنی جان پر کھیل جاؤ گے۔ اگر یہ اس بات پر ایمان نہ لائیں۔

گویا اللہ عزوجل یہ فرمارہا ہے کہ تمہارا کام پیغام حق پہنچانا ہے، لوگوں کو حق کی دعوت دینا ہے، لوگ قبول کرلیں تو بہت اچھی بات ہے، کچھ لوگ نہ مانیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو ان کے پیچھے اپنی جان ہلکا نہ کرو۔

دلوں اور کانوں پر مہر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے مسلسل سرکشی اور عناد کیا، حق کو دبانے بلکہ مٹانے کی کوشش کی۔ داعی حق پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شہید کردینے تک کی کوششیں کی۔ دعوت حق کے سبب اتنا ستایا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہجرت کرنی پڑی۔ ان سب جرائم کی سزا یہ ہے کہ ان کے لیے اب معافی کا دروازہ بند ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بادشاہ کے باغی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو بادشاہ کے جاہ وجلال وقوت سے واقف نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو کسی کے بہکانے ورغلانے سے بغاوت کر بیٹھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میں بادشاہ سے عداوت ودشمنی ہوتی ہے۔ اس بنا پر بغاوت کرتے ہیں۔

دو پہلے قسم والے باغی سمجھانے بجھانے، غلط فہمی دور کرنے سے اطاعت شعار ہوجاتے ہیں۔ بادشاہ انہیں معافی بھی دیتا ہے، اور اپنے مخلصین کے زمرے میں شامل بھی کرلیتا ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی ایسا بے وقوف بادشاہ نہ ہوگا کہ تیسرے قسم کے باغیوں کو معاف کردے۔ یا انہیں اپنے مخلصین کے زمرے میں شامل کرے۔ اگر بالفرض تیسرے قسم کے

باغیوں کے بارے میں کوئی سفارش بھی کرے گا تو بادشاہ کو اگر اپنی سلطنت اور جان عزیز ہے، تو ہرگز ہرگز اس سفارش کو قبول نہیں کرے گا۔ تیسری قسم کے باغیوں کو بادشاہ کی اطاعت کے لیے سمجھانا بجھانا بے سود ہے۔ ایسے موقع پر یہی کہا جاتا ہے یہ عقل کے اوندھے ہو گئے ہیں، اندھے بہرے ہو گئے ہیں، انہیں سمجھانا بجھانا بے کار ہے۔ ابوجہل وغیرہ متمردین اسی تیسری قسم کے باغیوں میں سے تھے، جو اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت میں اتنے اندھے، بہرے اور پاگل ہو چکے تھے کہ گویا ان کی آنکھیں حق دیکھ نہیں رہی تھیں۔ ان کے کان حق سن نہیں رہے تھے۔ ان کے دل حق سمجھ نہیں رہے تھے۔ حق دیکھنے اور سننے اور سمجھنے سے انہیں جو عناد تھا اسی کو مہر اور پردے سے تعبیر کیا گیا۔ گویا یہ فرمایا گیا کہ مخلصین کے زمرے میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ انہیں اپنے عناد اور حق سے بغاوت کی سزا ضرور ملے گی۔



ارض مقدس اور یہودی تغلُّب

ارض فلسطین کی عظمت و برتری کے لئے یہی کافی ہے کہ اسے قرآن کریم نے ارض مقدس کہا اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ جیسے اولوالعزم رسول کی امت کو حکم دیا گیا:

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ (پ ٦ ۔مائدہ: ع٨۔آیت ٢١)

اور جب اس بزدل قوم نے وہاں کے متغلبین، جبارین کی ظاہری قوت کی داستان سن کر وہاں جانے سے انکار کر دیا اور یوں کہا:

اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا اَبَدًا مَّادَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔(پ ٦ ۔مائدہ: ع٨۔آیت ٢٤)

ترجمہ: جب تک یہ اس میں ہیں ہم کبھی نہیں جائیں گے۔آپ اور آپ کے پروردگار جائیں، لڑیں اور ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

تو چالیس سال تک صحرا نوردی کے عذاب میں مبتلا رہی۔

اس ارض مقدس کے بارے میں فرمایا گیا:

بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ۔(پ ١٥ ۔بنی اسرائیل: سورہ نمبر ١٣۔آیت ١)

ترجمہ: اس سرزمین کا ادب رب العالمین کو اتنا ملحوظ ہے کہ وہاں داخل ہونے والے ایک گروہ کو داخلہ کے وقت اس ادب کا مامور کیا گیا۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ (پ ١ ۔ بقرہ: ع ٦ آیت ٥٨)

ترجمہ: اور دروازے میں داخل ہوتے وقت سر جھکائے رکھنا اور کہو ہمیں معاف کر دیا جائے۔لیکن جب اس متمرد قوم نے اس ادب کو ملحوظ نہ رکھا تو طاعون جیسی موذی وبا میں گرفتار ہوئی۔

ہمارا قبلۂ اول اور امم ماضیہ کا قبلۂ مستقل بیت المقدس ہے۔جہاں ہمارے نبی نے

صرف ہمارے نبی بلکہ نبیوں کے نبی، نبی الانبیاء سید عالم ﷺ نے تمام انبیائے کرام کی امامت فرمائی۔ وہ بیت المقدس متبرک معبد جس کی بنیاد حضرت داؤد خلیفۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رکھی اور جسے حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکمل فرمایا۔ اگر صفا و مروہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قدموں سے مس ہو جانے کے وجہ سے شعائر اللہ میں داخل ہو گئے، تو وہ بابرکت سرزمین جسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر نبی آخر الزمان ﷺ تک ہر نبی نے شرف بخشا ہو، جو سب کا معبد ہو، قبلہ ہو اکثر کا مسکن ہو، عظمت و تقدس کی کس منزل پر ہوگی، اس کا اندازہ آسان نہیں۔

لیکن یہ ارض مقدس اپنی عظمت اپنے تقدس میں جتنی رفیع الشان ہے، دین داروں کے لئے امتحان و ابتلا کی اتنی ہی بڑی کسوٹی بھی ہے۔ ابھی سن چکے! قوم موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب بامر الٰہی اس سرزمین کا رخ کیا تو جبارین و ظالمین کا سامنا ہوا۔

اسی ارض مقدس کو طالوت اور بخت نصر نے اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ باشندگان ارض پاک کے قتل کے ساتھ ساتھ معبد مقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر صلیبی لٹیروں نے اس ارض مقدس میں وہ ظلم ڈھائے کہ طالوت اور بخت نصر کے مظالم بے حقیقت ہو کر رہ گئے۔

اللہ اللہ! ایک وہ بھی وقت تھا، اسی ارض مقدس پر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قبضہ کیا تھا۔ لیکن ایک قطرہ خون زمین پر نہ بہا۔ لیکن انہیں امن پسندوں کی اولاد کی لاشیں ان کے خون میں امن و سلامتی کے ٹھیکیداروں، صلیبی درندوں نے تیرائیں بالآخر ۹۰ رسال بعد شیر دل غازی سلطان صلاح الدین ایوبی نے ان صلیبی سورماؤں کو سمندر پار ڈھکیل کر ارض مقدس کو پاک کر دیا۔

پھر ارض مقدس کی پاسبانی عثمانی ترکوں کو سونپی گئی، اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان بہادروں نے صدیوں تک پورے یورپ کے مقابل سینہ سپر ہو کر پاسبانی کا حق ادا کر دیا۔ صلیبی معرکوں میں انجام کار ذلت و رسوائی اٹھانے والے یورپین نے اگر چہ ہر عہد میں ارض پاک پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھے ہوں گے۔ مگر عثمانی ترکوں سے ارض مقدس چھیننے کی جرأت کبھی نہ کر سکے۔

خلافت اسلامیہ مٹ چکی تھی مگر عثمانی سلاطین نے کچھ نہ کچھ اس کی آن بان باقی رکھی ۔مصر ،شام،عراق ،حجاز، فلسطین، لبنان، سمرقند، بخارہ، کاشغر، پورا چینی ترکستان عثمانیوں کے ہلالی پرچم کے نیچے جمع تھا۔اسی اتحاد و وفاق کے نتیجے میں سلطنت ترک اتنی قوی تھی کہ صدیوں تک زارروس پوری قوت سے ٹکراتا رہا لیکن اسے ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

یورپ کے مکار، روباہ صفت سیاست دانوں نے ترکوں سے بار بار ٹکرانے کے بعد یہ اچھی طرح آزمالیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کا شیرازہ منتشر نہ کیا جائے گا، عثمانی شیروں کو زیر نہیں کیا جاسکتا۔اس کے لئے انہوں نے اپنے ففتھ کالم کے ذریعہ ترکوں کے صوبوں میں قومی عصبیت کا شیطان پیدا کرنا شروع کیا۔مصریوں کو پڑھایا کہ تم شاندار ماضی کے مالک ہو ،تمہاری ایک آبرومندانہ تاریخ ہے،تم کیوں ترکوں کے غلام بنے ہوئے ہو؟ شامیوں کو بھڑکایا تم جغرافیائی حیثیت سے،نسلی حیثیت سے،لسانی حیثیت سے،ترکوں سے الگ تھلگ ہو،ان سے برتر ہو،پھر کیا وجہ ہے کہ ترک تم کو غلام بنائے ہوئے ہیں؟ عراقیوں کو ورغلایا تم دولت عباسیہ کے کروفر کے وارث ہو،تم تمام دنیائے اسلام کے مرکز رہ چکے ہو۔آج کیوں اتنے نامرد بن گئے ہو کہ یہ ترک تم پر مسلط ہیں،حجازیوں کو اکسایا تم ان مجاہدین کی اولاد ہو جنہوں نے سب سے پہلے کلمہ اسلام کو اپنایا اور سارے جہاں میں پھیلایا۔تمہارا کوئی حریف نہیں۔آخر اب اتنے کیوں گر گئے ہو کہ سمندر پار کے ترک تم پر حکومت کر رہے ہیں۔پھر اب کیا تھا مصر،عراق،شام حجاز سب نے بیک وقت انقلاب زندہ باد کے ساتھ ساتھ اعلان آزادی کردیا۔اس طرح آنا فانا وہ قوت مجتمع جس نے پانچ سو سال تک یورپ کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال رکھا تھا، پاش پاش ہو کے رہ گئی۔ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا ہے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پھر کیا تھا، بڑی آسانی کے ساتھ برطانیہ نے ارض مقدس پر قبضہ کر کے یورپ کے کروڑوں صلیبی دیوانوں کا کلیجہ ٹھنڈا کردیا۔ساری دنیائے اسلام تڑپ کر رہ گئی۔فلسطین کا غم مسلمانوں کے سینہ میں ناسور بن کے رہ گیا۔روئے ،گڑگڑائے، جلسے کئے،جلوس نکالے

، بیانا دیئے، فریادیں کیں مگر سب کچھ بے سود، اسی وقت کے لئے فرمایا گیا ہے:

دعاؤھم لا یستجاب ایسے لوگوں کی دعائیں قبول نہیں کی جاتیں۔ اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر جاں بری کی دعا کرنا قدرت کے ساتھ ٹھٹھا ہے۔

اب بھی وقت ہے کہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کیا جاتا۔ لیکن وطنیت کا بھوت اور سرکش ہوتا گیا۔ الگ ہوگئے تھے، لیکن مل کے رہتے اور کم از کم ارض مقدس کی بازیابی کے معاملے میں متحد رہتے تو شاید ساری دنیائے اسلام کو یہ ذلت آفریں دور نہ دیکھنا پڑتا۔ نجدیوں کی تلواریں بے نیام ہوئیں، تو ارض مقدس کی بازیابی کے لئے نہیں بلکہ حرمین طیبین کے بے گناہوں کے خون پینے کے لئے اور جنت المعلیٰ وجنت البقیع میں آرام فرمانے والے اسلاف کے مزارات کھودنے کے لئے۔ بجو صفت گور کنوں سے اور توقع ہی کیا ہوسکتی ہے۔

عربوں کے آپس میں اختلافات وانتشار تشتت وتفرق نے دنیائے اسلام کو وہ روز بد دکھایا کہ ۱۹۴۹ء میں امریکہ و برطانیہ نے اپنی اسلام و مسلمان دشمنی کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرتے ہوئے بین الاقوامی آئین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے، ارض مقدس کی تقسیم کرکے اپنی کوکھ سے اپنی سیاسی ناجائز اولاد یہودی مملکت ''اسرائیل'' کو جنم دیا۔ یہودی مملکت کا وجود ساری دنیا کے مسلمانوں کی حمیت ملی، غیرت دینی کو کھلا ہوا چیلنج تھا، لیکن سوائے کچھ شور شغب اور دو ایک بار ہاتھا پائی کے اور کچھ نہ ہوسکا۔

اگرچہ برطانیہ نے اپنے قبضہ کے روز فرداہی سے ساری دنیا میں بکھرے ہوئے یہودیوں کو گھسیٹ کر فلسطین میں آباد کرنا شروع کردیا تھا، اور حکومت کے تمام اعلیٰ عہدے اور تجارتی وزراعتی بالا دستیاں یہودیوں کو دیں مگر برطانیہ کی انتھک کوششوں کے باوجود فلسطین میں یہودی آبادی ۳۳ رفیصدی سے زائد نہ ہوسکی۔ آئین اور انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ پورا ملک ۶۶ فیصد سے زائد آبادی اور وہاں کے ہزار ہا سال سکان عرب کے حوالے کرتے لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی کے زخموں سے نسلا بعد نسل تڑپتا ہوا یورپ اپنے آباؤ اجداد کی ذلت ورسوائیوں کا انتقام لینے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع شاید نہ پاتا۔ جوش انتقام میں اندھے ہونے والے یورپ نے اپنے خود ساختہ آئین کی دھجیاں بکھیر دیں اور ارض

فلسطین کی تقسیم کر کے ارض مقدس کے صحیح مالکوں سے چھین کر ۶۶ رفیصد کو ۳۳ رفیصد کمینے درندوں کا غلام بنا دیا۔

عربوں کی بے کسی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ہمارا حق ہمیں نہیں مل سکے گا تو یہ اسکیم پیش کی کہ اس خطہ میں سیکولر مخلوط حکومت قائم کر دی جائے اور دونوں فرقوں کو اپنی اپنی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔ لیکن کینہ پرور برطانیہ نے یہ بھی نہیں سنا اور اپنی ضد اور ہٹ پوری کر کے رہا۔ ہزاروں سال کے باشندوں پر نو آباد یہودی کتوں کو حاکم بنا کے چھوڑا۔ دنیائے اسلام خصوصا عرب کے لئے یہ معمولی حادثہ نہیں تھا۔ کون اسلامی دل ہے جو نہ تڑپا ہو۔ کون اسلامی روح ہے جو بے چین نہ ہوئی ہو؟ کون زبان ہے جو چیخی نہ ہو؟ لیکن قصر بکھنگم کے ارکان بے حیائی اور درندگی کی اس منزل پہ تھے جہاں ''ہر چہ خواہی کن'' فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔

روس سے متاثر علاقہ نے یہودی ریاست کو امریکہ کی مغربی ایشیاء میں اجارہ داری کا اڈہ کہا اور آج بھی کہتے ہیں لیکن میں اسے یورپ کے صلیبی درندوں کی ذلت آمیز شکست کا انتقام کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ امریکہ و برطانیہ کو اجارہ دارانہ غلامی کے لئے مغربی ایشیا میں کمی نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ بہت سے جاہ پرست اقتدار کے بھوکے اپنی دینی غیرت و حمیت امریکہ و برطانیہ کو رہن دے سکتے تھے۔ اور اب بھی دے رہے ہیں۔ تو اس کے لئے دنیا کے انصاف پسند حلقہ میں بدنام ہونے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لعنت کا تمغہ حاصل کرنے کے لئے یہودی مملکت جن کر اپنی سیاسی بدکرداری کا اعلان کرنے کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اگر اردن یا نجدی مملکت کو اجارہ داری کا اڈہ بناتے تو شاہ رچرڈ کی فرار کی کالک برطانیہ کی پیشانی سے مٹ تو جاتی، مگر اس کے قلب وجگر کے اس ناسور کا علاج کیا ہوتا جو فلسطین پر صلیبی پرچم نہ لہرانے پر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا مداوا تو ان کینہ پرور انتقام جو، سفاکوں کے نزدیک یہی تھا کہ ارض مقدس ان فاتحین کے قبضہ میں نہ رہے جنہوں نے ان کے ہم مذہبوں سے چھینا تھا۔

عرب کے لئے اب بھی وقت تھا کہ ملت کی آبرو بچانے کے لئے اپنے اقتدار کی

ہوس سے دست کش ہو کر پوری ملت کی پیشانی پر لگے ہوئے کلنک کے ٹیکہ کو دور کرنے کی کوشش کرتے لیکن افسوس صد افسوس! ایسا نہ ہو سکا۔

نہ اردن و عراق کی کشمکش ختم ہو سکی۔ نہ نجد اور مصر میں اتفاق ہو سکا۔ نہ امام نواز اور حریت پسند یمنیوں میں صلح ہو سکی۔ ایک دوسرے کے خلاف اعصابی بلکہ سلاحی جنگ تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود اندرونی طور پر وہ افتراق و شقاق کہ الامان والحفیظ!۔

یہی کرنل ناصر جو آج رو رہے ہیں۔ کل اخوان المسلمین کے خلاف کیا کیا نہیں کر چکے ہیں۔ شاہ فاروق کے حامیوں پر وہ کون ظلم نہیں کیے، جو فراعنہ پہلے نہیں کر چکے ہیں۔ عراق میں اندرونی خون خرابہ نہیں ہوا کہ شام میں نہیں ہوا۔ ذرا ذرا سی مملکتیں اور نہ پڑوسیوں سے صلح اور نہ آپس میں اتحاد، اپنی صلاحیتیں، قوتیں اپنے بھائیوں کے خلاف استعمال ہو رہی ہیں۔ ان سب پر طرہ یہ ہے کہ عیاشی، تن آسانی، میں وہ انہماک کہ پیرس و لندن کو پیچھے چھوڑنے کی جد و جہد، ہر سال عروس نو سے ہمکناری، ہر سال نیو ماڈل کار، چاہے رہنے کو گھر نہ ہو، دنیا کے بیش قیمت سے بیش قیمت کپڑے بدن پر، یورپ کے اسپیشل کوالٹی کے صوفے، عربوں کے خیموں میں، جب شاہ سعود کے حرم میں اکٹھے سو کنیزیں محل سرا کے در و دیوار کو چھوڑئے، فرش اور زینے غلافوں سے آراستہ اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے وارثین عیش و عشرت کے رنگینیوں میں:

تفو بر تو اے چرخ گرددں تفو

دوسری طرف یہودی شب و روز محنت و جاں بازی اور اسلحہ کی فراہمی و مشق جنگ میں مصروف ہیں۔ کسی یہودی سربراہ مملکت کے محل میں ایک سے زائد بیویاں نہ ہوگی۔ کوئی خیمہ میں شب و روز گزرنے والے یہودی کے گھر کار نہ ہوگی۔ عرب سامان عیش و عشرت، لہو ولعب جمع کرتے رہے اور یہودی اسلحے، عرب موسم بہار میں عروس نو کے ساتھ پیرس و نیویارک میں ہنی مون مناتے رہے، اور یہودی تیر و تفنگ کی مشق کرتے رہے۔ عرب اپنے بھائیوں کے زیر کرنے، شکست دینے کے جوڑ توڑ میں، اور یہودی عرب کو صفحہ دنیا سے مٹانے

کی تیاری میں۔اس کا نتیجہ جو نکلنا چاہیے تھا وہ نکلا۔اب رونے سے کیا حاصل !مسبب الاسباب جل مجدہ نے ہمیں پہلے بتادیا تھا:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ .(پ ۱۰.الانفال: ع ۲ .آیت ۴۶)

ترجمہ: آپس میں اختلاف نہ کرو،ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

ان کریم مولیٰ نے ہمیں واضح طور پر بتادیا تھا:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ آمَنُوْا الْیَهُوْدَ.(پ ۲ .مائدة :آیت ۴۷)

ترجمہ: تم مومنوں کا سب سے بدتر دشمن یہود کو پاؤ گے۔

کاش کہ ماضی قریب کی ذلت ورسوائی ہی عربوں کے لئے تازیانہ عبرت ہوتی۔دنیا کی ذلیل ترین مٹھی بھر قوم سے اتنی سنگین شکست کھانے کے بعد بھی آنکھیں کھل جاتیں تو افسوس کم ہوتا مگر اب بھی نہ تو قومیت کا بھوت اترا،اور نہ آپس کی کینہ پروری وحصول جاہ ومال کی لڑائی ختم ہوئی۔اب بھی وہی پھوٹ اپنے بھائی کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے مشورے۔

نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

☆☆☆

یہود کے بارے میں

ایک آیت کی تشریح

یہودیوں کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۝

(بقرہ: آیت ۶۱، پ ۱، رکوع ۷)

ترجمہ: اور ان پر ذلت اور گداگری چھاپ دی گئی ہے، اور وہ من جانب اللہ نشانۂ غضب ہیں۔

جو لوگ یہودیوں کی ۱۹۴۹ء سے قبل کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے ان پر فرمان خداوندی کی یہ صداقت مہر نیم روز کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ خدا کی خدائی میں یہودیوں سے بدتر ذلیل و کمینہ و رسوائے زمانہ کوئی قوم نہ ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ فرعون نے صدیوں تک ان کو غلام بنائے رکھا۔ طالوت نے ان کا بھرکس نکالا۔ بخت نصر نے انہیں خاک میں ملایا۔ بازرین نے ان کی عزت و ناموس کی دھجیاں بکھیر دیں اور عیسائیوں کے اقتدار نے ان کو ایسا ملیا میٹ کیا کہ ڈیڑھ ہزار سال سے در بدر کی ٹھوکروں کے سوا کہیں اطمینان سے سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکی۔ ملک بملک مارے مارے پھرتے۔ جہاں جاتے، دُردُرائے جاتے، نہ کہیں سکون نہ چین، عزت و ناموس و وقار و عظمت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ صورت ایسی نکبت آگیں کہ لکھ پتی بھی صورتاً بھیک منگا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے شودروں کی صورتیں بھی یہودیوں کے مقابلے میں کچھ آب رکھتی ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرمان خداوندی کسی معینہ مدت تک کے لیے نہیں۔ خدا کی مسلط کی ہوئی ذلت و مسکنت ایسی نہیں کہ اسے کوئی دور کر سکے۔ پھر جب کہ بعض آیات میں "الٰی یوم القیامۃ" کی حد ہے تو قیامت

سے پہلے یہ رسوائی وذلت ختم ہونا فرمان خداوندی کی تکذیب ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ۱۹۴۹ء میں ساری دنیائے اسلام کے علی الرغم یہودی مملکت کا قیام ہوگیا۔ کیا قیام مملکت ذلت ومسکنت کا اختتام نہیں؟ اچھا! اگر قیام مملکت رسوائی ونکبت کا اختتام نہیں تو اپنے حریف عربوں کی متحدہ طاقت کو ہر تصادم میں شکست دینا ان کے علاقہ پر قبضہ کر لینا، مفتوح عربوں کو ان کے گھروں سے نکال کر بھیڑ بکری کے گلے کی طرح ہانک کر ملک سے باہر کر دینا تو ضرور ذلت ومسکنت کا اختتام ہے۔ ایسی صورت میں مذکورہ بالا ارشاد قرآن کی توجیہ کیا ہوگی؟ خصوصاً اس صورت میں کہ کثیر علما نے اس آیت کے تحت یہ لکھا ہے کہ یہود کی ذلت ومسکنت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج روئے زمین پر یہود کی کوئی سلطنت نہیں۔ ان علما کے پیرو اب کیا کہیں گے؟

یہ سوال ۱۹۴۹ء کے بعد بار بار اٹھا ہے۔ علما نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ عرصہ ہوا میں نے اس کا ایک جواب لکھا تھا جو رسالہ پاسبان میں چھپ بھی چکا ہے۔ اسی جواب کو آج ضروری تشریح کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔

اگر چہ آیت مذکورہ میں ذلت ومسکنت کی ضرب یہود پر مطلق بیان کی گئی ہے، لیکن دوسری آیت میں یہ مقید ہے:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ۝

(آل عمران: پ ۴ رکوع ۳ آیت ۱۱۲)

ترجمہ: ان یہودیوں پر ذلت چھاپ دی گئی ہے جہاں بھی رہیں۔ مگر یہ کہ اللہ کی رسی پکڑ لیں یا اور لوگوں کی رسی پکڑ لیں۔

چوں کہ قرآن کریم کا اصول ہے:

"القرآن يفسر بعضه بعضا" قرآن مجید کی بعض آیت بعض کی تفسیر ہیں۔

لہٰذا جو آیتیں اس مضمون کی عام ہیں وہ اسی آیت سے خاص ہوں گی۔ اب صاف مطلب یہ ہوا کہ یہود لاکھ سر پٹکیں، لاکھ کوشش کریں، ہاتھ پیر ماریں، از خود اپنے بل بوتے پر قہر خداوندی کی چھاپ ہرگز نہیں مٹا سکتے۔ ہاں! اگر توفیق ایزدی دستگیری فرمائے، اور مومن بن کر اللہ کی رسی پکڑ لیں تو یہ ذلت ورسوائی کا داغ مٹ سکتا ہے۔ اگر شقاوت ازلی انہیں یہ

سعادت حاصل نہ کرنے دے تو دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا میں کسی کے دست نگر ہو کر ان کی غلامی کا طوق گلے میں ڈال لیں تو یہ داغ دور ہو سکتا ہے۔

یہود کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ اس فرمان ایزدی کے حرف حرف نقطہ نقطہ کی صداقت پر برہان قاطع ہے۔

عیسائیوں نے قوت حاصل کرتے ہی اس منحوس قوم کا اس طرح قلع قمع کیا کہ انہوں نے اپنی دانست میں اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ ارض مقدس ان کے ناپاک وجود سے یکسر خالی ہوگئی۔ یہ اپنی جان لے کر ادھر اُدھر بھاگے۔

اسلام آیا، تو اس نے ابتداءً اپنی امن پسندی کی بنا پر ان کے ساتھ شریفانہ معاہدہ کر کے ان کو تمام شہری حقوق دیئے۔ لیکن یہ اپنی فطری شر پسندی، احسان فراموشی، غداری، منافقانہ رویے کی بنا پر اسلام کو پنپنے سے پہلے ہی ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ کون سی دسیسہ کاری تھی جو انہوں نے نہیں کی! کون سی سازش تھی جسے انہوں نے نہ کیا ہو! مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا، حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہجو کرنا، آپ کے خلاف پروپیگنڈا، منافقین کی پشت پناہی کرنا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی جدوجہد، معاندین اسلام کی مالی امداد، ان کے لیے سراغ رسانی، معاہدہ کی خلاف ورزی، سخت ترین نازک موقع پر محاربین سے مل کر مسلمانوں کا قلع قمع، مدینے پر حملہ کی تیاریاں، لیکن خدائی حفاظت وصیانت اور امداد واعانت کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ غداری، احسان فراموشی، نمک حرامی کے نتیجے میں یہ پہلے مدینہ طیبہ سے پھر پورے جزیرۂ عرب سے نکالے گئے۔ دوسری طرف اسلام کی حقانیت وصداقت نے ان کے باطل مذہب کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ جن کو توفیق ملی وہ اللہ کی رسی پکڑ کر ذلت ونکبت سے نجات پا گئے۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور کعب احبار کے نام سے کون واقف نہیں۔ دامن اسلام میں آ کر یہ حضرات عزت وعظمت کی کس بلندی پر پہنچے، وہ ہزاروں کے لیے باعث رشک ہے۔

یہ جلوہ الا بحبل من اللہ کا ہے۔ اگر یہ اللہ کی رسی پکڑ لیں تو قہر خداوندی کی زد سے نکل سکتے ہیں۔ لیکن جو بد نصیب یہ سعادت نہ حاصل کر سکے وہ ساڑھے تیرہ سو سال در بدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ اسلام میں سینکڑوں انقلابات آئے، خلافت اسلامیہ ختم ہوئی۔ مملکت قائم ہوئی، بنی امیہ فنا ہوئے، ان کی جگہ بنی عباس نے لی، بنی عباس کا کوکب اقبال غروب ہوا، بنی فاطمہ بساط سیاست پر چمکے، مرکزی قوتیں ختم ہوئیں۔ طوائف الملوکی پھیلی۔ حتیٰ کہ یورپ کے صلیبی ڈاکوؤں نے ارض مقدس پر قبضہ کر لیا۔ مگر اس غضب کی ماری قوم کو کبھی حوصلہ نہ ہوا کہ ارض مقدس تو کیا کسی دور دراز ویرانے میں ہی ایوانِ سلطنت کے نام سے ایک بھٹ ہی بنا لیتی۔ غضب خداوندی کی بجلیوں نے ان کا نشیمن ایسا پھونکا کہ کہیں یک تنکے کا بھی پتا نہیں تھا۔

پھر اس کے بعد صلیبی دیوانوں اور مجاہدین اسلام میں آٹھ سو سال تک زور آزمائی ہوتی رہی۔ ایک تیسرے حریف کو اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں مل سکتا کہ اس کے دو دشمنوں میں جنگ وجدال برپا ہو۔ ایک چالاک حریف دشمنوں کی چند روزہ لڑائی سے بہت بڑا فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔ مگر وہی جو حساس ہو، غیرت مند ہو، باحمیت ہو، لیکن جس کا خمیر ہی خلاق دو عالم نے ذلت ونکبت سے بنایا ہو، اسے کیا احساس! اور بالفرض احساس بھی ہو تو دنیا کے گوشے گوشے میں پراگندہ قوم کر ہی کیا سکتی ہے۔

بالآخر عربوں کی قومی انفراد پسندی اور اس کے تحت ابھرنے والے نعرۂ آزادی نے وہ روزِ بد دکھایا کہ برطانیہ ارض مقدس پر قابض ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ دنیا کی ہر قوم استعماری قوتوں سے متنفر ہو چکی تھی۔ اور بڑی سے بڑی طاقت سے لڑ کر آزاد ہونا جان چکی تھی برطانیہ خوب جانتا تھا کہ ارضِ فلسطین پر ہم بہت دنوں اپنے اقتدار کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ اور جلد ہی وہ دن آنے والا ہے کہ یہ ارض مقدس چھوڑ کر جانا ہے۔ کینہ پرور، مسلم دشمن، انگریز نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ارض مقدس کے جن وارثین نے عیسائیوں سے چھین کر ساڑھے تیرہ سو سال تک اس پر انہیں قابض نہیں ہونے دیا، جن مردانِ خدا نے ان کے آباؤ اجداد کو وہ شرمناک شکستیں دی ہیں، جن کو سن کر وہ آج بھی عرق عرق ہیں۔ انہیں یہ امانت سپرد کی جائے۔ لہٰذا اس نے دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو بلا کر فلسطین میں آباد کرنا شروع کر دیا۔ انہیں

سکھایا پڑھایا، ورغلایا، ان کے سینوں میں مسلم دشمنی کا دبا ہوا جذبہ ابھارا، اور اقوام متحدہ کی وساطت سے امریکہ، فرانس، روس تینوں کی ہمنوائی سے دنیا کی رائے عامہ کے برخلاف آئین وانصاف کو ذبح کر کے یہودی ریاست کو جنم دیا۔ یہودیوں میں اب بھی یہ قوت نہ تھی کہ وہ اس کی ہمت کر سکتے کہ اپنی مملکت قائم کریں، یا دنیا کی کوئی انصاف پسند کچہری انہیں دنیا کے کسی خطے میں ایک انچ زمین پر حکومت قائم کرنے کی اجازت دیتی۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ نے اسلام وعرب دشمنی میں انہیں اپنے ایٹمی ہتھیاروں کے سہارے جنم دیا۔

یہ جلوہ ہے "وحبل من الناس" کا کہ کہیں ذلت سے چھٹکارا انہیں حاصل کر سکتے مگر یہ کسی کی گود میں جا بیٹھیں۔ یہودی مملکت کا نظم ونسق اگرچہ ان کے ہاتھ میں ہے، مگر اس کے قیام وبقا وحفاظت کی ساری ذمہ داری امریکہ وبرطانیہ کے سر ہے۔

اور ۱۹۵۶ء میں جو ہوا یا ابھی جون کے پہلے ہفتہ میں جو کچھ ہوا یہ یہودیوں کا کیا نہیں بلکہ در پردہ امریکہ کا کارستانی ہے۔ اخبارات پڑھنے والے جانتے ہیں کہ امریکہ کا چھٹا بیڑا بحر روم میں موجود تھا، جس نے مصر کے راڈار سسٹم کو جام کر لیا۔ امریکن جاسوسی طیارہ نے مصری فضائیہ کے خفیہ پیغامات یہودیوں تک پہنچائے، بمباری کرنے والے طیاروں کے پائلٹ بجائے عبرانی کے انگریزی میں بات کرتے سنے گئے۔ یہ یہودیوں اور مصر وعرب کا مقابلہ نہ تھا، یہ عرب اور امریکن تصادم تھا۔

اسے بھی جانے دیجئے۔ یہودیوں کو اتنے کثیر اسلحے، طیارے، ناپام بم کہاں سے ملے اس کا ایک ہی جواب ہے، امریکہ، پھر عربوں پر یہ عبوری فتح یہودیوں کی نہیں، امریکہ کی ہے۔ آج بھی ان تمام سامان جنگ سے آراستہ ہونے کے باوجود اگر امریکہ وغیرہ یہودیوں کی پشت پناہی سے ہٹ جائیں اور عرب کے مقابلہ پر صرف یہود رہ جائیں تو دنیا دیکھے گی کہ چند روز میں یہودی مملکت کا وجود باقی نہ رہے گا۔

ایسی صورت میں جب کہ قرآن کریم نے "الا بحبل من اللہ، و، وحبل من الناس" کا استثنا فرمایا ہے، اور واقعات نے بتا دیا کہ یہودی مملکت کا قیام وبقا ترقی وفتوحات امریکہ کی رہین منت ہیں، تو یہود کی یہ مملکت اور اس کی فتوحات ارشاد قرآنی کے ہرگز منافی

نہیں بلکہ اگر بہ نظر دقیق دیکھا جائے تو ارشاد قرآنی میں "حبل من الناس" کا استثنا بتا رہا ہے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کی خبر قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے ہی دے دی تھی۔ قرآن کریم کا استثنا محض اتفاق نہیں یا محض اظہار اندیشہ کے طور پر نہیں، بلکہ آئندہ جو کچھ ہونے والا تھا اس کی آگاہی ہے کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ دنیا کی یہ ذلیل ترین قوم کسی کی گود میں بیٹھ کر اپنی خواری وذلت مٹانے کی کوشش کرے گی۔ اور اس میں ایک گونہ کامیاب ہوگی، اور آج یہی ہوا۔

یہ تو اس تقدیر پر کلام تھا کہ یہودیوں کی اس مملکت اور تغلب کو عزت مان لیا جائے اور اگر حقیقت امر پر نظر کی جائے تو آج بھی ذلت ومسکنت کی خدائی چھاپ ان کی پیشانیوں سے دور نہیں ہوئی۔ صاحب تخت وتاج ہونے ہی سے عزت نہیں ملتی۔ عزت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں وقار، لوگ ذکر خیر کریں، مدح وثنا کریں، ان کا کوئی وزن دنیا کی نظروں میں ہو، وہ کسی کے دست نگر دریوزہ گر نہ رہیں۔ اس معنی کر یہودی جتنے ذلیل آج ہیں، شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ دنیا کی اکثریت انہیں چور، غاصب، جارح، ظالم، شقی، بے رحم، دغاباز، کمینہ کہہ رہی ہے، جس طرح نہتے شہریوں کی دولت لوٹنے والا انہیں قتل کرنے والا، ان کے گھروں کو پھونکنے والا ڈاکو کسی کی نظر میں عزیز نہیں ہوتا، اسی طرح آج کے یہودی بھی کسی اعتبار سے ذی عزت نہیں کہے جاسکتے۔ محتاجی ومسکنت کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں امریکی بھیک کے محتاج ہیں۔ آج اگر امریکہ اپنی بھیک روک لے تو ان یہودی گداگروں کو دنیا میں کوئی بھیک دینے والا نہ ملے گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے کہ یہود کی یہ ذلت ومسکنت خود ان کی اپنی قوتوں سے ختم نہ ہوگی۔ ہاں! اگر یہ اللہ کی رسی پکڑیں، تو دور ہوسکتی ہے، اور اگر یہ سعادت ان کی قسمت میں نہیں تو اگر کسی غیر کی پناہ میں آجائیں تو ان کے حصار میں دربدر کی ٹھوکروں سے بچ سکتے ہیں۔ یہی حال یہود کا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال کے بعد امریکہ کی پشت پناہی میں ان کو یہ قوت حاصل ہوئی ہے کہ عرب پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، لیکن رسوائی محتاجی، دریوزہ گری، بھک منگی، گداگری، اب بھی چمٹی ہوئی ہے۔

خلائی سفر اور قرآن

خلائی کشتیوں کے کارناموں نے دنیا کو ایک بہت اہم موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ ملحدین اسے الحاد کی مذہب پر فتحِ عظیم خیال کرتے ہیں۔ منکرین خدا کی جرأتیں اتنی بڑھ گئیں ہیں کہ وہ بے محابا اسے انکارِ خالق کی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ خلا باز کا یہ نعرہ پوری دنیا میں گونجا: ''میں نے خدا کو بہت تلاش کیا، کہیں نہیں ملا''۔

مجھے سخت حیرت ہے کہ اگر کوئی خلائی کشتی چاند کے قریب پہنچ گئی، یا چاند تک پہنچ جائے، یا بالفرض انسان چاند میں آباد ہو جائے۔ وہاں سے زمین تک رسل ورسائل، آمد ورفت کا باقاعدہ نظام قائم ہو جائے۔ چاند ہی نہیں دیگر تمام سیارے مسخر ہو جائیں۔ سارا نظام شمسی انسان کے زیرنگیں ہو جائے، اور ان خلا بازوں کو کہیں آسمان نہ ملے اور بقول خلا باز خدا نہ ملے، فرشتے نہ ملیں تو اس سے مذہب کیسے مفتوح ہو جائیگا، یہ کم از کم مجھ بوریہ نشین کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور مذاہب مفتوح ہو جائیں تو ہو جائیں، اسلام کبھی مفتوح نہیں ہوسکتا۔

سائنس کی روزمرہ متبدل معلومات منکرین خدا کی پہلی پناہ نہیں بلکہ اس کے پہلے بھی یہ لوگ اس کی آڑ لے کر پرستارانِ خدا عزوجل پر ہلہ بول چکے ہیں لیکن دنیا نے دیکھا کہ اسلام اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ اپنی جگہ قائم رہا۔ الٹے سائنس وفلسفہ کو منہ کی کھانی پڑی۔ آج سے بارہ سو سال پہلے جب بطلیموس کی سائنس یونانی سے ترجمہ ہو کر عربی زبان میں منتقل ہوئی تو اسی قسم کا زلزلہ آیا تھا علمائے متکلمین نے جب بطلیموس کے نظریات کا رد شروع کیا، تو بڑی بڑی پھبتیاں کسی گئیں لیکن دنیا نے دیکھا کہ آج خود پرستارانِ فلسفہ نے بطلیموس کی ساری تحقیق کو افسانہ پارینہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

بطلیموس کہتا تھا	:	آسمان نو ہیں۔
آج کی سائنس کہتی ہے	:	آسمان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

بطلیموس کہتا تھا : آسمان گردش کر رہے ہیں، زمین ساکن ہے۔
آج کی سائنس کہتی ہے : زمین حرکت کر رہی ہے
بطلیموس کہتا تھا : تمام ستارے خواہ ثوابت ہوں یا سیارے آسمانوں میں مرکوز ہیں۔
آج کی سائنس کہتی ہے : سب ستارے فضا میں معلق اپنی اپنی جگہ محور پر چل پھر رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

بطلیموس کے مقلدین نے اسلام کو للکارا تھا مگر دنیا نے دیکھا کہ آج کی نت نئی معلومات نے بطلیموس کے دفتر معلومات کے ایک ایک لفظ کو مٹا کر رکھ دیا لیکن اسلام بحمدہٖ تعالیٰ اپنی جگہ قائم رہا۔ اس کے معتقدات غیر متبدلہ باقی رہے، اس کا ایک لفظ بھی تبدیل نہ ہوا۔ لا مبدل لکلمات الله ٥ (پ ٧ ع ١٠، انعام آیت ٣٤)

اور آج بھی میں پورے یقین کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ جس طرح بطلیموس اور فلسفہ یونان کے توہمات اسلام کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح روس وامریکہ کے مظنونات بھی اسلام کو مٹا کیا سکیں گے اس کے دامن پر ایک چھینٹ بھی نہیں ڈال سکے۔ بلکہ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ جس طرح آج کے نظریات نے فلسفہ بطلیموس کے جیب وگریباں کا ایک تار بھی نہیں چھوڑا۔ اسی طرح ایک دن آئے گا کہ ان مدعیانِ تحقیق کی دھجیاں فضائے بسیط پر اڑتی نظر آئیں گی۔

کون نہیں جانتا کہ آج سے ہزار ہا سال پہلے حکمائے یونان نے زمین کی گردش کا قول کیا تھا لیکن پھر انہیں میں وہ پیدا ہوئے جنہوں نے حرکت زمین کا انکار کیا اور آسمان کی گردش کی تھیوری پیش کی اور اس پر اتنا زور دیا کہ ساری دنیا کو یقین کرنا پڑا کہ یہی واقعہ ہے، حتی کہ شرق سے لے کر غرب تک دنیا کے گوشے گوشے میں گردش چرخ، فلک دوّار کا محاورہ تک پھیل گیا۔ لیکن زمانہ نے پھر کروٹ بدلی اور آج یورپین نظر بازوں نے اپنی دوربینوں، خوردبینوں سے اپنی قوت بھر اچھی طرح دیکھ بھال چھان بین کر یہ ادّعا کیا کہ آسمان کا وجود ہی نہیں کہ اس کی گردش کا سوال پیدا ہو۔ بس زمین ہے وہی گردش کر رہی ہے اور زمین ہی

گردش ہماری زندگی کی بنیاد ہے۔

کہنا یہ ہے کہ فلسفہ وسائنس کی تھیوریاں آپس میں ٹکراتی رہیں اور ٹکراتی رہیں گی۔ ان میں ردو بدل ہوا اور ہوتا رہے گا۔ انقلاب زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے مظنونات بدلتے رہے اور بدلتے رہیں گے، مگر اسلام کے معتقدات چودہ سو سال سے اپنی جگہ قائم ہیں، قائم رہیں گے، ان میں نہ کوئی تغیر ہوا نہ ہوگا، نہ کوئی ترمیم ہوئی اور نہ ہوگی۔

ہزار فلسفیوں کی چناں چنیں بدلی
نبی کی بات مگر آج تک نہیں بدلی

آج جو خلجان ہے وہ دراصل بعض علما کی آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ کی بطلیموس کے توہمات کے ساتھ مطابقت کی بلا ضرورت کوشش کی وجہ سے ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں فرمایا گیا۔ آسمان کے سات طبق ہیں۔ بطلیموس نے کہا: آسمان نو ہیں۔ لوگوں نے یہ تطبیق دی، سات آسمان سبعہ سیارے کے ہیں، آٹھویں کرسی، نویں عرش ہے۔ اس تطبیق کا حاصل یہ ہوا کہ چاند، سورج، زہرہ، مشتری وغیرہ آسمانوں میں ہیں، یہ بات علما سے نکل کر عوام میں ایسی پھیلی کہ عوام وخواص کی زبان زد ہوگئی اور علما کے منھ سے سنی ہوئی بات کو عوام نے مذہب کا جز سمجھ لیا، اور آج جب کہ خلائی مشاہدین نے یہ بتایا کہ سیارے آسمان میں نہیں بلکہ زمین کی طرح فضا میں اپنے مرکز پر قائم ہیں۔ تو لوگوں نے ہزاروں سوالات کھڑے کر دیئے۔ اسی طرح عام ذہنوں میں یہ بات بسی ہوئی ہے کہ اللہ عزوجل آسمان میں ہے حتی کہ عوام میں یہ کفری بول عام ہے "نیچے پنچ اوپر خدا" چاند کے قریب تک پہنچنے والوں کو جب نہ آسمان ملا نہ آسمان میں بسنے والا خدا تو انہوں نے کہہ دیا کہ میں نے خدا کو بہت ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔

لیکن قرآن کریم واحادیث کا مطالعہ کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ چاند وسورج ودیگر سیارے آسمان میں مرکوز ہیں اور نہ کہیں یہ ہے کہ اللہ عزوجل آسمان یا زمین میں اسی طرح ہے جیسے ہم اور آپ رہتے ہیں۔ لہذا اس مزعوم پر اسلام کے اصول پر اعتراض نری حماقت ہے۔ ہاں! نصوص قرآنیہ وارشادات

نبویہ میں اگر کہیں یہ ہوتا کہ چاند وسورج دیگر سیارے اور ستارے آسمان میں مرکوز ہیں یا جڑے ہوئے ہیں اور سیاروں تک پہنچنے کے بعد بھی کہیں آسمان نہ ملتا تو البتہ اسلام کے اصول پر اعتراض درست ہوتا۔ یہ کتنے ظلم کی بات ہے کہ بطلیموس یا بطلیموس کے بعض کورانہ تقلید کرنے والوں کی باتوں کو اسلام کے اصول سمجھ کر اسلام کی حقانیت وصداقت کو چیلنج کیا جائے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ ساری دنیا کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ قرآن وحدیث میں کہیں نہیں کہ سیارے یا ثوابت آسمانوں میں جڑے ہیں یا مرکوز ہیں۔ جو اس کا دعویٰ کرے وہ ثبوت لائے، رہ گئے بطلیموس کے توہمات وہ نہ اسلام کے معتقدات ہیں اور نہ اس کی صداقت کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔

اس سلسلہ میں چند آیتوں کے ظاہر معنی یا غلط معنی لے کر لوگ شور مچا سکتے ہیں۔ اس لیے ان آیات کی اصل مراد واضح کر دیتا ہوں۔

كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (انبیاء: پ ۱۷-ع ۳-آیت ۳۳/یٰسٓ: آیت ۴۰)

* چاند وسورج وغیرہ فلک میں تیرتے ہیں۔

فلک کے معنی لوگوں نے آسمان کر دیا ہے اور یہی ساری غلط فہمی کی بنیاد ہے۔ اس آیت میں فلک سے مراد آسمان نہیں۔ مدار ہے۔ اب آیت کا ترجمہ یہ ہوا سب اپنے مدار میں تیرتے ہیں۔ سید المفسرین سیدنا حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یدورون فی فلکة کفلكة المغزل

ترجمہ: یہ ایک گولائی میں گھومتے ہیں جو تکلے کے مکڑے کے مثل ہے۔

ہر معمولی عقل والا جانتا ہے کہ اگر آیت مذکورہ میں فلک سے مراد آسمان ہوتا تو اس کی تفسیر کی کوئی حاجت نہ تھی۔ کون ہے جو آسمان نہیں جانتا، اس کی تفسیر فلكة كفلكة المغزل سے کرنا اس پر نص قاطع ہے کہ آیت میں فلک سے مراد آسمان نہیں، مدار ہے۔ اسی بنا پر امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا:

ہر ایک ایک گھیرے میں پیر رہے ہیں۔

آیت کا صاف وصریح مطلب یہ ہوا کہ چاند وسورج وغیرہ اپنے اپنے مدار پر چلتے ہیں۔ یہ مدار کہاں ہے؟ آسمان میں ہے، فضاؤں میں ہے، اس کی کوئی تعیین اس آیت میں نہیں۔ اگر سیاروں کا مدار آسمان میں ہے، جیسا کہ بطلیموس کہتا ہے کہ تو بھی آیت کے معنی درست اور اگر فضا میں ہے جیسا کہ آج کے فلاسفہ کہتے ہیں تو بھی صحیح۔ کسی نظریہ کسی تھیوری کے معارض نہیں۔ فلسفہ وسائنس کے نظریات بدلتے رہے اور بدلتے رہیں گے مگر قرآن مجید کا ارشاد اپنی جگہ صادق ہے اور ہمیشہ صادق رہے گا، پیدا کرنے والے نے اپنی مخلوق کو رہنے کے لیے جو جگہ دی ہے، اس کو وہی خوب جانتا ہے۔ دوسروں کو صحیح علم اگر ہے تو اس کے بتانے سے، ورنہ سوائے انکل پچو کے اور کچھ نہیں۔

چاند سورج اور ستاروں کے آسمان میں ہونے پر یہ استدلال کیا جاتا ہے۔ ایک آیت میں فرمایا: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۝ (الملک : پ ۲۹-ع ۱- آیت ۵)

ترجمہ: ہم نے آسمان کو چراغوں سے زینت دی۔

اس آیت سے سطح بیں یہ دلیل لاتے ہیں کہ ستارے آسمان میں ہیں لیکن دقیقہ بیں نظریں جانتی ہیں کہ اس آیت سے یہ قطعا لازم نہیں کہ ستارے آسمان میں پیوست ہیں یا جڑے ہوئے ہیں یا ٹکے ہوئے ہیں، زینت دینے کے لیے مرکوز ہونا، جڑا ہونا، ٹکا ہونا لازم نہیں۔

اس کو یوں سمجھئے کہ ایک محل بیچ باغ میں تعمیر ہو۔ یہ باغ اس محل کے لیے یقیناً زینت ہے مگر کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا اس باغ کے پودے محل کی دیواروں پر چھتوں پر اگے ہوئے ہیں۔ اور نہ یہ کوئی طریقہ ہے، جس طرح باغ کے پودوں اور محل کے درمیان فصل ہوتے ہوئے بھی باغ محل کی زنیت ہے اسی طرح ستارے اگر آسمان سے علاحدہ دور ہوں، مگر چوں کہ ان کی جگمگاہٹ سادہ آسمان میں ایک دلکش منظر پیدا کرتی ہے اور دیکھنے میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ستارے آسمان میں لٹکے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ فرمانا بالکل درست ہے:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۝ (الملک : پ ۲۹-ع ۱- آیت ۵)

ترجمہ: ہم نے آسمان کو چراغوں سے زینت دی۔

دیکھنے میں یہ آسمان کی زینت ہیں اور یہی اس آیت سے مراد ہے دوسری آیت سے اور واضح ہوتا ہے۔ فرمایا گیا:

وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ (سورہ حجر: آیت ۱۶)

اور ہم نے اسے مزین فرمایا دیکھنے والوں کے لیے۔

دیکھنے والوں کی قید اس کا افادہ کرتی ہیں کہ ستاروں کا آسمانوں کے لیے زینت ہونا ہمارے دیکھنے میں ہے، اس سے کسے انکار ہے کہ رات میں نیل گوں آسمان میں یہ ستارے اپنی جگ مگ سے آراستہ پیراستہ انجمن معلوم ہوتے ہیں۔

غرض کہ مزین کرنے سے آسمان میں مرکوز ہونا، جڑا ہوا ہونا حتیٰ کہ ٹکا ہوا ہونا مراد نہیں بلکہ آیت ثانیہ وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ کی روشنی میں مراد یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی نظر میں ستارے آسمان خصوصاً پہلے آسمان کی زینت ہیں۔ رہ گئی ان کی جگہ کہاں ہے، اس پر آیت کی کوئی دلالت نہیں۔

اس مقام پر سب سے بڑا استحالہ ان آیتوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝

(الفرقان: پ۱۹-ع-۴-آیت ۶۱)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات! جس نے سما میں بروج بنائے اور ان میں چراغ (سورج) اور روشن چاند پیدا کیے۔

اور اس قسم کی وہ کثیر آیتیں جن میں یہ مذکور ہے کہ سما میں چاند اور سورج بنائے۔ لیکن قرآن کریم کے اسلوب بیان اور لغات پر نظر رکھنے والا جانتا ہے کہ ''سماء'' کے معنی قرآن کریم میں بلکہ لغت عرب میں صرف آسمان کے نہیں، ''سماء'' کے اصل معنی بلندی کے ہیں اور بادل یا آسمان اس کے معنی ثانی ہیں۔ چوں کہ بادل اور آسمان اوپر ہی ہوتے ہیں اس لیے ان کو بھی ''سماء'' کہا جاتا ہے۔ متعدد جگہ قرآن کریم میں ''سماء'' آسمان کے علاوہ دوسرے معنی میں وارد ہے۔

سورۂ بقرہ کے تیسرے رکوع میں ''وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً'' ہے (آیت ۲۲)

اورسورۂ بقرہ کے بیسویں رکوع میں "وَمَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَاءٍ" (آیت ۱۶۴)

اوراللہ نے بلندی یعنی بادل سے پانی برسایا۔

"سماء" کا معنی تفسیر صاوی میں ہے:

قوله من السماء ای اللغوية وهى : ما اعلا وارتفع والمراد السحاب.

سماء کے معنی یہاں لغوی ہیں۔یعنی جواوپر ہواور بلند ہواور مراد بادل ہے۔

علاوہ ازیں لغت کی مشہور متداول کتاب المنجد میں ہے:

السماء ما نشاهده فوقنا كقبةزرقاء محيط بالأرض. ما يحيط بالأرض من الفضاء الواسع . كل ما علاك ، رواق البيت. سقف كل شيئ . ظهر الفرس. المطر. السحاب.

سما کے معنی مندرجہ ذیل ہیں (۱) وہ نیل گوں گنبد جوزمین کوگھیرے ہے جسے ہم اپنے اوپر دیکھتے ہیں (۲) یہ کشادہ فضا جوزمین کوگھیرے ہے۔(۳) ہر وہ چیز جو تیرے اوپر ہو۔ (۴) گھر کا برآمدہ (۵) ہر چیز کی چھت (۶) گھوڑے کی پیٹھ (۷) بارش (۸) بادل۔

جب سماء اتنے معنوں میں مشترک ہے،اورصرف آسمان کے معنی میں منفرد نہیں۔نیز قرآن کریم میں سماء بمعنی بلندی اور بادل مستعمل ہے تو ان آیات میں جن میں یہ مذکور ہے کہ "چاند وسورج سماء میں بنائے" اس سے آسمان مراد لینا متعین نہیں، بمعنی بلندی اور فضائے محیط بھی ہوسکتا ہے۔پس اگر خلائی کشتی کے مشاہدین کی بات صحیح ہے کہ چاند آسمان میں نہیں فضا میں ہے تو وہ ان آیات کے معارض نہیں اس لیے کہ بر تقدیر صدق قائل "سماء" سے مراد فضائے بسیط ہوگی اور آیت کے معنی یہ ہوں گے "پاک ہے وہ ذات! جس نے فضائے بسیط میں بروج پیدا فرمائے،اوراس میں چاند وسورج بنائے"۔

یا "سماء" کے معنی مطلق بلندی کے لوتو اب یہ معنی ہوئے "پاک ہے وہ ذات! جس نے بلندی میں بروج بنائے اور اس میں چاند وسورج پیدا فرمائے۔ بلندی کا مفہوم دونوں صورتوں میں صادق ہے،خواہ ستارے آسمان میں ہوں،خواہ فضا میں۔

رہ گیا یہ سوال کہ آسمان ہے کہاں؟ اس سوال کی جواب دہی ہمارے ذمہ ضروری نہیں، اس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی چیز کی جگہ معلوم نہ ہونے سے اس کا عدم لازم نہیں۔ ہزاروں آدمیوں کو آپ بازاروں میں دیکھتے ہیں، پھر اپنے گھر چلے جاتے ہیں، دوسرے دن پھر آتے ہیں، آپ کو یہ معلوم نہیں کہ درمیانی زمانہ میں یہ کہاں رہے مگر پھر بھی آپ یہ یقین کرتے ہیں کہ یہ درمیانی وقفہ میں موجود تھے۔ اسی طرح اگر بالفرض یہ معلوم نہ ہو کہ آسمان کہاں ہیں، اور ہم نہ بتا سکیں تو بھی آسمان کے وجود پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن یہاں ایسا بھی نہیں نظر اوپر اٹھایئے یہ نیل گوں قبہ جسے ہم دیکھ رہے ہیں، آسمان ہے۔ ارشاد ہے:

"أَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَاءِ" (سورۃ ق: پ۲۶-ع۱۵-آیت۶)

کیا یہ آسمان کو نہیں دیکھتے۔

رہ گیا یہ ہم سے کتنی دور ہے۔ یہ اگر ہمیں نہ معلوم ہو تو اس سے بھی اس کے وجود پر کیسے شبہہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمالیہ کی چوٹیاں ہم میں سے ہزاروں انسان میلوں کی دوری سے دیکھتے ہیں، مگر درمیانی مسافت کسی کو نہیں معلوم! اس سے ہمالیہ کی بلند و بالا چوٹیوں کے وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لمبے میدانوں میں دور دراز کی بستی اندھیرے میں جھلکتی ہے۔ نئے رہ پیا کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ کتنی دور ہے، کیا فاصلہ نہ معلوم ہونے کی بنیاد پر کوئی دانش منداس کے وجود سے انکار کر سکتا ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو اگر ہمیں زمین سے آسمان کے فاصلہ کی مقدار معلوم نہیں تو ہم یا کوئی عقل والا آسمان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔

ان ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہوا:

۱۔ چاند یا دیگر سیاروں تک پہنچ جانا عقلاً ممکن اور شرعاً واقع ہے۔

۲۔ شرعی طور پر یہ متیقن نہیں کہ چاند و سورج آسمان میں مرکوز یا جڑے ہوئے ہیں۔

۳۔ شرعی طور پر یہ قطعی ثابت نہیں کہ آسمان زمین سے کتنے فاصلے پر ہے۔

۴۔ جن آیتوں کے ظاہر سے متبادر ہوتا ہے کہ چاند و سورج "سماء" میں ہیں۔ ان میں سماء کے معنی بلندی کے ہیں، یا فضائے بسیط کے۔

میں نے باوجود نا اہلیت کے ہزاروں سوالوں اور بحثوں کے بعد یہ مختصر سی توجیہ

ناظرین کے سامنے عرض کردی ہے۔ علما سے اصلاح کا طالب ہوں، اور دیگر طبقے کے حضرات سے اس پر کامل غور وخوض کا۔ اس سلسلے میں ہر شبہہ کے جواب کے لیے یا بصورت وضوحِ حق، حق قبول کرنے کے لیے حاضر ہوں۔

اس مضمون کا یہ بھی مطلب نہیں کہ میں نے خلائی باحوصلہ مسافرین کی ہر بات کو واقعی تسلیم کرلیا ہے۔ بلکہ ان میں بحث کی بہت کچھ گنجائش ہے، جس کے لیے مجھے بات بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ آئندہ خود ساری دنیا سنے گی، اور دیکھے گی۔ لیکن عام لوگ چوں کہ اس سے متاثر ہیں اور طرح طرح کے سوالات کررہے ہیں۔ اس لیے میں نے خلائی باد پیاؤں کی باتوں کو بفرض صدق مانتے ہوئے یہ کلام کیا ہے۔

لَعَلَّ اللّٰهَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا ۝

(حواشی)

(۱) یہ مضمون ابتدائی کاوش ہے۔ بعد میں، میں نے اسی موضوع پر ''اسلام اور چاند کا سفر'' تصنیف کی، جس میں ناقابل انکار دلائل سے ثابت کیا کہ چاند، سورج، اور جملہ ستارے آسمان کے نیچے ہیں۔ اور اس پر ہونے والے جملہ شبہات کے جوابات درج ہیں۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ ''تفسیر مدارک'' میں فلک کی تفسیر میں ہے:

عن ابن عباس ان المراد بالفلک السماء، والجمهور علیٰ ان الفلک موج مکفوف تحت السماء تجری فیه الشمس والقمر والنجوم.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ فلک سے مراد آسمان ہے۔ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ فلک سے مراد ''موج مکفوف'' ہے جو آسمان کے نیچے ہے، جس میں سورج، چاند اور تارے چلتے ہیں۔

جمہور اور حضرت ابن عباس کا اختلاف اس میں ہے کہ اس آیت میں فلک کا کیا معنی ہے؟ آسمان یا موج مکفوف۔ مگر وہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ چاند وسورج وستارے آسمان کے نیچے ہیں۔

چناں چہ عینی اور فتح الباری میں اسی آیت کی تفسیر میں ان سے منقول ہے: ای یدورون حولہ" یہ سب اس (آسمان) کے گرد گھومتے ہیں، اور یہ متعین کہ گرد سے مراد آسمان کا اوپری حصہ نہیں۔ اس لیے کہ خود انہیں حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے دوسری روایت یہ ہے:

ان الشمس والقمر وجوھھما مما یلی السماوات وظھورھما مما یلی الارض . (مدارک)

چاند وسورج کے چہرے آسمان کی طرف ہیں اور ان کی پیٹھ زمین کی طرف۔ یہ اسی وقت درست ہوگا کہ چاند وسورج آسمان کے نیچے ہوں۔

علاوہ ازیں حسان بن عطیہ فرماتے ہیں:

الشمس والقمر والنجوم مسخرۃ فی فلک بین السماء والارض .
(درمنثور: ص ۳۱۵)

سورج، چاند، ستارے، آسمان وزمین کے مابین ایک گھیرے میں مسخر ہیں۔ اسی میں ابن زید سے ہے کہ انہوں نے "کل فی فلک یسبحون" کی تفسیر میں فرمایا:

"الفلک الذی بین السماء والارض مجاری النجوم والشمس والقمر"

زمین وآسمان کے درمیان وہ گھیرا ہے جو ستارے اور سورج چاند کی گزرگاہ ہے۔

ستاروں کے بارے میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

"النجوم معلقۃ بالقنادیل بین السماء والارض کتعلیق القنادیل فی المساجد" (فتح الباری : ص:۶۸۶. ج:۱۳)

ستارے پہلے آسمان اور زمین کے درمیان قندیلوں میں اس طرح لٹکے ہوئے ہیں جیسے مسجدوں میں قندیلیں ہوتی ہیں۔

تفسیر کبیر میں عطا مشہور تابعی کا قول ہے:

"انھا فی قنادیل معلقۃ بین السماء والارض بسلاسل من النور وذلک

سلاسل فی ایدی الملائکة" (ج:۸.ص:۱۳۸)
ستارے زمین و آسمان کے درمیان نورانی زنجیروں میں لٹکی ہوئی قندیلوں کے اندر
ہیں اور یہ زنجیریں فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔
اور یہی مضمون حضرت ابن عباس وابن عمر رضی اللہ عنہم سے تفسیر عزیزی میں بھی
منقول ہے۔
یہ نصوص اس پر دلیل ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا اس پر
اتفاق ہے کہ چاند سورج اور ستارے آسمان کے نیچے ہیں۔

☆☆☆

شرح حدیث جبرئیل

حدیث جبرئیل:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ ﷺ کان یوما بارزا للناس اذ اتاہ رجل یمشی فقال یا رسول اللہ ! ماالایمان؟ قال : الایمان ان تومن باللہ وملائکتہ ورسلہ ولقائہ وتومن بالبعث الاخر. قال یا رسول اللہ! ماالاسلام ؟ قال : الاسلام ان تعبد اللہ ولاتشرک بہ شیئاوتقیم الصلوٰۃ وتوتی الزکوٰۃ المفروضۃ وتصوم رمضان. قال یا رسول اللہ! ما الاحسان ؟ قال: الاحسان ان تعبد اللہ کأنک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک. قال یا رسول اللہ ! متی الساعۃ؟ قال ماالمسوول عنہا باعلم من السائل ولکن ساحدثک عن اشراطھا : اذا ولدت المرأۃ ربتھا فذاک من اشراطھا، واذا کان الحفاۃ العراۃ رؤس الناس فذاک من اشراطھا، فی خمس لا یعلمھن الا اللہ ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام ثم انصرف الرجل فقال ردوا علی فاخذوا لیرد وا . فلم یروا شیئا فقال : ھذا جبرئیل جاء لیعلم الناس دینھم . (بخاری کتاب التفسیر سورہ لقمان ص:۷۰۴ اول - الایمان ص:۱۲، مسلم ایمان ۵- ابن ماجہ مقدمہ ۹ فتن ۲۵ مسند امام احمد ۲-۴۲۶)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مجمع عام میں تشریف فرماتھے۔ ایک شخص پیدل چلتا ہوا خدمت اقدس میں حاضر ہوا، اورکہا: یارسول اللہ ! ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ایمان یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اس کی ملاقات پر اورقبر سے آخری بار اٹھنے پر ایمان لائے۔ اس نے کہا: یارسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے

اس طرح کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اور نماز ادا کرے، اور فرض زکوٰۃ دے، اور رمضان کا روزہ رکھے، اس نے عرض کیا: یارسول اللہ احسان کیا ہے فرمایا احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے پھر اس طرح کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اس نے عرض کیا قیامت کب آئے گی؟ فرمایا جس سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس کی نشانیوں کو بتاتا ہوں۔ جب عورت اپنے آقا کو جنے، یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور جب ننگے پاؤں ننگے بدن رہنے والے، لوگوں کے سردار ہوجائیں، یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے (قیام قیامت کا وقت) ان پانچ چیزوں میں سے ہے جنہیں اللہ کے سوا (بے اس کے بتائے) کوئی نہیں جانتا (جیسا کہ قرآن مجید میں ہے) بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، اور بارش برساتا ہے۔ مادہ کے پیٹوں میں کیا ہے؟ جانتا ہے۔ پھر وہ شخص لوٹ گیا۔ آنحضور نے فرمایا: اسے واپس لاؤ۔ لوگوں نے لوٹانے کی کوشش کی مگر (جب باہر جا کر دیکھا) تو وہ غائب تھے۔ فرمایا: یہ جبرئیل تھے، لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے۔

تشریحات

تکمیل ا: قرطبی نے کہا: یہ حدیث اس لائق ہے کہ اس کو ام السنۃ کہا جائے۔ اس لیے کہ یہ احادیث کے جملہ علوم کو متضمن ہے۔ اسی لیے امام بغوی نے مصابیح اور شرح السنۃ دونوں کتابوں کو اسی حدیث سے شروع کیا، جیسے قرآن کریم سورۂ فاتحہ سے شروع کیا گیا کہ وہ ام الکتاب ہے۔ اجمالی طور سے قرآن کریم کے جملہ علوم پر مشتمل ہے۔

امام قاضی عیاض نے فرمایا کہ یہ حدیث تمام ظاہری باطنی عبادات کے وظائف پر مشتمل ہے، خواہ ایمان ہو، خواہ جوارح کے اعمال ہوں، خواہ دلوں کا اخلاص ہو، یہاں تک کہ شریعت کے کل علوم اس کی طرف راجع ہیں، اور اس سے نکلتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ہم اس مبارک حدیث کے جو مختلف حصے، مختلف صحابہ کرام یا مختلف کتابوں میں ہیں، سب کو یکجا کر کے اپنے الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

بخاری و مسلم کے علاوہ یہ حدیث بالفاظ مختلفہ کچھ زیادتی کی قدرے تقدیم و تاخیر کے ساتھ خود حضرت ابوہریرہ، نیز حضرت عمر، حضرت انس، حضرت جریر بن عبداللہ بجلی، حضرت ابن عباس، حضرت ابو عامر اشعری اور حضرت عبداللہ بن عمر سے ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، مسند امام احمد بن حنبل، بزار، صحیح ابو عوانہ، طبرانی وغیرہ میں مذکور ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بغیر کسی امتیاز کے صحابہ کرام کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ اگر کوئی نا آشنا اجنبی حاضر ہوتا، پہنچان نہیں سکتا تھا۔ اسے پوچھنا پڑتا رسول اللہ! کون ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: اگر اجازت ہو تو ہم حضور کے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ بنادیں، جس پر تشریف رکھیں، تاکہ اجنبیوں کو پوچھنا نہ پڑے۔ اجازت ملنے پر صحابہ نے ایک چبوترہ بنادیا، جس پر حضور تشریف رکھا کرتے۔ اور صحابہ اس کے پہلو میں بیٹھتے۔ ایک دن مجمع عام میں حضور اسی چبوترے پر اخیر عمر پاک میں خطبہ دے رہے تھے۔ فرمایا: مجھ سے جو چاہو پوچھو۔ حاضرین پر ہیبت طاری ہوگئی، جس کی وجہ سے کوئی کچھ دریافت نہ کرسکا کہ اچانک ایک صاحب پیدل چلتے ہوئے نمودار ہوئے۔ نہایت خوبصورت، انتہائی سفید و شفاف کپڑے پہنے ہوئے، جس پر نام کو بھی میل نہ تھا۔ ان کے بدن سے بہترین خوشبو اٹھ رہی تھی، داڑھی اور بال بالکل سیاہ۔ نہ تو ان کی ہیئت مسافروں جیسی تھی۔ نہ ان پر سفر کا کوئی اثر تھا، تعجب یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی انہیں پہچانتا بھی نہ تھا۔ حاضرین نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ کر کہا ہم پہچانتے نہیں یہ کون ہیں؟

انہوں نے فرش کے کنارے پہنچ کر عرض کیا: **السلام علیک یا رسول اللہ!** حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے نزدیک آجاؤں۔ فرمایا: آجاؤ۔ کئی بار نزدیک آنے کا اذن طلب کیا۔ ہر بار اجازت ملی، وہ لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے آنحضور کے بالکل نزدیک آکر آنحضور کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر اور اپنا ہاتھ حضور کے زانو پر رکھ کر بیٹھ گئے، اور مندرجہ ذیل سوالات کیے: یا رسول اللہ! ایمان کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی تمام کتابوں اور اس کے کل رسولوں جملہ نبیوں پر اور اس کی ملاقات پر اور موت پر اور قیامت کے دن قبروں سے زندہ ہوکر اٹھنے پر ایمان لاؤ۔ حساب، میزان، جنت، دوزخ پر

ایمان لاؤ۔ اور تقدیر پر ایمان لاؤ کہ اس کا اچھا، برا، میٹھا، کڑوا، سب خدا کی طرف سے ہے۔
یہ جواب سن کر اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ حاضرین کو حیرت ہوئی، سوال بھی کرتے ہیں، اور تصدیق بھی کرتے ہیں۔

پھر انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اس کی گواہی دو کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ اور فرض نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو، اور فرض زکوٰۃ دو، رمضان کے روزہ رکھو، اگر بیت اللہ جانے کی استطاعت ہو تو حج کرو، عمرہ کرو، جنابت سے غسل کرو، کامل طریقے سے وضو کرو۔ اس نے عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا۔

پھر پوچھا یا رسول اللہ! احسان کے بارے میں بتائیے؟ فرمایا: احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو، اس طرح اس کی خشیت رکھو گویا اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

انہوں نے عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا۔

پھر دریافت کیا: قیامت کب آئے گی؟ اس سوال پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے گردن جھکالی، کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ انہوں نے تین بار یہی سوال دہرایا، تو سر اقدس اٹھا کر فرمایا:

قیامت کے بارے میں جس سے سوال کیا گیا وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔

اس کے بعد انہوں نے قیامت کی نشانیاں پوچھیں۔ یا یہ کہ آنحضور نے از خود فرمایا:
میں تمہیں قیامت کی کچھ نشانیاں بتاتا ہوں۔ فرمایا: قیامت کی نشانیاں یہ ہیں کہ باندی اپنے آقا کو جنے گی، ننگے پاؤں، ننگے بدن رہنے والے، گونگے، بہرے حکومت کریں گے۔ بھیک منگے، بکریوں کالے اونٹوں کے چرواہے محلوں میں فخر کریں گے۔

قیامت کب آئے گی، یہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ پھر آنحضور نے سورۂ لقمان کی یہ اخیر آیت تلاوت فرمائی۔

ترجمہ: اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے، وہ بارش برساتا ہے، اور ماؤں کے پیٹ میں

کیا ہے، جانتا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا، کل کیا کمائے گا، کسی کو نہیں معلوم کہ کہاں مرے گا، اس میں کوئی شک نہیں، اللہ جاننے والا بتانے والا ہے۔

اس کے بعد یہ شخص چلے گئے، جب چلے گئے، تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: انہیں واپس لاؤ۔ صحابہ کرام نے ہر طرف تلاش کیا مگر وہ نہیں ملے۔ اب حضور نے فرمایا۔ تم لوگ جانتے ہو، یہ کون تھے؟ یہ جبرئیل تھے، تم لوگوں نے اس وقت کچھ نہیں پوچھا یہ تو آئے تھے کہ تم کو تمہارا دین سکھائیں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، جب بھی جبرئیل آئے میں نے پہچان لیا مگر اب کی بار نہ پہچان سکا۔ یہ واپس ہونے کے لیے جب مڑ چکے تھے جب پہچانا۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ تین دن کے بعد حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے ملاقات کی اور دریافت فرمایا۔ تمہیں معلوم ہے وہ سائل کون تھے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں۔ فرمایا: وہ جبرئیل تھے، تمہیں دین سکھانے آئے تھے۔

نکات ۲: بخاری میں جتنا حدیث کا متن ہے۔ اس پر وارد بہت سے شبہات اس حدیث کے متفرق متون کو جمع کر دینے سے دور ہو گئے۔ اسی سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ روایتوں میں جو تقدیم و تاخیر کی زیادتی ہے، وہ راویوں کی طرف سے ہے کہ انہوں نے اپنی یادداشت یا ضرورت کے مطابق ذکر کیا۔

اب چند ضروری گوشوں کی توضیح باقی رہ گئی ہے، وہ حاضر ہے۔

(الف) جبرئیل اس خاص ہیئت کے ساتھ اجنبی بن کر کیوں حاضر ہوئے؟ مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم لوگوں کو اس بات سے روک دیا گیا تھا کہ ہم لوگ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوالات کریں۔ اس لیے ہم لوگوں کی خواہش رہتی تھی کہ کوئی ذہین دیہاتی آکر کچھ پوچھے اور ہم سنیں۔ اسی حدیث کا ابتدائی حصہ یہ ہے کہ اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اذن عام دے دیا تھا جو پوچھنا چاہو پوچھو مگر ہیبت کی وجہ سے کوئی کچھ نہ پوچھ سکا۔ اس لیے جبرئیل امین اجنبی بن کر حاضر ہوئے، تاکہ صحابہ یہی سمجھیں کہ یہ کوئی دیہاتی ہیں۔ اگر صحابہ کرام کو یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ جبرئیل ہیں، تو

اس کا امکان تھا کہ صحابہ پر ان کی ہیبت طاری ہو جاتی۔ یا ہو سکتا تھا ان کی زیارت میں انہماک ہو جاتا اور ان کے سوالات و جوابات کو کما حقہ متحضر نہ رکھ پاتے۔

(ب) بچھونے کے کنارے کھڑے ہو کر سلام کرنے کے بعد بار بار نزدیک آنے کا اذن مانگنا اس لیے تھا کہ تمام حاضرین ان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ نیز یہ بتانا تھا کہ بزرگوں کے بہت نزدیک بلا ان کی اجازت نہیں ہونا چاہیے، خصوصاً جب مجلس بھری ہو۔

(ج) گردنیں پھلانگتے اس لیے آئے کہ ہو سکتا ہے کہ بغیر اس کے قریب آنا ممکن نہ ہو نیز یہ بدویانہ طریقہ اس لیے اختیار کیا کہ لوگ یہی سمجھیں کہ واقعی یہ کوئی بدوی ہیں۔

(د) گھٹنے سے گھٹنے ملا کر، زانوے اقدس پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے۔ یہ بتانے کے لیے کہ تلمیذ و استاذ میں جتنی موانست ہوگی، قرب ہوگا، اتنا ہی زیادہ فیض ہوگا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فوضع یدیہ علیٰ فخذیہ.

اس میں یدیہ کی ضمیر کا مرجع متعین ہے کہ رجل ہے۔ البتہ فخذیہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مرجع حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہوں، تو وہ معنی ہوں گے کہ جو ہم نے بیان کیا۔ دوسرے یہ کہ اس کا مرجع بھی رجل ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ آنے والے نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے زانو پر رکھے۔ اس میں ادب زیادہ ہے، اور پہلے میں یگانگت کا بہت زیادہ اظہار نیز بدویت کا بھی۔ ہم نے پہلی شق اس لیے اختیار کی کہ سلیمان تیمی کی روایت میں یہ تصریح ہے:

وضع یدہ علی رکبتی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

ایک روایت دوسری کی تفسیر ہوتی ہے۔ نیز بغوی اور اسماعیل تیمی نے اسی پر جزم فرمایا۔ اور طیبی نے اسی کو ترجیح دی۔

(ہ) سفید شفاف بے داغ لباس پہن کر حاضر ہوئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ تلمیذ کو استاذ کے سامنے اس طرح حاضر ہونا چاہئے کہ اس کا ذہن پندار کے داغ سے ملوث نہ ہو۔

(و) سیاہ بال جوانی کی نشانی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ طلب علم کا بہترین زمانہ

جوانی ہے۔

(ز) انتہائی خوبصورت بہترین خوشبو کے ساتھ آنے میں تلقین ہے کہ تلمیذ کو استاد کے حضور اچھی ہیئت میں حاضر ہونا چاہیے، جس سے اس کی طرف میلان قلب ہو۔ ایسی ہیئت میں نہ حاضر ہو کہ اسے تکدّر یا نفرت ہو۔

۳۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالملائکہ وایمان بالکتب کی تشریح:

ہر مسلمان جانتا ہے۔ اور اس کی تفصیل کتاب میں متعدد جگہ آئے گی۔ توضیح طلب باتیں تین ہیں۔ موت پر ایمان، اور اس کی ملاقات پر ایمان اور بعث آخر پر ایمان۔

(الف) موت ایسی چیز ہے کہ اس کا سبھی کو یقین ہے، پھر اس پر خصوصیت سے ایمان لانے کا ذکر غالباً اس بنا پر ہے کہ موت کا یقین سب کو ضرور ہے مگر اس سے غفلت بھی عام ہے۔ مراد یہ ہے کہ موت سے غفلت نہ برتی جائے، اسے یاد رکھا جائے یا اس سے پوری دنیا کا کلیۃً فنا ہو جانا مراد ہے۔

(ب) بعث سے مراد، قیامت کے دن قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنا ہے، اور یہ بہر حال آخر ہے۔ اب آخر صرف توضیح وتاکید کے لیے ہے۔ جیسے کہتے ہیں: کَامْس الذاہب'' حالاں کہ امس کا معنی ہے کل گذشتہ کے، یا اس بنا بر کہ بعث دو ہیں۔ ایک عدم سے وجود میں آنا، یا ماں کے پیٹ سے دنیا میں آنا۔ دوسرے قیامت کے دن۔ یہ دوسرا پہلے کی بہ نسبت آخر ہوا۔

(ج) یوم آخر سے مراد قیامت ہے۔ اس کو یوم آخر پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن جو احوال واہوال اور معاملات پیش آئیں گے، ان سب پر ایمان لانا، مثلاً حساب کتاب، وزن اعمال، پل صراط پر گزر، جنت ودوزخ، جیسا کہ حضرت ابن عباس کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔

(د) اللہ کی ملاقات سے مراد یہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں حاضری ضروری ہے۔ یا یہ کہ اس کی رویت مراد ہے کہ مومنین کو اس کی زیارت ہوگی۔ جیسا کہ اس کے بارے میں احادیث مشہورہ وارد ہیں۔ یہ اگر چہ یوم آخر کے احوال میں داخل ہے۔ مگر اہمیت کی وجہ سے اس کو علاحدہ بھی ذکر کیا۔

۴۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ایمان اوراسلام دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ لیکن یہ کلیۃً صحیح نہیں۔ یہاں جن امور کو اسلام بتایا، وفد عبدالقیس کی حدیث میں انہیں کوایمان بتایا۔

نیز قرآن مجید میں ہے:

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ . (ذٰریٰت : آیت ۳۶،۳۵)

اس بستی میں جتنے مومن تھے، ہم نے سب کو باہر کیا، ہم نے اس بستی میں صرف ایک گھر مسلمان کا پایا۔

یہاں حضرت لوط علیہ السلام کے گھر والوں کو مومن بھی فرمایا، اور مسلمان بھی۔ اس سے ظاہر کہ مومن اور مسلمان مرادف ہیں، تو ثابت ہوا کہ ایمان اوراسلام بھی مرادف ہیں۔

لیکن اس حدیث جبرئیل اور دیگر احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان اوراسلام متغائر ہیں۔ نیز قرآن مجید ہی میں ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا . قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (حجرات: آیت ۱۴)

گنواروں نے کہا ہم ایمان لے آئے، آپ فرمادو! ایمان نہیں لائے۔ ہاں یہ کہو ہم تابع ہو گئے، ابھی تمہارے دلوں میں ایمان کہاں داخل ہوا۔

اس آیت میں ایمان کی نفی کر کے، اسلام کا اثبات ہے۔ اس سے ظاہر کہ ایمان اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوا کہ اطلاق میں کہیں کہیں تغایر کی بو آتی ہے، ورنہ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔

ہم نے نزہۃ القاری کتاب الایمان کی ابتدا میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایمان، تصدیق اور اقرار باللسان دونوں کا نام ہے، ایمان کے لغوی معنی تصدیق کے ہیں۔ اوراسلام کے لغوی معنیٰ تابع دار ہونے کے ہیں۔ شرع میں اسلام کے معنی ہیں، اس دین کا پابند ہونا جو خدا کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لائے، ظاہر ہے کہ انسان کسی دین کا پابند اسی

وقت ہوگا جب اس کے اصول کو سچ جانے اور اس کے صحیح ہونے کا اقرار کرے۔ اور یہی جاننا ایمان ہے، اور جب انسان کسی کے اصول کو سچ جان لے گا، اور اس کا اقرار بھی کرلے گا تو اس کا پابند بھی ہوگا۔ لہذا ایمان و اسلام ایک ہوئے۔

ہاں! اطلاق میں کہیں کہیں اسلام ظاہری اعمال کی ادائیگی پر بولا گیا ہے۔ اس لحاظ سے فرق صرف اعتباری ہوگا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں۔ حدیث جبرئیل اور سورۂ حجرات کی اس آیت میں یہی اطلاق ہے، ورنہ حدیث جبرئیل کا اخیر اس کا رد ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سب کو دین فرمایا جس میں ایمان بھی داخل ہے، اور خود قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۝ (آل عمران: آیت ۸۵)

جو اسلام کے سوا کسی دین کو قبول کرے اسے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور ارشاد ہوا۔

وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۝ (مائدہ: آیت ۳)

اور تمہارے لیے دین اسلام کو میں نے پسند کیا۔

ان آیات میں صرف اسلام کو دین بتایا۔ کیا ایمان دین سے خارج ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور ضرور نفی میں ہے، تو ثابت کہ ایمان اور اسلام دو متضاد چیزیں نہیں۔ مسلمانوں کے عرف میں بولتے ہیں: فلاں ایمان لایا۔ یا بولتے ہیں فلاں اسلام لایا۔ دونوں کے معنی بلا کسی دغدغہ کے ایک ہیں۔ ہاں! اطلاق کے اعتبار سے شریعت میں اس کے مابین عموم خصوص مطلق کی نسبت ہوگی۔ ایمان اور اسلام دونوں کا ایک مفہوم پر اطلاق جیسے وفد عبد القیس والی حدیث میں۔ اور سورۂ ذٰریٰت کی مذکورہ آیت میں۔ اور اسلام کا اور ایمان کا الگ الگ معنوں میں اطلاق جیسے سورۂ حجرات کی آیت میں۔

تقدیر: کا مطلب یہ ہے کہ ہر بھلائی برائی اللہ عزوجل نے اپنے علم ازلی کے موافق مقدر کردی ہے، جو بات جیسے ہونے والی تھی، اور جو شخص جو کچھ کرنے والا تھا، اللہ عزوجل اسے ازل سے جانتا تھا، اسی کے مطابق لکھ لیا۔ اب اس کے خلاف نہیں ہوسکتا، محال ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ عزوجل نے لوگوں کے احوال جانے بغیر جو چاہا لکھ دیا۔ اور اب ہم اس

لکھنے کی وجہ سے ویسا ہی کرنے پر مجبور ہیں۔ بلکہ مثلاً زید کے ذمے برائی لکھی، اس لیے کہ اللہ عزوجل کو معلوم تھا کہ برائی کرے گا اگر زید بھلائی کرنے والا ہوتا تو اس کے ذمے بھلائی لکھتا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اللہ عزوجل نے انسان کو جمادات پتھر کنکر کی طرح بے حس وحرکت بے اختیار نہیں بنایا۔ بلکہ ایک نوع اختیار بھی دیا ہے کہ کسی کام کو چاہے تو کرے۔ چاہے تو نہ کرے۔ اسی کے ساتھ عقل بھی دی کہ وہ بھلے برے، نفع نقصان کو پہچان سکے۔ اور ہر قسم کے سامان واسباب مہیا فرمادیئے کہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو ان اسباب سے کام لے۔ اسی اختیار پر مواخذہ ہے، اپنے آپ کو جمادات کی طرح مجبور محض سمجھنا یا بالکل مختار سمجھنا دونوں گمراہی ہے۔

تقدیر کے منکرین کو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس امت کا مجوس فرمایا۔ وجہ شبہہ یہ ہے کہ مجوس دو خالق مانتے ہیں۔ خالق خیر یزداں، خالق شر اہرمن۔ اور قدریہ یعنی تقدیر کے منکرین ،وہ انسان کو اپنے افعال کا خالق مانتے ہیں۔ انہوں نے دو ہی نہیں کروڑوں خالق مانے۔

تقدیر وقضا ہم معنی ہیں۔ قضا کی تین قسمیں ہیں۔ مبرم حقیقی، جو علم الٰہی میں کسی چیز پر معلق نہیں۔ معلق محض، ملائکہ کے صحیفوں میں جس کا معلق ہونا ظاہر فرمادیا گیا ہو۔ معلق شبیہ مبرم، صحف ملائکہ میں جس کی تعلیق مذکور نہیں۔ مگر وہ علم الٰہی میں معلق ہے۔

مبرم حقیقی کی تبدیلی محال ہے۔ اگر محبوبان بارگاہ اس بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں تو انہیں اس سے روک دیا جاتا ہے۔ مثلاً فرشتے قوم لوط پر عذاب لے کر آئے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بآں قرب واختصاص بہت کچھ عرض ومعروض کی، یہاں تک کہ ان کی عرض کو قرآن کریم نے مجادلے سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد ہے:

یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ؕ (ھود: آیت ۷۴)

ابراہیم ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگا۔

مگر چوں کہ یہ عذاب مبرم حقیقی تھا، اس لیے نہ رُکا۔

قضائے معلق اولیائے کرام کی دعاؤں، ان کی توجہ اور اعمال حسنہ سے ٹل جاتی ہے۔

معلق شبیہ مبرم تک عامہ اولیائے کرام کی رسائی نہیں۔ اکابر کی ہے۔ جو ان کی دعا

اور توجہ سے ٹل جاتی ہے۔

حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی کو فرمایا ہے:

"اِنِّیْ اَرُدُّ الْقَضَاءَ بَعْدَ مَا اُبْرِمَ"

میں قضائے مبرم کو بدل دیتا ہوں۔

اور اسی کو حدیث میں فرمایا گیا:

اِنَّ الدُّعَاءَ یَرُدُّ الْقَضَاءَ بَعْدَ مَا اُبْرِمَ

دعا قضائے مبرم کو ٹال دیتی ہے۔

تقدیر کے مسائل عقول متوسطہ کی دسترس سے باہر ہیں۔ ماوشما کس گنتی میں۔ حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم کو اس میں بحث کرنے سے روک دیا گیا۔ اس میں زیادہ غور وخوض، بحث وتمحیص بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ استدلالی نہیں، صرف کشفی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ مسئلہ جتنا ہی دقیق اور عام عقول کی دسترس سے بالاتر ہے، اتنا ہی لوگ اس میں کرید کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے عام فہم سے قریب کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے: ہم چلتے ہیں، پھرتے ہیں، اٹھتے ہیں، بیٹھتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، زندگی کے روزمرہ معمولات میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ ہم اپنے ارادے اور اختیار سے کرتے ہیں، ہم جو چاہتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، جو نہیں چاہتے، نہیں کھاتے پیتے ہیں، ہم جہاں چاہتے ہیں، جاتے ہیں، اور جہاں نہیں چاہتے ہیں نہیں جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برخلاف رعشے کی بیماری والا ہے کہ وہ لاکھ چاہے کہ اس کا سر اور اس کا ہاتھ، اس کا پاؤں نہ ہلے، مگر وہ روک نہیں سکتا۔ فالج زدہ، مفلوج عضو کو لاکھ چاہے، حرکت نہیں دے سکتا۔ اس کے برخلاف ایک تندرست انسان جب چاہے، جس عضو کو چاہے حرکت دے سکتا ہے، حرکت سے روک سکتا ہے، تندرست کی حرکات وسکنات، رعشہ اور فالج زدہ کی طرح بے اختیاری نہیں، مگر اس اختیار کے باوجود روزمرہ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ ایک انسان کسی چیز کو کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے لاکھ جتن کرتا ہے، سب تدبیریں کر ڈالتا ہے، مگر وہ اس میں

کامیاب نہیں ہوتا۔ اس سے سمجھ میں آیا کہ ہمیں اختیار بھی ہے، قدرت بھی ہے، مگر بالکلیہ نہیں۔ ہمارا اختیار ہماری قدرت کسی اورقدرت والے اختیار والے کے ماتحت ہے، یہی تقدیر ہے۔

۵۔احسان:

باب افعال کا مصدر ہے۔اس کا مادہ ''حسن'' ہے، جب اس کا مفعول بغیر حرف جر کے آتا ہے تو اس کے معنی اچھا کرنے کے آتے ہیں، اور جب 'الیٰ' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو نفع پہنچانے کے یہاں پہلا معنی مراد ہے، عبادت کے اندر احسان کیا ہے۔اسے یوں فرمایا:

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک.

اللہ کی یوں عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس تقدیر پر مطلب یہ ہوگا کہ تم عبادت میں یہ تصور رکھو گویا کہ اللہ عزوجل کو تم دیکھ رہے ہو۔ کیوں کہ تم اسے نہیں دیکھتے اور نہ دیکھ سکتے ہو مگر وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، اسی کو دوسری حدیث میں یوں بیان فرمایا:

اعبد ربک فی جمیع الاحوال کعبادتک فی حال العیان.

ہر حالت میں اپنے رب کی یوں عبادت کرو جیسے حالت مشاہدہ میں کرتے ہو۔

اس تقدیر پر احسان کا صرف ایک درجہ ہوا، وہ یہ کہ اللہ کی عبادت یوں کریں، گویا ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ ہو سکے تو یوں عبادت کرو کہ تم کو وہ دیکھ رہا ہے۔

اب احسان کے دو درجے ہوئے۔ ایک یہ کہ عبادت کے وقت یہ خیال جمارہے کہ اللہ عزوجل کو ہم دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ نہ ہو سکے تو یہ خیال جمائے کہ وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب بندے کو یہ حضور حاصل ہو کہ اللہ عزوجل ہم کو ہمارے ظاہر و باطن

کو دیکھ رہا ہے تو پھر نہ کوئی اطاعت چھوٹے گی، نہ اس کے آداب وشرائط میں کوئی کمی ہوگی، اور نہ کوئی گناہ پر جرأت ہوگی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مالک دروازے پر بیٹھا ہوا نوکروں سے کام لے رہا ہے، نوکر اپنے کام میں لگے ہیں، مالک کو نہیں دیکھتے مگر یہ جانتے ہیں کہ مالک ہم کو دیکھ رہا ہے تو کام میں نہ کمی کریں گے نہ قصداً کام بگاڑیں گے۔ بخلاف اس کے کہ مالک موجود نہ ہو۔

لیکن اگر دربار شاہی میں کوئی شہنشاہ کے روبرو موجود ہو، شہنشاہ کے چہرے پر اس کی نظر ہو تو اس کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کیا وہاں حکم عدولی کی جرأت ہوگی؟ تعمیل حکم میں تاخیر کی مجال ہوگی؟ کیا آداب دربار کی خلاف ورزی ہوگی؟ کیا کوئی اپنے کو لایعنی باتوں میں مشغول رکھے گا؟ خصوصاً جب کہ شہنشاہ ایسا ہو جس پر ظاہر وباطن سب منکشف ہو۔ آنکھوں کی چوری سے لے کر سینے کے اندر تک مطلع ہو، دل کی دھڑکنوں کے ساتھ خطرات بھی اس سے پوشیدہ نہ ہوں، عمداً تو بہت دور ہے کیا دل میں بغاوت، سرکشی، حکم عدولی کا وہم بھی آسکے گا؟

اور سوچو! جب کہ شہنشاہ مالک حقیقی ذوالجلال والجبروت ہو اور اس کے ساتھ حسن وجمال میں بھی لاشریک لہ ہو تو حاضر باش کا کیا حال ہوگا۔ ع

ذوق ایں می نہ شناسی بخدا تا نا چشی

یہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ان جوامع کلم میں سے ہے کہ اس کی تشریح سے دفتر کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ یہی تصوف کی اصل ہے جس کی شرح میں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، اور ہزاروں لکھی جائیں گی، اور جو لکھی گئیں یا جو لکھی جائیں گی، وہ ایک قطرہ بھی اس بحر ناپید کنار کا نہیں۔

ان سب کی تفصیل یہ ہے کہ ایمان اصل الاصول ہے، اس کی فرع اعمال ہیں، اعمال کی ادائیگی کے اعتبار سے تین درجے ہیں:

اول: حسب تفصیل فقہ، شرائط کے ساتھ ارکان ادا کر لیے جائیں۔ اس سے آدمی فرض سے سبک دوش ہو جاتا ہے۔ یہ عوام کے لیے ہے۔

دوم: عبادت میں کم از کم یہ تصور ہو کہ معبود ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ خواص کا مقام ہے۔

سوم: عبادت میں یہ حضور شہود ہو، گویا عابد، معبود کو دیکھ رہا ہے۔ یہ اخص الخواص کا مقام ہے۔

عمارہ بن قیقاع کی روایت اور حضرت انس کی حدیث میں "ان تعبداللہ" کے بجائے ان تخشی اللہ ہے۔ اب احسان سے مراد عبادت کا احسان نہیں ہوگا۔ بلکہ اسلام کا احسان ہوگا۔

اب سوال یہ ہوا کہ اسلام کا احسان کیا ہے؟ جواب ارشاد ہوا:

اللہ سے یوں ڈرتے رہو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو یوں ڈرتے رہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

یہاں تخشی اللہ کا مفعول فیہ محذوف ہے، جو عموم کا افادہ کرتا ہے کہ ہر وقت اللہ سے ان دونوں تصور میں سے ایک کے ساتھ ڈرتے رہو۔ خواہ حالت عبادت میں ہو، خواہ کسی حالت میں۔ یہ دوام اپنے دونوں مدارج میں سے کسی ایک درجے میں جسے بھی نصیب ہو جائے اس کے مدارج کا اندازہ کون لگا سکے گا۔" واللہ یختص برحمتہ من یشاء، واللہ ذو الفضل العظیم"

کانک تراہ: میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں بیداری کے ساتھ چشم سر سے دیدار الٰہی ممکن نہیں، ورنہ "کانک تراہ" نہ فرماتے۔ بلکہ یہ فرماتے: یوں عبادت کرو کہ اسے دیکھو۔ اس پر یہ حدیث دلیل ہے کہ فرمایا:

واعلموا انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا

جان لو! موت سے پہلے اپنے رب کا دیدار ہرگز نہ کرو گے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دیدار الٰہی کرنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ یہ احادیث اس کے لیے مخصص ہیں۔ رہ گیا خواب میں، وہ صحابہ کرام، اولیاء کرام کے لیے بھی حاصل ہے۔

حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا:

"رأیت ربی فی سکک المدینۃ"

میں نے اپنے رب کو مدینہ کی گلیوں میں دیکھا۔

اس سے مراد یہی خواب میں دیکھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مدینے کی گلیوں میں رہتے ہوئے میں نے رب کا جلوہ دیکھا۔

حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سو مرتبہ، اور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متعدد بار خواب میں زیارت ہوئی۔

۶۔ عبادت کے معنی:

قاضی بیضاوی علامہ نسفی وغیرہ مفسرین نے عبادت کے یہ معنی بتائے ہیں:

اقصیٰ غایۃ الخضوع والتذلل۔

کسی کے لیے انتہائی حد تک عاجزی وفروتنی کرنا۔

اقصیٰ غایت تذلل عبادت اور اس سے کم درجہ تعظیم ہے، اقصیٰ غایت کی حد کیا ہے؟ اس کا دارومدار نیت پر ہے۔ اس کی قدرے توضیح یہ ہے کہ انسان مختلف اشخاص وہستی کے سامنے تذلل ظاہر کرتا ہے، مثلاً چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے سامنے، بیٹا باپ کے سامنے، شاگرد استاذ کے سامنے، مرید شیخ کے سامنے، امتی نبی کے روبرو، اور ایک عابد معبود کے حضور۔

ہر شخص پر ظاہر ہے کہ تذلل کے یہ سب مدارج یکساں نہیں۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ اقصیٰ غایت تذلل عبادت، اس سے فروتر تعظیم جیسا کہ ہم پہلے بتا آئے کہ اس کا دارومدار نیت پر ہے۔ کسی ہستی کو واجب الوجود اعتقاد کرکے یا واجب الوجود کے خواص ولوازم میں سے کسی ہستی کے لیے ثابت مان کر یا کائنات عالم کی تدبیر میں کسی کے لیے ایسا دخل ماننا کہ اس کے بغیر نظام نہیں چل سکتا یا نفع وضرر پہنچانے یا تخلیق وایجاد میں کسی کو مستقل بالذات ماننا اس معنی کر کہ وہ بے اذنِ الٰہی کے جو چاہے کرے یا تحلیل وتحریم کا اختیار مستقل ماننا یا کسی کی ذات وصفات کو ذاتی مان کر تذلل کرنا غایت تعظیم اور عبادت ہے، اور ان مذکورہ تصورات کے بغیر کسی کے لیے تذلل کرنا عبادت نہیں۔

اور صحیح بات تو یہ ہے کہ عبادت اور تعظیم کی حد فاصل ہر عاقل جانتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے الفاظ کا جامہ پہنانا ذرا مشکل ہے۔ سجدہ ایک فعل ہے، دوزانو بیٹھنا ایک فعل

ہے، یہی کبھی عبادت ہے، کبھی تعظیم۔ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ماں باپ اور بھائیوں نے جو سجدہ کیا یہ تعظیم تھا، اور نماز کا سجدہ عبادت۔ جبرئیل امین خدمت اقدس میں باادب تلمیذ کی طرح دوزانو بیٹھے یہ تعظیم، اور قعدہ میں عبادت، روضہ اقدس کی حاضری کے وقت دست بستہ کھڑا ہونا تعظیم، اور نماز میں عبادت۔ ہر عام حالات میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑے رہتے ہیں یہ نہ تعظیم ہے نہ عبادت۔ اور کسی مقتدائے دینی کے لیے کھڑے ہوگئے یا اس کے سامنے کھڑے ہیں، تو یہ تعظیم اور مالکیہ کے یہاں مطلقاً نماز میں اور احناف وشوافع کے یہاں رکوع کے بعد سجدے سے پہلے کھڑا ہونا عبادت۔

اس لیے ماننا پڑے گا کہ تعظیم وغیرہ عبادت اور غیر عبادت میں سب کو امتیاز آتا ہے۔ البتہ الفاظ کے قالب میں اسے ڈھالنا ذرا متعذر ہے، اور یہ صرف عبادت اور تعظیم ہی کی بات نہیں، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو سب جانتے ہیں مگر اس کی تعریف پوچھو تو کم ہی لوگ بتا پائیں گے۔ مکان وزمان، حرکت سکون کون نہیں جانتا؟ مگر ذرا اس کی تعریف پوچھ کر دیکھو، اور ان کی جو تعریفیں کی جاتی ہیں۔ کتنی آسان ہیں، وہ فلسفے کے معلم اور معلم سے پوچھو۔ آج کل کچھ لوگوں نے عبادت کی تعریف یہ گڑھ لی ہے کسی کو مافوق الفطرۃ قوت کا مالک، اعتقاد کرکے اس کی قربت ونزدیکی حاصل کرنے کے لئے کوئی کام کرنا۔ یہ تعریف نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں، نہ صحابہ سے منقول ہے، نہ علمائے سلف سے، نہ علمائے خلف سے۔ انعامی اعلان کے باوجود آج تک نہیں بتایا گیا، اور نہ قیامت تک کوئی بتا سکتا ہے۔ اور بداہۃ باطل ہے۔ ورنہ لازم کہ ساری امت ہی نہیں، انبیائے کرام، خود اللہ عزوجل، مشرک ہو، وہ یوں کہ بنص قرآنی ثابت کہ انبیائے کرام میں فوق الفطرۃ قوتیں تھیں بلکہ یہ بھی ثابت کہ امتیوں میں بھی تھیں۔ حضرت داؤد کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہونا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے وحوش وطیور وجنات کا تابع ہونا، ہوا کا ان کے قابو میں ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا اور عصا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مٹی کی مورت میں جان ڈالنا، اور مادر زاد اندھے اور برص والے کو شفا دینا، مردے جلانا، حضرت آصف بن برخیا کا سیکڑوں میل کی دوری سے بلقیس کا منوں وزنی تخت پلک جھپکنے کے اندر لانے کی قوت، یہ سب مافوق الفطرۃ

قوتیں ہی تو ہیں، پھر یہ تعریف بالمجہول، فوق الفطرۃ کی تحدید کیا ہے، اس کو کوئی صاحب متعین کردیں، اور تعریف بالمجہول تجہیل محض و باطل۔ اس لئے یہ تعریف من گڑھت ہونے کے ساتھ ساتھ لایعنی بلکہ منجر الی الکفر ہے۔

۷۔ ماالمسئول عنہا باعلم من السائل:

قیامت کے بارے میں جس سے سوال کیا گیا وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ یہاں نفی اسم تفضیل پر داخل ہوئی، جو صرف معنی تفضیل کی نفی کرتی ہے، بالکلیہ مشتق منہ کی نفی نہیں کرتی۔ جس کا مفاد یہ ہوا کہ قیامت کے بارے میں، میں تم سے زیادہ نہیں جانتا جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ قیامت کے بارے میں جتنا تم جانتے ہو اتنا میں بھی جانتا ہوں، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قیامت کا علم نہ تجھے ہے، نہ مجھے، بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے علم میں ہم اور تم برابر ہیں۔ اس قدر پر علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامہ بدرالدین عینی دونوں شارحین کا اتفاق ہے کہ یہ تساوی فی العلم پر دلالت کرتا ہے۔

عینی میں ہے:

مشعرۃ بوقوع الاشتراک فی العلم، والنفی توجہ الی الزیادۃ فیلزم ان یکون معناہ انہما متساویان فی العلم بہ. (ص: ۲۹۳ ج: ۱)

یہ علم میں اشتراک کو بتارہا ہے، اور نفی زیادت کی طرف متوجہ ہے، اس لئے لازم ہے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ دونوں اس کو جاننے میں برابر ہیں کہ قیامت کب آئے گی۔

اس سے صاف ظاہر ہوگیا۔ قیامت کب آئے گی، یہ جبرئیل بھی جانتے تھے، اور حضور اقدس ﷺ بھی جانتے تھے، اس پر قرینہ تو یہ ہی نہیں بلکہ بڑی مضبوط دلیل ابو فروہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں:

فنکس فلم یجبہ ثم اعاد فلم یجبہ ثلاثا ثم رفع راسہ و قال ما المسئول عنہا. الحدیث (فتح الباری: ۱/۱۱۲. عینی: ۱/۲۸۴)

اس سوال پر حضور نے سر جھکا لیا کوئی جواب نہیں دیا، تین بار یہی ہوا، تو سر اقدس اٹھایا، اور فرمایا: مسئول عنہا سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔

اگر حضور اقدس ﷺ کو قیامت کا علم نہ تھا، اور اس جملے کا یہی مطلب ہے کہ تمہاری طرح میں بھی نہیں جانتا تو دیگر سوالات کے جوابوں کی طرح بلا توقف کیوں نہیں فرمادیا اتنے غور کی کیا حاجت تھی کہ انہیں تین بار سوال دہرانا پڑا۔ بات صاف ہے کہ اگر بالکل نہ جانتے ہوتے تو بلا توقف فرمادیا ہوتا، لیکن بات یہ نہیں، جانتے تھے مگر بتانے کی اجازت نہ تھی تو اگر فرماتے کہ میں نہیں بتاؤں گا تو جو اس سوال سے مقصود تھا وہ حاصل نہ ہوتا۔ اور اگر فرماتے کہ میں نہیں جانتا تو جھوٹ ہوتا، اس لئے غور فرما کر ایسا جواب دیا کہ نکتہ شناس سمجھ جائیں اور راز، راز رہے۔

اس سوال کی وجہ علامہ قرطبی نے یہ بتائی ہے:

المقصود من هذا السوال كف السامعين عن السوال عن وقت الساعة لانهم كانوا اقد اكثر والسوال عنها فلما حصل الجواب بما ذكر حصل الياس من معرفتها. (عینی: ج.١ ص ٢٩١)

اس سے مقصود سامعین کو قیامت کے وقت کے بارے میں سوال سے روکنا تھا کیوں کہ اکثر لوگ اس کے بارے میں سوال کرتے تھے، جب یہ جواب مل گیا تو سامعین کو اس کے جاننے سے مایوسی ہوگئی۔

اور اگر بالفرض یہی مراد لے لیا جائے کہ نہ جاننے میں مساوات مراد ہے، تو اس حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ اس وقت نہیں جانتے تھے، یہ اہل سنت کے عقیدے کے معارض نہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ نزول قرآن کی تکمیل کے ساتھ جمیع ما کان و ما یکون حتی کی غیوب خمسہ کا بھی علم آپ کو عطا فرمایا گیا۔ اس لئے تکمیل قرآن کے پہلے اگر کچھ غیوب آپ پر مخفی رہے تو یہ اس عقیدے کے معارض نہیں، اس پر کوئی دلیل نہیں کہ یہ حدیث تکمیل قرآن کے بعد کی ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ علم غیب کے سلسلے میں دو مرتبے ہیں: ایک یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ غیب جانتے تھے یعنی قدر معتد بہ۔ یہ ابتدا ہی سے ہے۔ اس لئے کہ نبی کے معنی ہیں غیب کی خبر دینے والے کے۔ المنجد میں ہے:

النبوة الاخبار عن الغیب او المستقبل بالھام اللہ .النبی المخبر عن الغیب او المستقبل بالھام اللہ .(المنجد ۷۸۴)

اس کے ترجمے مصباح اللغات میں ہے، جوایک فاضل دیوبندی کا ہے، اللہ کے الہام سے غیب کی خبریں بتانے والا، آئندہ کی پیشن گوئی کرنے والا۔ علاوہ ازیں نبی کے خواص لازمہ میں غیب دانی ہے۔'

علامہ عبدالباقی زرقانی علی المواہب میں لکھتے ہیں:

قال الغزالی:النبوة عبارة عما یختص بالبی و یفارق به غیره و هو یختص بانواع من الخواص ،احدها:انه یعرف حقائق الامور المتعلقة بالله و صفاته و ملائکته والدار الآخرة علما مخالفا لعلم غیره بکثرة المعلومات و زیادة الکشف و التحقیق .و ثانیها:ان له فی نفسه صفة بهاتتم الافعال الخارقة للعادة کما ان لنا صفة تتم بها الحرکات المقرونة بارادتنا وهی القدرة.و ثالثها:ان له صفة بها یبصر الملائکة و یشاهدهم کما ان للبصیر صفة بها یفارق الاعمیٰ.رابعها:انه له صفة بها یدرک ماسیکون فی الغیب.(۱/۲۰/۱۹)

نبوت وہ وصف ہے جو نبی کے ساتھ خاص ہے جس کی وجہ سے غیر سے ممتاز ہوتا ہے۔ نبی چندقسم کے خواص کے ساتھ مختص ہوتا ہے، اول یہ کہ نبی اللہ عزوجل اور اس کی صفات اور فرشتوں اور دار آخرت سے متعلق امور کی حقیقت جانتا ہے۔کثرت معلومات کشف وتحقیق کی زیادتی کی وجہ سے نبی کا یہ علم دوسروں کے علم سے ممتاز ہوتا ہے۔ثانی: نبی میں ایک صفت (قوت) ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ معجزات دکھا تا ہے، جیسے ہمیں یہ قوت ہے کہ ہم اپنے ارادے سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، یہی قدرت ہے۔ثالث: نبی میں ایک قوت ہوتی ہے جس سے وہ فرشتوں کو دیکھتا ہے، جیسے بینا کے اندر ایک قوت ہے، جس کی وجہ سے وہ اندھے سے علاحدہ ہے۔رابع: اسے ایک ایسی قوت ہوتی ہے، جس سے یہ جان لیا کرتا ہے کہ غیب میں کیا ہوگا۔

اسی لیے نبی اس وقت تک نبی نہ ہوگا جب تک غیب داں نہ ہو،اسے غیب دانی پر قدرت نہ ہو۔اس مرتبے میں جمیع ماکان و ما یکون کا علم داخل نہیں ۔قدر معتد بہ لازم ہے جیسے ہر مسلمان کو دینی باتوں کا علم ہے،مگر ہر مسلمان عالم نہیں کہلاتا۔عالم وہ ہے جو دین کے معتد بہ علم سے مشرف ہو،اس درجہ میں دس بیس بلکہ سو دو سو باتوں کا نہ جاننا عالم ہونے کی منافی نہیں ۔سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے بھی بعض سوالوں کے جواب میں فرمایا:لا ادری، میں نہیں جانتا۔حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کتنے سوالوں کے جواب میں فرمایا:لا ادری.

اسی طرح جب نبی علم غیب قدر معتد بہ جانتا ہے، بلکہ اسے یہ قوت ہے کہ غیب جان لیا کرے تو دس بیس یا بالفرض سو دو سو غیب کی باتوں پر اگر اطلاع اس درجے میں نہ ہوئی،تو یہ نبی کے ’’غیب داں‘‘ ہونے کے منافی نہیں،جیسے سیدنا امام اعظم اور امام مالک کا چند مسائل کا نہ جاننا ان کے امام اعظم اور امام مجتہد ہونے کے منافی نہیں۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے،جمیع ماکان و ما یکون اور علوم خمسہ بشمول علم قیامت جاننے کا۔یہ مرتبہ حضور اقدس ﷺ کو نزول قرآن کی تکمیل کے ساتھ حاصل ہوا۔تکمیل قرآن کے بعد کوئی ایسا واقعہ نہیں جو اس دعویٰ کے منافی ہو۔

جب حدیث جبرئیل کے بارے میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ نزول قرآن کی تمامیت کے بعد کی ہے تو یہ حدیث اہل سنت کے عقیدے کے مزاحم نہیں ۔

رہ گیا اس کا ثبوت کہ حضور اقدس ﷺ کو قیام قیامت کا علم تھا،اس کے لئے الدولۃ المکیہ ،الفیوض الملکیہ ،الکلمۃ العلیا کا مطالعہ کریں ۔سر دست صرف علامہ ابراہیم بیجوری قدس سرہ کے شرح قصیدہ بردہ کی ایک عبارت پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

ولم یخرج صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من الدنیا الا بعد ان اعلمہ اللہ تعالیٰ بھذہ الامور الخمسہ.(۷۴)

اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا سے تشریف نہیں لے گئے،مگر اس کے بعد کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان پانچوں باتوں کا علم عطا فرمادیا۔

(علامات قیامت)

۸۔علامت قیامت کثیر ہیں مگر اس حدیث میں صرف تین بیان فرمائیں۔

اول: لونڈی اپنے آقا کو جنے گی۔

اس حدیث میں رَبَّتَھَا کا لفظ آیا ہے۔یہ رَبّ کی تانیث ہے،رب کے معنی پالنے والے ہیں۔اضافت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر پالنے والے پر آتا ہے۔قرآن مجید میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے فرمایا:

اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ. (یوسف : آیت ۲۳)

یہ تو میری پرورش کرنے والا ہے اس نے مجھ کو اچھی طرح رکھا۔

عرف میں اس کے معنی آقا اور مالک کے بھی آتے ہیں۔بیع سلم میں رب المال لفظ عام ہے۔اس حدیث میں آقا ہی کے معنی میں ہے۔بلا اضافت رب کا اطلاق اللہ عزوجل کے علاوہ دوسرے پر جائز نہیں،بلکہ کفر ہے۔غیر خدا پر اضافت کے ساتھ اس کا اطلاق یہ عربی کے ساتھ خاص ہے۔ہمارے عرف میں اضافت کے ساتھ بھی غیر خدا پر اس کا اطلاق جائز نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ روسا و معززین بلکہ بادشاہان وقت بھی لونڈیوں کو بیبیوں کی طرح رکھیں گے،ان سے اولاد ہوگی،یہ اولاد اپنی ان ماؤں کے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے،جو آقا لونڈی کے ساتھ کرتا ہے،بلکہ بادشاہ وقت کی لونڈی کے بطن سے جو اولاد ہوگی ان میں بادشاہ ہوں گے،اور یہ مائیں ان کا رعایا۔

یا مراد یہ ہے کہ لونڈیوں کی بہت زیادہ کثرت ہوگی۔خدا ناترس لوگ ام ولد کو بھی بیچ ڈالیں گے،اور وہ پھر دست بدست بکتی ہوئی اپنی اولاد کی ملکیت ہوگی۔

یہ دونوں علامتیں ظاہر ہوچکیں،شاہان بنی عباس میں سوائے امین کے سب لونڈی زادے تھے۔

یا یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ لوگ اپنی حقیقی ماں کے ساتھ لونڈی جیسا برتاؤ کریں گے۔ ماں کو لونڈیوں کی طرح رکھیں گے۔ ان کی حق تلفی، نافرمانی کریں گے، ایذا پہنچائیں گے، یعنی اولاد اپنی ماں کے ساتھ آقا کی طرح برتاؤ کرے گی۔ یہ تاویل مذکورہ متن پر بالکل چسپاں ہے کہ فرمایا:

عورت اپنے آقا کو جنے گی۔

یہ اس طرح کہ عورت کا لفظ عام ہے۔ آزاد اور لونڈی دونوں کو، بلکہ عربی میں امرأة لفظ قریب قریب آزاد عورت کے ساتھ خاص ہے۔

یہاں حدیث دو لفظوں کے ساتھ مروی ہے۔ رَبَّهَا اور رَبَّتَهَا، رَبَّتَهَا کے معنی مالکہ کے ہیں، اس کا بھی وہی حاصل کچھ مبالغہ کے ساتھ، لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے ماں کی زیادہ اطاعت شعار ہوتی ہیں۔ اب حدیث کا یہ مفہوم ہوا کہ لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں اپنی ماؤں کے ساتھ مالکہ جیسا برتاؤ کریں گی۔

دوم: ننگے بدن ننگے پاؤں رہنے والے، گونگے، بہرے، سردار اور حکمراں ہوں گے۔

سوم: بھیک منگے کالے اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے محل میں فخر کریں گے۔

آج جو دنیا کا حال ہے۔ اس کو دیکھو! چودہ سو برس کی یہ غیب کی خبر کس طرح حرف بحرف ثابت ہو رہی ہے۔

علوم خمسہ کی بحث

۹۔ ارشاد فرمایا: قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں ہے، جنہیں اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ سورۂ لقمان کی اس آیت میں ہے۔

بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔ اور وہ بارش برساتا ہے، اور مادہ کے پیٹ میں کیا ہے، جانتا ہے، کل کیا ہوگا، کوئی نہیں جانتا، اور کوئی اپنے اٹکل سے نہیں جانتا کہ کہاں مرے گا، بے شک اللہ جاننے والا بتانے والا ہے۔

اب یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے یہ علوم خمسہ اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بتائے یا نہیں۔ احادیث میں بکثرت ایسے واقعات ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان باتوں کی خبر دی۔

حضرت امام حسن کی ولادت سے پہلے، حضرت عباس کی اہلیہ ام الفضل سے فرمایا۔ فاطمہ کے ایک بچہ ہوگا، اس کی پرورش تم کروگی۔

جنگ بدر کے ایک دن قبل فرمایا: یہ فلاں کے مرنے کی جگہ ہے، یہ فلاں کے مرنے کی جگہ ہے، ویسا ہی ہوا۔

جنگ احزاب کے خاتمہ پر فرمایا: اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے، وہ ہم پر حملہ نہیں کر سکتے۔

جنگ خیبر کے موقع پر فرمایا: کل جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ و رسول اس سے محبت کرتے ہیں اللہ اس کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائے گا۔ دوسرے دن جھنڈا حضرت علی کو دیا، اور فتح حاصل ہوئی۔

فتح مکہ سے پہلے حضرت علی اور حضرت زبیر کو بھیجا کہ خاخ، تک چلے جاؤ وہاں ایک عورت ملے گی اس کے پاس خط ہے، اسے مع خط پکڑ کر لاؤ۔

ایک حدیث میں ہے کہ فرمایا: جب سب لوگ مرجائیں گے، بارش ہوگی۔ جس سے سب کے جسم اپنی حالت پر ہوجائیں گے۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی وفات اور مدفن کی خبر دی، فرمایا:

عسیٰ ان لاتلقانی بعد عامی هذا لعلک ان تمر بمسجدی وقبری.

اس سال کے بعد مجھ سے تمہاری ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اب تم میری مسجد اور میری قبر سے گزرو گے۔

تو جب ان علوم خمسہ میں سے اتنے امور کو حضور جانتے تھے، تو معلوم ہوا کہ حدیث کے اس ارشاد اور آیہ کریمہ میں حصر صرف علم ذاتی واجب قدیم غیر مخلوق ممتنع الزوال کے اعتبار سے ہے یعنی ان چیزوں کا علم ذاتی ازلی واجب قدیم صرف اللہ عزوجل کو ہے، ان چیزوں کا

علم ذاتی ازلی واجب قدیم اللہ عزوجل کے سوا کسی کو نہیں۔

رہ گیا علم عطائی حادث ممکن، یہ نہ اللہ عزوجل کی صفت اور نہ شرعاً عقلاً جائز کہ ان امور کا علم بلکہ مطلق علم بلکہ باری عزاسمہ کی کوئی صفت، عطائی حادث ممکن ہو، اس پر اجماع امت کہ جو شخص باری تعالیٰ کی کسی بھی صفت کو عطائی یا حادث یا ممکن مانے وہ کافر، تو پھر یہ کہنا کہ علم عطائی حادث ممکن بھی باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اپنے ایمان سے ہاتھ دھونا ہے۔

اس کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہم پوچھتے ہیں کہ "فی خمس لا یعلمهن الا اللہ" اور آیہ کریمہ "اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" میں علم سے مراد علم ذاتی واجب قدیم ہے، یا علم عطائی حادث ممکن یا مطلق علم۔ اب اگر کہیں کہ علم عطائی حادث مراد ہے تو لازم کہ باری تعالیٰ کا علم، عطائی حادث ممکن ہو، اور یہ کفر بلکہ مجموعہ کفریات، اور اگر کہیں کہ مطلق علم مراد ہے، خواہ ذاتی واجب قدیم، خواہ عطائی حادث ممکن۔ تو بھی محذور مذکور اپنی جگہ، کہ پھر بھی لازم آئے گا کہ باری تعالیٰ کا کچھ علم عطائی حادث ممکن ہے، اور اللہ عزوجل کی کسی بھی صفت کو عطائی حادث ممکن ماننا بالاتفاق کفر ہے۔

اس لیے شق اول متعین کہ مراد یہ ہے کہ ان چیزوں کا علم ذاتی قدیم واجب باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، ان چیزوں کا علم ذاتی واجب قدیم اللہ عزوجل کے سوا کسی کو نہیں۔

ہم اہل سنت، انبیائے کرام یا ان کے توسط سے اولیائے کرام کے لیے ان علوم خمسہ کا یا دیگر غیوب کا علم مانتے ہیں تو بعطائے الٰہی مانتے ہیں، ان کے علم کو علم عطائی حادث ممکن مانتے ہیں، ہماری اس تقریر کی تائید میں چند علمائے معتمدین کے ارشادات سنیے۔

اشعۃ اللمعات میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

مراد آنست کہ بے تعلیم الٰہی بحساب عقل کس ایں ہارا نداند، از امور غیب اند کہ جز خدا، کسے آں را نداند، مگر آنکہ وے تعالیٰ از نزد خود کسے را بوحی والہام بدانا ند

مراد یہ ہے کہ ان امور غیبیہ کو اللہ عزوجل کے بتائے بغیر عقل کے حساب سے کوئی نہیں جانتا، سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ وحی یا الہام کے ذریعہ بتادے۔

عارف باللہ ملا احمد جیون، استاذ، سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر قدس سرہما

نے تفسیرات احمدیہ میں فرمایا:

ولک ان تقول ان علم هذه الخمسة وان کان لا یعلمه الا الله . لکن یجوز ان یعلمها من یشاء من محبیه واولیائه بقرینة قوله تعالیٰ ان الله علیم خبیر . علیٰ ان یکون الخبیر بمعنی المخبر . (٤٠٥)

تم کو چاہیے کہ یہ کہو ان پانچوں کا علم صرف اللہ کو ہے، لیکن جائز ہے کہ اللہ عزوجل اپنے محبین اولیا میں سے جسے چاہے بتادے اس پر قرینہ اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے، بے شک اللہ جاننے والا بتانے والا ہے۔ اس طرح کہ خبیر معنی میں مخبر کے ہے۔

تفسیر صاوی میں ہے:

ای من حیث ذاتها، واما باعلام الله العبد فلامانع منه کالانبیاء وبعض الاولیاء قال تعالیٰ : وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ . وقال تعالیٰ : عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ . قال العلماء : الحق انه لم یخرج نبینا من الدنیا حتی اطلعه الله تعالیٰ : (٣/٣٦٠)

یہاں مراد علم ذاتی ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو عطا فرمائے، اس سے کچھ مانع نہیں جیسے انبیاء، اولیاء اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ کے علم میں سے لوگ اتنا ہی پاتے ہیں جتنا وہ چاہتا ہے۔ اور فرمایا: عالم الغیب اپنے پسندیدہ رسولوں کے سوا کسی کو اپنے غیب پر مسلط نہیں فرماتا، علماء نے فرمایا حق یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا سے تشریف نہیں لے گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مطلع فرمادیا (ان پانچوں پر بھی)

بحث کے اختتام پر بخاری کے شارحین جلیلین اجلین، علامہ عینی وعلامہ عسقلانی کے ارشاد کو جو انہوں نے اسی حدیث جبرئیل کے تحت ارقام فرمائے ہیں، ہدیہ ناظرین کرتے ہوئے، رخصت ہوتا ہوں۔

فمن ادعی علم شیء منها غیر مسند الیٰ رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم کان کاذبا فی دعواه . (عینی :٧/٣٣٧-فتح البلاری:١/١١٤)

جو شخص حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیے بغیر ان پانچ چیزوں

سے کسی ایک کا دعویٰ کرے (کہ میں جانتا ہوں) وہ جھوٹا ہے۔

یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے ان پانچوں میں سے سب کا یا کسی ایک کا مثلاً قیام قیامت کا علم، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بلا واسطہ حاصل ہے، وہ جھوٹا ہے، اس کا صاف صاف مطلب یہ نکلا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے ان پانچوں کا علم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے واسطے سے ان کے بتانے سے حاصل ہوا، وہ سچا ہے۔ اس سے صاف ظاہر کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان پانچ چیزوں کا جن میں قیام قیامت کا وقت بھی داخل ہے، حاصل ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل کی ہر صفت ذاتی واجب قدیم ہے، پھر اس آیت میں پانچ کی تخصیص کیوں ہے، اس کا ایک جواب تو ملا احمد جیون قدس سرہ نے دیا ہے۔

(الف): فائدته ان هذه الخمسة معظم الغيوبات و مفاتيحها فانه ان وقف مثلا على ما فى غد وقف على موت زيد وتولد عمرو وفتح بكر ومقهورية خالد وقدوم بشر وغير ذٰلك مما فى الغد وهكذا القياس.

(تفسیرات احمدیہ: ٤٠٥)

اس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ معظم غیوب اور ان کی کنجیاں ہیں اس لیے کہ مثلاً اگر کوئی یہ جان گیا کہ کل کیا ہوگا (تو وہ کل رونما ہونے والی ساری باتوں کو) مثلاً زید کی موت، عمرو کی پیدائش، بکر کی فتح، خالد کی مغلوبیت، بشر کی آمد وغیرہ کو جان جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی اہمیت کی وجہ سے ان پانچوں کو خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا۔

(ب): دوسری وجہ ان پانچ چیزوں میں علم قیامت بھی ہے، اوپر گزر چکا، علم قیامت کے بارے میں بکثرت سوالات ہوتے تھے، اور خود جبرئیل امین نے قیامت کے بارے میں سوال کیا اس لیے اس کی تخصیص فرمائی۔

(ج): عرب کے کاہن، نجومی، علم مافی الغد وغیرہ جاننے کے مدعی تھے، ان کی تکذیب کے لیے بالخصوص ان کو ذکر فرمایا۔

☆ بعض منکرین علم رسول نے ذاتی اور عطائی کی تقسیم کو تدقیقات فلسفیانہ کہہ کر مسترد کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

اس پر گذارش ہے کہ اگر اس فرق کو تسلیم نہ کیا جائے تو قرآن مجید، احادیث کریمہ میں اتنا زبردست تعارض پڑے گا کہ اٹھائے نہ اٹھے گا۔

مثلاً ارشاد ہے:

قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ (نمل:٦٥)

اور فرمایا: فرمادو کہ زمین وآسمان کے رہنے والوں میں کوئی غیب نہیں جانتا ہے سوائے اللہ کے۔

مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطْلِعَکُمْ عَلَی الْغَیْبِ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (سورۂ آل عمران: آیت ١٧٩)

اللہ کی یہ شان نہیں (اے عام لوگو!) کہ تمہیں علم غیب دے دے۔ ہاں! اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے اس کے لیے چن لیتا ہے۔

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ۔
(سورۂ جن: آیت ٢٦)

عالم الغیب اپنے علم غیب پر اپنے پسندیدہ رسولوں کے سوا کسی کو مسلط نہیں فرماتا۔

بولیے! اس تعارض کا کیا جواب ہے۔ علاوہ ازیں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (سورہ توبہ: آیت ١٢٨)

مسلمانوں پر بہت مہربان، رحم فرمانے والے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بارے میں فرمایا:

اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (سورۂ یوسف: آیت ٥٥)

میں حفاظت کرنے والا، علم والا ہوں۔

انسان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

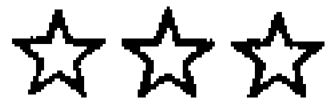
فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (سورۂ دھر: آیت ۲)

اور خود قرآن مجید میں اللہ عزوجل نے اپنے آپ کو رؤف، رحیم، حفیظ، علیم، سمیع، بصیر فرمایا، اس تعارض کا کیا جواب ہوگا۔

اس لیے اس فرق کو ماننا ناگزیر ہے کہ اللہ عزوجل کی ہر صفت ذاتی، واجب، قدیم، غیر متناہی غیر مخلوق، اور انبیاء و اولیاء اور تمام مخلوقات کی ہر صفت عطائی حادث ممکن متناہی مخلوق۔ اور یہی فرق علم غیب میں بھی ہے۔ آیات نفی میں مراد علم ذاتی، قدیم، واجب غیر متناہی غیر مخلوق۔ اور آیات اثبات میں علم عطائی ممکن حادث متناہی مخلوق۔

اس بحث کو اگر بتمام دیکھنا ہو تو "الدولة المکية، الفيوض الملکية، خالص الاعتقاد، ادخال السنان، الکلمة العليا" کا مطالعہ کریں۔ اس حدیث پر کلام کچھ تفصیلی ہو گیا۔ ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم



حضرت عائشہ کی پاکدامنی اور حدیث اِفک

اس بحث سے پہلے حضور شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان نے بخاری شریف کی حدیث افک کا متن وعن ترجمہ ذکر فرمایا ہے، پھر اسی کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے مخالفین کی ریشہ دوانیوں کی ایسی بیخ کنی کی ہے، جس سے سارے مخالفین دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اب مضمون ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی کہ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج کے بارے میں قرعہ ڈالتے، جن کے نام قرعہ نکلتا انہیں ہمراہ لے جاتے۔ ایک غزوہ کے موقع پر قرعہ ڈالا تو میرا نام نکلا میں حضور کے ساتھ گئی۔ یہ واقعہ آیت حجاب کے نازل ہونے کے بعد کا ہے، میں ہودج ہی میں رہتی اور مجھے سوار کرایا جاتا اور سواری سے اتارا جاتا۔ ہم چلے، جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس غزوہ سے فارغ ہو کر لوٹ رہے تھے۔ جب ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو ایک رات کوچ کرنے کے لیے اعلان فرمایا، کوچ کے اعلان کے بعد میں اٹھی اور قضائے حاجت کے لیے لشکر کے باہر چلی گئی، رفع حاجت کر کے جب میں واپس ہوئی اور کجاوہ کے قریب پہنچی تو اپنے سینے کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ میرا ہار ٹوٹ کر گر گیا ہے، جو جزع اظفار کا تھا، اس لیے میں لوٹی اور ہار تلاش کرنے لگی۔ اس کی تلاش میں دیر ہو گئی۔ اس درمیان وہ لوگ آئے جو میرا ہودج اٹھانے اور باندھنے پر مامور تھے، تو ان لوگوں نے میرا ہودج اٹھا کر اس اونٹ پر باندھ دیا جس پر میں سوار ہوئی تھی، ان کا گمان یہ تھا کہ میں ہودج میں ہوں۔ اس وقت عورتیں دبلی ہلکی تھیں، بھاری بدن نہ تھیں۔ ان پر گوشت نہیں چڑھا تھا کیوں کہ کھانا تھوڑی مقدار میں کھاتی تھیں۔ اس لیے ہودج اٹھانے والوں کو ہودج کے وزن کی کمی کا احساس نہ ہوا، اور انہوں نے ہودج اٹھا لیا، اور میں اس وقت نوعمر بچی تھی۔ ان لوگوں نے اونٹ اٹھایا اور چل

دیئے لشکر کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنا ہار پایا، اور میں ان کی قیام گاہ پر آئی تو وہاں کسی کو نہیں پایا میں بالقصد وہیں آ گئی جہاں ٹھہری تھی۔ میں نے سوچا کہ جب لوگ مجھے ہودج میں نہیں پائیں گے تو یہیں لوٹ کر تلاش کے لیے آئیں گے۔ میں بیٹھی تھی کہ مجھ پر نیند غالب آ گئی اور میں سو گئی، اور صفوان بن معطل سلمی ذکوانی لشکر کے پیچھے تھے، صبح کے وقت میرے قیام کی جگہ پہنچے تو ایک سونے والے انسان کو دیکھا وہ میرے قریب آئے انہوں نے آیت حجاب نازل ہونے سے پہلے مجھے دیکھا تھا، میں ان کے "اِنَّا لِلّٰہِ" پڑھنے سے جاگ گئی۔ انہوں نے اپنا اونٹ بیٹھا کر اس کے اگلے پاؤں کو دبائے رکھا، یہاں تک کہ میں سوار ہو گئی۔ اب وہ پیدل چلے اور میری سواری کی مہار پکڑ کر آگے آگے چلتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم لشکر میں اس وقت پہنچے جب کہ وہ لوگ عین ظہر کے وقت منزل کر چکے تھے۔ اس کے بعد جسے ہلاک ہونا تھا وہ ہلاک ہوا، اور افترا پردازی کرنے والوں کا امیر کارواں عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ ہم مدینہ آئے تو میں ایک مہینہ تک علیل رہی، اور بہتان طرازوں کی باتیں لوگوں میں پھیلتی رہیں۔ دورانِ علالت اس بات سے مجھے کچھ شبہہ ہوتا کہ ان دنوں میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب سے وہ مہربانی نہیں دیکھتی تھی جو اور علالت کے دنوں میں دیکھا کرتی تھی۔ بس اتنا ہوتا کہ حضور تشریف لاتے اور سلام کرتے۔ پھر دریافت فرماتے، کیسی ہو؟ اور مجھے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں ہوئی۔ بیماری کی وجہ سے میں کمزور ہو گئی۔ میں اور ام مسطح قضائے حاجت کے لیے میدان میں جانے کے لیے نکلی، ہم صرف رات ہی رات کو نکلتی تھیں، گھروں کے قریب بیت الخلاء بنائے جانے سے پہلے۔ ہمارا طریقہ پہلے عرب والوں کا طریقہ تھا کہ میدان میں جاتے تھے۔ میں اور ام مسطح بنت ابو رہم نکلے اور چل رہے تھے، ام مسطح اپنی چادر میں الجھ کر گر پڑی۔ اس نے کہا: مسطح ہلاک ہو جائے! میں نے اس سے کہا: تم نے بری بات کہی ہے۔ بدر میں شریک ہونے والے مجاہد کو برا کہتی ہے۔ تو اس نے کہا: اے حضور! کیا آپ نے وہ نہیں سنا جو وہ لوگ کہہ رہے ہیں؟ اب اس نے افترا پردازوں کی بات بتائی، تو بیماری پر میری بیماری اور بڑھ گئی۔ جب لوٹ کر گھر آئی اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: تم کیسی ہو؟ میں نے عرض کیا:

مجھے اجازت دیں کہ اپنے والدین کے گھر جاؤں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے والدین سے اس خبر کی تحقیق کروں مجھے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمادی، اس کے بعد میں اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ میں نے اپنی والدہ سے دریافت کیا: لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے بتایا اے بیٹی! اس سے اثر نہ لو بخدا! جب کوئی عورت خوبصورت ہو اور شوہر اس سے محبت کرتا ہو اور اس کی سوکنیں ہوں تو اس کے بارے میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ میں نے کہا: سبحان اللہ، لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں، اس رات کو صبح تک نہ میرا آنسو تھمتا تھا اور نہ نیند آتی تھی۔ اس کی صبح کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب اور اسامہ بن زید کو بلایا جب کہ وحی آنے میں تاخیر ہوگئی۔ ان لوگوں کو اس لیے بلایا تھا کہ اپنی اہل سے جدائی کے بارے میں مشورہ فرمائیں۔ اسامہ چوں کہ ازواج مطہرات کے ساتھ حضور کی محبت کو جانتے تھے، اس لیے اس کے مطابق اشارہ کیا، اور عرض کیا: یہ آپ کی اہل ہیں یا رسول اللہ خدا کی قسم! ان کے بارے میں اچھائی کے سوا ہم اور کچھ نہیں جانتے۔ اور حضرت علی بن ابو طالب نے یہ عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ آپ کو ضیق میں ہرگز نہیں ڈالے گا۔ اور عورتیں ان کے سوا بہت ہیں، اور حضور کنیز سے دریافت فرمالیں وہ سچی بات بتادے گی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بریرہ کو بلایا، اور دریافت فرمایا، اے بریرہ! کیا تو نے ان میں کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو تجھے شبہے میں ڈالے؟ بریرہ نے عرض کی قسم ہے اس ذات کی جس نے حضور کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں نے ان میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی ہے، جو قابل اعتراض ہو، سوائے اس کے کہ وہ نو عمر ہیں۔ آٹا گوندکر سو جاتی ہیں اور بکری کھا جاتی ہے۔ اس کے بعد اس دن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور عبد اللہ بن ابی سلول کے مقابلے مدد کے خواستگار ہوئے اور فرمایا: اس شخص کے مقابلے میں میری کون مدد کرے گا، میری رفیقہ حیات کے بارے میں جس کی اذیت ناک باتیں مجھ تک پہنچی ہیں۔ خدا کی قسم! میں اپنی اہل کے بارے میں اچھائی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اور لوگوں نے ایسے شخص کا نام لیا ہے جس کے بارے میں بھی اچھائی کے سوا اور کچھ نہیں جانتا، اور میرے گھر میں جب بھی جاتا ہے میرے ساتھ جاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت

سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں ان کے مقابلے میں حضور کی مدد کروں گا، اگر وہ آدمی اوس سے ہے تو ہم اس کی گردن اڑا دیں گے اور اگر ہمارے بھائیوں خزرج میں سے ہے تو ہمیں حکم دیجئے ہم آپ کے مطابق عمل کریں۔ یہ سن کر سعد بن عبادہ کھڑے ہوگئے اور وہ خزرج کے سردار تھے، اس کے پہلے وہ نیک انسان تھے، اس وقت پاس داری نے انہیں مشتعل کردیا، انہوں نے کہا تو نے غلط کہا۔ بخدا! نہ تو اسے قتل کرسکتا ہے اور نہ اس کی قدرت رکھتا ہے اب اسید بن حضیر کھڑے ہوگئے اور کہا: تو نے غلط کہا، بخدا! ہم اسے قتل کردیں گے، تو منافق ہے اور منافقین کی پاسداری میں لڑتا ہے۔ اب اوس وخزرج کے دونوں قبیلے مشتعل ہوگئے، اور لڑنے پر تل گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما رہے۔ آپ نیچے تشریف لائے اور حاضرین کو ٹھنڈا کیا، یہاں تک کہ وہ لوگ خاموش ہوگئے، اور حضور بھی خاموش ہوگئے۔ ام المومنین نے فرمایا: اور میں دن بھر روتی نہ آنسو تھمتا تھا اور نہ نیند آتی تھی۔ میں اپنے والدین کے یہاں رات بھر اور دن بھر روئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گریہ میرے جگر کو پھاڑ دے گی، میں اپنے والدین کے یہاں بیٹھی رو رہی تھی کہ انصار کی ایک خاتون نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، میں نے اجازت دے دی، وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئیں اور میرے ساتھ رونے لگیں، ہم اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے اور بیٹھ گئے، جس دن سے یہ افواہ پھیلی تھی، آج تک کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے اور ایک مہینے تک میرے بارے میں وحی کا نزول رکا رہا۔ حضور نے بیٹھنے کے بعد شہادتین پڑھا پھر فرمایا: اے عائشہ! تیرے بارے میں میرے پاس ایسی ایسی بات پہنچی ہے، اگر تو بری ہے تو بہت جلد اللہ تیری براءت بیان فرمائے گا، اور اگر بالفرض تو گناہ سے آلودہ ہے تو اللہ سے استغفار کر اور اس کی طرف رجوع کر، کیوں کہ بندہ جب گناہ کا اعتراف کرکے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی بات پوری فرما چکے تو میرا آنسو تھم گیا، یہاں تک کہ ایک قطرہ بھی محسوس نہیں ہوا۔ میں نے اپنے والد ماجد سے عرض کیا کہ میری طرف سے آپ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جواب دیں، انہوں نے فرمایا: بخدا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کی خدمت میں کیا عرض کروں۔ پھر میں نے اپنی والدہ سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جواب دیں، انہوں نے بھی وہی کہا بخدا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کیا عرض کروں، اب میں نے عرض کیا اور میں نوعمر بچی تھی ابھی بہت زیادہ قرآن بھی نہیں پڑھا تھا، میں نے عرض کیا میرے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ آپ حضرات نے وہ سب سن لیا ہے جو لوگ کہتے پھر رہے ہیں۔ اور وہ آپ حضرات کے دل میں بیٹھ چکی ہے اور آپ حضرات نے اسے سچ سمجھ لیا ہے۔ اب اگر میں یہ کہتی ہوں کہ میں اس سے بری ہوں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے ضرور بلا شبہہ بری ہوں، تو آپ حضرات مجھے سچا نہیں جانیں گے۔ اور اگر میں اس بات کا اعتراف کرلوں حالاں کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ حضرات مجھے سچا مان لیں گے۔ بخدا! میں اپنی اور آپ حضرات کی مثل یوسف کے والد کے علاوہ اور کوئی نہیں پاتی جب کہ انہوں نے فرمایا تھا: پس اچھا صبر ہی خوب ہے۔ ان باتوں پر جو تم بیان کرتے ہو اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اپنے بچھونے پر کروٹ لی، اور میں امید کرتی تھی کہ اللہ میری براءت بیان فرمائے گا مگر بخدا! میں یہ گمان نہیں کرتی تھیں کہ میرے بارے میں وحی نازل ہوگی۔ اور میں اپنے آپ کو اس رتبے کا نہیں جانتی تھی کہ میرے بارے میں قرآن کلام فرمائے گا۔ ہاں! مجھے یہ امید تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب دکھایا جائے گا جس میں اللہ میری براءت بیان فرمائے گا۔ بخدا! حضور اپنی جگہ سے ہٹے بھی نہیں تھے اور نہ گھر والوں میں سے کوئی باہر گیا تھا کہ حضور پر وحی نازل ہونے لگی اور حضور پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو نزول وحی کے وقت طاری ہوتی تھی کہ سردی کے دنوں میں بھی پسینے کے قطرے موتی کی طرح ٹپکتے تھے۔ جب وحی کی کیفیت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فرو ہوئی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے، سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ مجھ سے فرمایا: اے عائشہ! اللہ کا شکر کرو بے شک اللہ نے تیری پاکدامنی بیان فرمادی۔ اس پر میری والدہ نے مجھ سے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو۔ میں نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہ ہوں گی اور سوائے اللہ کے

اور کسی کا شکر نہیں ادا کروں گی۔ اس وقت اللہ عزوجل نے یہ دس آیتیں نازل فرمائیں۔ اور یہ بڑا بہتان لانے والے تمہیں میں سے ایک گروہ ہے (اور بقیہ آیتیں) جب اللہ نے میری براءت میں یہ نازل فرمایا تو ابوبکر صدیق نے کہا میں مسطح کو کبھی کچھ نہ دوں گا کیوں کہ اس نے عائشہ کو وہ کہا ہے کہ اور وہ مسطح بن اثاثہ کو دیا کرتے تھے۔ رشتہ داری کی بنا پر اللہ عزوجل نے یہ نازل فرمایا، تم میں جو لوگ مالدار اور فراخ رزق ہیں وہ یہ قسم نہ کھائیں کہ رشتہ داروں اور مسکینوں اور مسافروں اور مہاجرین کو کچھ نہ دیں گے۔ (پوری آیت غفور رحیم تک) اب ابوبکر نے کہا ہاں! بخدا! میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ مجھے بخش دے، اور مسطح کو وہ دینا جاری کر دیا جو پہلے عطا فرماتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے زینب بنت جحش سے میرے معاملے میں دریافت فرمایا تھا، اور پوچھا تھا اے زینب! تم کیا جانتی ہو تم نے کیا دیکھا ہے، تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اپنے کان اور آنکھ کو محفوظ رکھتی ہوں۔

اب اس طویل متن حدیث کی تشریحات ملاحظہ کریں:

واقعۂ افک میں یہ بہتان باندھنے والے چار مرد تھے۔ رأس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول، حضرت حسان بن ثابت، حضرت مسطح بن اثاثہ اور عبداللہ ابواحمد۔ ایک عورت حمنہ بنت جحش ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کی بہن۔

اس فتنے کا بانی رأس المنافقین تھا۔ اسی نے اس کی ابتدا کی اور یہی اسے کرید کرید کر ابھارتا رہتا تھا، اور قول مختار یہی ہے کہ آیت کریمہ: ''الذی تولی کبرہ'' سے مراد وہی شقی ازلی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت حسان ہیں۔

یہ واقعہ غزوۂ بنی مصطلق میں واقع ہوا جسے غزوہ مریسیع بھی کہتے ہیں یہ بر بنائے قول راجح شعبان ۵ھ میں ہوا تھا۔ اس واقعہ کی بنیادی کڑی وہ ہار ہے جو سیدنا ام المومنین کے گلوے مبارک سے گر کر کھو گیا تھا، یہ ہار جزع نامی ایک قیمتی پتھر کا بنا ہوا تھا۔ جزع عقیق کی ایک قسم ہے، زیتوں میں پکانے سے اس کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ اس کا پہننے والا غم واندوہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اگر بچے کو پہنا دیا جائے تو اس کی رال بہت بہتی ہے۔ دردزہ میں مبتلا عورت کے بال پر پھیر دیا جائے تو بچے کی پیدائش میں آسانی ہوگی۔

یمن کے علاقے میں ظفار ایک جگہ کا نام ہے، جہاں یہ عقیق بہ کثرت پیدا ہوتا ہے اور چین سے بھی آتا ہے اس لیے اس کو جزع ظفار بھی کہتے ہیں۔ اکثر روایتوں میں ظفار کے بجائے اظفار بھی آیا ہے۔ اظفار ایک قسم کی خوشبودار لکڑی کو بھی کہتے ہیں ہوسکتا ہے کہ اس لکڑی کے منکے سے ہار بناتے ہوں، اس ہار کی قیمت بارہ درہم تھی یعنی آج کل چاندی کی جو قیمت ہے اس کے اعتبار سے لگ بھگ ڈھائی سو روپے تھی۔ یہ ہاران کی والدہ نے اس وقت عطا فرمایا تھا جب انہیں رخصت کیا تھا۔

جب ام المومنین ہار کی تلاش میں قافلے سے پیچھے رہ گئیں تو اس جگہ تشریف لے آئیں جہاں پہلے قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ پھر حضرت صفوان کی رہنمائی میں قافلہ کے ساتھ آملیں۔

یہ حضرت ام المؤمنین کی اس نوعمری میں اعلیٰ ذہانت کی دلیل ہے کہ وہیں اپنی جائے قیام پر تشریف فرما رہیں، ورنہ اگر گھبرا کر چل دیتیں تو اس کا خطرہ تھا کہ بھٹک جاتیں تو ملنا دشوار ہوجاتا۔

حضرت صفوان بن معطل سلمی ذکوانی، قبیلہ بنی سلیم کے فرد تھے، خلاف قیاس اس کی طرف انتساب میں سلمی کہا جاتا ہے، ان کے آباؤ اجداد میں ذکوان نام کے ایک شخص تھے جن کی نسبت میں ان کو ذکوانی کہا گیا۔ یہ اس خدمت پر مامور تھے کہ لشکر کی روانگی کے بعد منزل کا جائزہ لے لیا کریں کہ اگر کسی کی کوئی چیز رہ گئی ہو تو اسے مالک کو پہنچا دیں۔ سب سے پہلا غزوہ جس میں یہ شریک ہوئے مریسیع ہی تھا اس کے بعد خندق وغیرہ تمام مشاہد میں شریک ہوئے۔ بہت بہادر مخیر صحابی تھے۔ اور شاعر بھی تھے۔ آرمینیہ کی جنگ میں ان کا پیر ٹوٹ گیا مگر پھر بھی لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔ یہ جنگ ۱۹ھ میں ہوئی تھی۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ چوں کہ افک میں ملوث تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک بار پھر حضرت حسان پر تلوار چلائی مگر وہ بچ گئے۔ حضرت حسان نے دربارِ رسالت میں شکایت کی تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حسان سے فرمایا کہ اپنا حق مجھے بخش دو۔ انہوں نے نذر کردیا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے عوض حضرت صفوان سے انہیں ایک کھجور کا باغ دلوادیا۔ حضرت صفوان اس کے قبل مشرف باسلام ہوچکے تھے، آگے ام

المومنین کا ارشاد آرہا ہے کہ انہوں نے نزول حجاب سے پہلے مجھے دیکھا تھا اور بر بنائے قول مختار آیت حجاب کے نزول کا سنہ بھی یہی ۵ھ ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ آیت حجاب اس واقعہ سے چند مہینہ پہلے نازل ہوئی تھی۔

حضرت صفوان کو جب اس افواہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: بخدا! میں نے اب تک کسی عورت سے صحبت نہیں کی، نہ حلال طور پر نہ حرام طور پر۔ ابن اسحٰق نے یہ بھی روایت کیا کہ وہ حصور تھے یعنی عورتوں کے لائق نہ تھے۔ خود ام المومنین نے ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ سبحان اللہ میں نے کسی عورت کا ستر نہیں کھولا ہے۔ حضرت صفوان نے جب ام المؤمنین کو دیکھا تو انہیں سخت حیرت ہوئی ہوگی کہ کوئی عظیم سانحہ ہوگیا ہے۔ اس لیے بے ساختہ ان کی زبان پر کلمہ استرجاع جاری ہوگیا ہوگا۔ یا ہوسکتا ہے انہوں نے آواز دے کر جگانے کے بجائے بلند آواز سے اسے پڑھا، یہ غایت ادب واحترام کی بنا پر تھا۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ ام المومنین فرماتی ہیں کہ میں نے انہیں دیکھتے ہی چادر سے منھ چھپالیا۔ واللہ! انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ میں نے سوائے استرجاع کے اور کچھ ان کی زبان سے سنا۔ حضرت صفوان نے اونٹ بٹھا کر اس کے اگلے پاؤں کو اس لیے دبادیا کہ ام المومنین از خود بغیر کسی سہارے کے اونٹ پر سوار ہوجائیں، یہ ان کی ذہانت اور ان کا ادب تھا۔

صحاح کی تمام روایتوں میں یہی ہے کہ حضرت صفوان پیدل اونٹ کی مہار تھامے آگے آگے تھے، ابن حبان کی ایک روایت میں ہے کہ اونٹ پر ام المومنین کے ساتھ بیٹھے تھے یہ صحیح نہیں۔

ام المومنین فرماتی ہیں کہ ہم دونوں لشکر میں اس وقت پہنچے جب ٹھیک دوپہر کے وقت لشکر نے پڑاؤ کرلیا تھا۔ ابن اسحاق کی روایت میں یہ ہے کہ ام المومنین فرماتی ہیں ابھی قافلہ ٹھہرا ہی تھا ابھی میری گم شدگی کا علم بھی کسی کو نہیں ہوا تھا کہ ہم لوگ پہنچ گئے۔ رأس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے سب سے پہلے بہتان کے کلمات نکالے اور پھر تھوڑی دیر میں پورے لشکر میں پھیل گئے۔

مسطح بن اثاثہ کی ماں حضرت صدیق اکبر کی خالہ تھیں جن کا نام رائطہ تھا۔ مسطح اور ان کی ماں سابقین اولین مہاجرین میں سے تھیں۔ اثاثہ مسطح کے بچپنے ہی میں فوت ہو گئے۔ ماں اور بیٹے دونوں کی حضرت صدیق اکبر کفالت فرمارہے تھے۔ چوں کہ مسطح بھی بہتان طرازوں میں شامل تھے اس لیے ان کی والدہ نے ان کے بددعا کے یہ الفاظ نکالے کہ مسطح ہلاک ہوجائے۔

جب سیدنا مولائے کائنات علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس سلسلہ میں سرکار نے مشورہ طلب فرمایا تو آپ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز تنگی میں نہ ڈالے گا اور عورتیں ان کی سوا بہت ہیں، حضور کنیز سے دریافت فرمالیں وہ سچی بات بتادے گی۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ عرض اس بنیاد پر تھی کہ معاملے کی جو صورت اس وقت تھی اس کے پیش نظر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قلق واضطراب اور پریشانی کے ازالے کی سب سے آسان صورت یہی تھی جو انہوں نے عرض کی۔ ظاہر ہے کہ بفرض محال اگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ام المومنین سے جدائی اختیار فرمالیتے تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔ یہ حضرت شیر خدا کی ایک رائے تھی اگرچہ اس کا سنگین پہلو دوسرا بہت خطرناک تھا کہ پھر ام المومنین کی پاک دامنی عصمت مآبی مشتبہ ہوجاتی، یہی نہیں بلکہ اس کے خلاف لوگوں کو یقین ہوجاتا۔ یہ رحمت عالم کی شان کریمی کو گوارہ نہ ہوا کہ جسے اپنے حریم میں جگہ دے چکے ہیں، اسے بلا کسی جرم کے ہمیشہ کے لیے طعن وتشنیع کا نشانہ بننے کے لیے چھوڑ دیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ معاذ اللہ! ام المومنین کی عصمت پر کسی قسم کا شبہہ رکھتے تھے۔ اگر انہیں اس میں ذرا بھی شبہہ ہوتا تو بلا جھجک ظاہر فرمادیتے۔ اس وقت نہ تقیہ کی ضرورت تھی، نہ حضرت شیر خدا سے اس کی توقع۔ بلکہ یہ عرض کہ کنیز یعنی بریرہ سے دریافت فرمالیں وہ حضور کو سچی بات بتادے گی، اس کی دلیل ہے کہ اس وقت بریرہ نے جو کچھ عرض کیا وہ خود حضرت شیر خدا کی بھی رائے تھی۔ اس مشاورت کے بعد سرکار منبر اقدس پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ افترا

پردازی کر کے مجھے ایذا پہنچائی ہے انہیں اگر میں سزا دوں تو کون مجھے حق بجانب سمجھ کر معذور جانے گا یا اس خصوص میں کون میری مدد کرے گا۔ اس وقت حضرت سعد بن معاذ کھڑے ہو گئے اور عرض کی یا رسول اللہ! میں ان کے مقابلے میں حضور کی مدد کروں گا، اگر وہ آدمی اوس سے ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر خزرج سے ہے تو ہمیں حکم دیجیے ہم آپ کے حکم کے مطابق عمل کریں گے۔

اس پر امام قاضی عیاض وغیرہ نے یہ اشکال پیش کیا کہ اس وقت حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ باحیات نہیں تھے کیوں کہ یہ متفق علیہ ہے کہ ان کا وصال غزوۂ خندق کے بعد بنی قریظہ کے استیصال کے بعد ہو گیا تھا۔ غزوۂ خندق ۴ھ میں ہوا ہے جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ غزوۂ مریسیع شعبان ۵ھ میں ہوا ہے، اور خندق شوال ۵ھ میں۔

بہر حال! جب سعد بن معاذ نے یہ فرمایا تو حضرت سعد بن عبادہ کو طرارہ آ گیا۔ کیوں کہ آپ خزرج کے سردار تھے، آپ نے مشتعل ہو کر کہا بخدا! تو نہ اسے قتل کر سکتا ہے اور نہ اس کی قدرت رکھتا ہے۔ حالاں کہ وہ اس سے پہلے منافقین کی حمایت نہیں کرتے تھے، مگر اس وقت قبیلے کی حمایت میں انہیں غصہ آ گیا تھا اور اس غصے کی وجہ غلط فہمی تھی۔ چوں کہ واقعۂ افک کا بانی مبانی اور لیڈر ابن ابی سلول رأس المنافقین بھی بنی خزرج کا تھا انہوں نے سمجھا کہ حضرت سعد اسی بہانے خزرج سے پرانی عداوت نکالنا چاہتے ہیں، اس کی دلیل ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے کہا کہ تم نے یہ بات صرف اس بنا پر کہی ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ بنی خزرج سے ہے اور ابن ابی حاطب کی روایت میں ہے کہ اے معاذ! تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مدد نہیں کرنا چاہتا اور تمہارے درمیان جاہلیت میں کینے تھے وہ اب تک تمہارے سینوں سے نہیں نکلے ہیں۔

اس پر حضرت اسید بن حضیر کھڑے ہو گئے اور کہا: تم یہ کام منافق کا کر رہے ہو کیوں کہ منافق کی حمایت میں غصہ ہو رہے ہو۔ حضرت سعد بن معاذ اور حضرت اسید بن حضیر دونوں حضرات اس کی شاخ بنی عبد الاشہل سے تھے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

بات پر جلال اور غضب میں ان کے منہ سے یہ کلمات نکل گئے۔ اس وقت اس فتنے سے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انتہائی ملول اور الجھن میں تھے، اس وقت ضرورت تھی کہ خاطر اقدس سے گرد ملال دور کی جاتی، اور اطاعت و ہمدردی زیادہ سے زیادہ کی جاتی مگر حضرت سعد بن عبادہ نے غلط فہمی کی بنا پر وہ کہہ دیا، اس پر انہیں جلال آ گیا، شورش اور فتنہ کے موقع پر اس قسم کی باتیں تعجب انگیز نہیں، خصوصاً اس وقت کہ ابھی یہ لوگ صرف چار سال ہوئے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ اس اختلاف کی وجہ سے اوس اور خزرج دونوں قبیلے مشتعل ہو گئے تو حضور منبر اقدس سے نیچے تشریف لائے اور حاضرین کو خاموش رہنے کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ حضرت سعد بن عبادہ اور دیگر حضرات خاموش ہو گئے اور حضور بھی خاموش ہو گئے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مومن مخلص اور سچے محب رسول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس جوش اور ثوران میں جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں سمجھایا بجھایا تو وہ ٹھنڈے ہو گئے اور ان کا ایمان صادق اور ان کی بے لوث حب رسول ان کے جوش اور ثوران پر غالب آ گئی۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اس حادثہ سے حضرت سیدتنا ام المومنین بہت دل گرفتہ تھیں، کسی پہلو قرار نہ تھا۔ مسجد نبوی کی اس گفتگو کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آپ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: عائشہ! تیرے بارے میں میرے پاس ایسی ایسی بات پہنچی ہے اگر تو بری ہے تو بہت جلد اللہ تعالیٰ تیری براءت بیان فرمائے گا الخ۔ یہ سننے کے بعد اخیر میں ام المومنین نے عرض کیا: میرے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ آپ حضرات نے وہ سب سن لیا ہے جو لوگ کہتے پھر رہے ہیں اور وہ آپ حضرات کے دل میں بیٹھ چکی ہے اور آپ حضرات نے اسے سچ سمجھ لیا ہے اور اب میں یہ کہتی ہوں کہ میں اس سے بری ہوں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے ضرور بلا شبہہ بری ہوں تو آپ حضرات مجھے سچا نہیں جانیں گے اور اگر میں اس بات کا اعتراف کر لوں حالاں کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ حضرات مجھے سچا مان لیں گے۔ بخدا! میں اپنی مثال اور آپ حضرات کی مثل یوسف کے والد کے علاوہ اور کچھ نہیں پائی جب کہ انہوں نے فرمایا تھا: پس اچھا صبر ہی خوب ہے، ان باتوں پر جو تم بیان

کرتے ہوا اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اپنے بچھونے پر کروٹ بدل لی،
اور میں امید کرتی تھی کہ اللہ میری براءت بیان فرمائے گا۔

غالبًا ام المومنین چار سال خدمت اقدس میں گزار چکی تھیں انہیں یقین تھا کہ حضور
خوب جانتے ہیں یہ افترا بہتان اور کذب بحت ہے مگر جب حضور نے وہ فرمایا تو ان کی انا
کو ٹھیس لگی اور شان محبوبی کی بنا پر بطور ناز وادا وہ عرض کیا، خطاب اگر چہ حضور سے تھا مگر
مراد عوام تھے جن کی عادت کی ام المومنین نے کماحقہ ترجمانی فرمائی ہے۔ اس وقت وہ عرض
کر دیا مگر جب غور فرمایا کہ میں نے کیا کہہ دیا تو بطور معذرت ارشاد فرمایا، میں اس وقت نوعمر
بچی تھی، اور قرآن بہت زیادہ نہیں پڑھا تھا۔ اس لیے وہ کلمات منھ سے نکل گئے۔ ام المومنین
کی الجھن اور کرب کا اس سے اندازہ لگتا ہے کہ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام
نامی ذہن مبارک میں نہ آیا تو ابا یوسف عرض کیا۔ یعنی اس صورت حال میں میں بھی صبر جمیل
کروں گی اور اللہ عزوجل سے استعانت کروں گی، مجھے امید ہے کہ جیسے حضرت یعقوب کو ان
کا یوسف گم شدہ مل گیا میری بھی براءت اللہ عزوجل بیان فرمادے گا اور جو ام المومنین کی
امید تھی وہ بدرجۂ اتم پوری ہوئی۔

پھر حضرت ام المومنین نے سرکار کی جانب سے جو رخ پھیرا تھا یہ بظاہر اعراض ہے
مگر اس ظاہری اعراض میں کتنی یگانگت، کتنی کشش، کتنی لذت ہے، وہ ارباب محبت ہی
جانتے ہیں۔ اور یہ اس کی دلیل ہے کہ ام المومنین کو پورا وثوق تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کو میری پاک دامنی اور براءت پر کامل یقین ہے ورنہ موقع ایسا تھا کہ خوشامد کی جاتی
اور انتہائی لجاجت آمیز گفتگو کی جاتی، اور ایسی حرکت ہوتی جو ان کی مظہر ہو، مگر سچے محب
ومحبوب کا رابطہ خوشامد لجاجت سے بالا ہے وہ ایک محبوب خوب جانتا ہے کہ میرے محب کو میری
کیا ادا پسند ہے۔

یہی نہیں اسود کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ
پکڑا تو میں نے چھڑا لیا۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں ڈانٹا۔ یہ سب وہی محبوبانہ
ادائیں ہیں۔ ام المومنین کے قلب مبارک پر اس کا بہت اثر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم نے سنتے ہی اس کی تردید کیوں نہیں فرمائی، جب کہ وہ خوب جانتے تھے کہ میں اس سے بری ہوں۔ اس ماحول میں جب اللہ عزوجل نے ان کی براءت نازل فرمائی، تو یہ محبوبانہ شکوہ اپنے کمال پر پہنچ گیا، جس کا یہ ثمرہ ہوا کہ عرض کیا میں صرف اللہ کی حمد کروں گی وغیرہ وغیرہ۔

پھر اسی وقت اللہ تعالیٰ نے سیدتنا ام المومنین کی براءت میں سورۂ نور کی یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْکِ عُصْبَةٌ مِّنْکُمْ (الی) وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

بے شک جو لوگ بھاری بہتان لائے وہ تمہاری ہی ایک جماعت ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم لوگ نہیں جانتے۔

سورۂ نور کی تفسیر میں ''العشر الآیات'' ہے دس آیتیں مگر یہ دس نہیں نو ہیں، اس کے بعد کی آیت ملائی جائیں تو دس ہوں گی۔

لیکن عطا خراسانی کی روایت میں ہے: ان الذین جاء وا بالافک سے واللہ غفور رحیم تک نازل ہوئیں۔ یہ بارہ آیتیں ہوئیں۔ طبری میں حکم بن عتبہ کی مرویات میں ہے کہ اللہ عزوجل نے پندرہ آیتیں نازل فرمائیں: الخبیثات للخبیثین تک مگر یہ پندرہ نہیں سولہ آیتیں ہیں۔ تفسیر ابن ابی حاتم اور حاکم کی اکلیل میں سعید بن جبیر سے ہے کہ مسلسل اٹھارہ آیتیں نازل فرمائیں۔

اس عاجز کی رائے یہ ہے کہ صحیحین کی روایت راجح ہے کہ پہلے دس آیتیں نازل ہوئیں، اس پر واقعات کی ترتیب دلیل ہے۔ آیت کریمہ: وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ کا مضمون بتا رہا ہے کہ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قسم کے بعد نازل ہوئیں، اور یہ بھی طے ہے کہ آیات براءۃ کے نزول کے بعد انہوں نے وہ قسم کھائی تھی۔ زمخشری نے کہا مختصر اور جامع عبارت کے ساتھ اتنی سخت وعید کسی معصیت میں وارد نہیں وہ بھی مختلف اسلوب اور متعدد طریقوں کے ساتھ کہ ان میں ہر ایک اپنی جگہ کافی اور وافی ہے، حتیٰ کہ بت پرستوں کے بارے میں بھی اتنی سخت وعیدیں اور اتنا تند و تیز لہجہ استعمال نہیں ہوا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ سارے دین کے دارو مدار حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اس فتنے کے بانی اور سربراہ عبداللہ بن ابی کا منشا یہ تھا کہ اگر اس میں کامیاب ہو گئے تو پھر لوگوں کو یہ باور کرانا آسان ہوگا کہ جو شخص اپنی سب سے زیادہ محبوب بیوی کے اندر پاک دامنی کا جذبہ نہیں پیدا کر سکا، اور جس کی شب وروز کی صحبت اسے ایسی گندگی سے محفوظ نہیں رکھ سکی وہ اللہ کا رسول کیسے ہو سکتا؟

پھر اس بہتان پر یقین کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقیناً حضرت ام المومنین کو طلاق دے دیتے جس کا اثر حضرت صدیق اکبر پر پڑتا۔ وہ کم ظرف یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس کے نتیجے میں حضرت صدیق اکبر، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے علاحدہ ہو جائیں گے، اور مہاجرین کا ایک طبقہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے الگ ہو جائے گا، یوں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے ایک بڑے معاون سے محروم ہو جائیں گے، اور یہ ہم سے مل جائیں گے۔ یوں اس نے اپنا ڈبل فائدہ سوچا ہوگا۔ اس لیے اللہ عزوجل نے سخت سے سخت تیز سے تیز اسلوب میں اس کارد بلیغ فرمایا تا کہ آئندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا سدّ باب ہو جائے۔

کتاب المغازی اور کتاب التفسیر میں اس کے بعد یہ زائد ہے:

وطفقت اختها حمنة تحارب لها فهلكت فيمن هلك قال ابن شهاب فهذا الذى بلغني من حديث هولاء الرهط ثم قال عروة قالت عائشة والله ان الرجل الذى قيل له ما قيل ليقول سبحان الله فوالذى نفسي بيده ما كشفت من كنف انثى قط قالت ثم قتل بعد ذلك في سبيل الله .

اور ام المومنین حضرت زینب کی بہن حمنہ ان کے لیے لڑتی رہتی اور ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو کر ہلاک ہو گئی، ابن شہاب نے کہا کہ اس گروہ کی جو حدیث مجھے پہنچی ہے وہ یہ ہے، اس کے بعد عروہ نے روایت کیا کہ ام المومنین حضرت عائشہ نے کہا بخدا! اس شخص نے (صفوان) جس کے بارے میں یہ کہا گیا۔ یہ کہتا رہا سبحان اللہ! (یہ کہا جارہا ہے) اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! میں نے کبھی کسی عورت کا ستر نہیں کھولا ہے۔

ام المومنین نے فرمایا: اس کے بعد وہ راہِ خدا میں شہید ہوا۔

ہشام بن عروہ کی حدیث کے اخیر میں ہے:

"وکان الذی تکلم بہ مسطح وحسان بن ثابت والمنافق عبد اللہ بن ابی وھو الذی یستوشیہ والذی تولی کبرہ ھو وحمنۃ "

اسے مسطح، حسان بن ثابت اور عبداللہ بن ابی منافق نے پھیلایا۔ عبداللہ بن ابی ہی وہ ہے جس نے اس میں سب سے زیادہ حصہ لیا، اور حمنہ نے۔

حمنہ بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حقیقی بہن تھیں۔ ان دونوں کی والدہ امیمہ بنت عبد المطلب ہیں۔ یہ بیعت کرنے والی خواتین میں تھیں۔ جنگ اُحد میں شریک تھیں، پانی پلاتیں، زخمیوں کو اٹھالاتیں، علاج کرتیں۔ پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ ان کی شہادت کے بعد طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حبالۂ عقد میں آئیں جن سے محمد سجاد اور عمر تولد ہوئے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو خیبر کی پیداوار سے تین وسق دیا تھا۔ بہن کی حمایت میں ان سے یہ لغزش ہوگئی اور طبیعت میں جوش تھا، اس لیے حد سے آگے بڑھ گئیں۔

ابو داؤد وغیرہ میں ہے کہ آیات براءت کے نزول کے بعد حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور جن لوگوں نے یہ افواہ پھیلائی تھی، ان میں سے حضرت حسان بن ثابت اور حضرت مسطح بن اثاثہ اور حضرت حمنہ بنت جحش پر حد قذف جاری فرمائی۔ ان میں عبداللہ بن ابی کا ذکر نہیں۔ جب کہ وہی اس کا بانی مبانی تھا، غالباً یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ منافق تھا۔ اس کے ساتھ ایک جتھا تھا۔ نیز قبائلی عصبیت بالکلیہ ختم نہیں ہوئی تھی، اس کا اندیشہ رہا ہو کہ اندرونِ شہر کوئی خلفشار پیدا ہو جائے اور مخالفین کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل جائے کہ لو اب جن لوگوں نے انہیں پناہ دیں انہیں سے لڑنے لگے۔ ویسے امام حاکم کی اکلیل میں ابو اویس کی روایت میں جو حسن بن زید اور عبداللہ بن ابو بکر بن حزم وغیرہ سے ہے کہ اس پر بھی حد قائم کی گئی۔

یہ واقعہ اگرچہ انتہائی دل خراش ہے اور اس کے اثر سے ام المومنین حضرت عائشہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو انتہائی ذہنی اعصابی اذیت اٹھانی پڑی۔ بلکہ خود حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی انتہائی الجھن میں گرفتار کردیا، مگر اس کی برکتیں بے شمار ہیں۔ سند الحفاظ علامہ ابن حجر نے سورۂ نور کی تفسیر کی تو اس حدیث کے سو سے زائد فوائد بیان فرمائے ہیں۔ علامہ بدرالدین محمود عینی نے اس میں مزید اضافے فرمائے اس خادم کے ذہن میں ان دونوں حضرات کے فوائد کے علاوہ مزید فوائد ہیں۔ خصوصیت سے اس واقعہ کے نتیجے میں زنا اور تہمت زنا کی سزاؤں کا نزول وہ برکت ہے کہ قیامت تک کے لیے ان گنت عورتوں کی عصمت محفوظ ہوگئی، اور شتر بے مہار عوام میں ذرا ذرا سے شبہات پر الزام واتہام کی عادت ہے۔ اس پر سخت قدغن لگ گیا، مجھے چوں کہ اختصار مقصود ہے، اس لیے تفصیل سے درگزر کرتا ہوں۔

ایک فریب کی پردہ دری:۔

منافقین نے تو اسلام پر ضرب کاری لگانے کی نیت سے یہ بہتان باندھا تھا، جس کا بالکلیہ قلع قمع قرآن مجید نے کردیا۔

مگر آج کل وہابی اسے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم وسیع واوسع کی تنقیص کے لیے دستاویز بنائے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم غیب جانتے تھے تو پریشان کیوں تھے، ان معاندین سے خطاب بے کار لیکن انصاف پسند ناظرین کی خدمت میں چند باتیں معروض ہیں۔ حدیث کے متن پر ایک نظر پھر ڈال لیں۔

۱) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب اس سلسلے میں ام المومنین حضرت زینب بنت جحش، حضرت اسامہ، حضرت بریرہ رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا تو سب نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پاکدامنی کو بیان کیا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس پر سکوت فرمایا جو بمنزلۂ تقریر ہے۔ یعنی اس قول کی تصدیق ہے اور تصدیق اسی وقت ہوگی جب کہ اس کے سچ ہونے پر یقین ہو، اور یہ باتیں قول کی تصدیق ہے۔ اس لیے بظاہر یہ ایک تصدیق حقیقت میں تین تصدیق ہے۔

۲) پھر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا منبر پر تشریف لے جا کر علانیہ فرمانا: من

یعذرنی من رجل بلغنی اذاہ فی اھلی ۔اس شخص کے مقابلے میں میری کون مدد کرے گا، جس کی اذیت ناک باتیں مجھ تک پہنچی ہیں۔

یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس بات کا یقین تھا کہ ام المومنین پاک دامن ہیں، اور یہ بہتان عظیم ہے۔ کیوں کہ اگر اس میں شک ہوتا تو بہتان طرازوں کے مقابلے میں صحابۂ کرام سے نہ فرماتے کہ اس بارے میں میری کون مدد کرے گا؟۔

۳) پھر فرمایا "واللہ ما علمت علی اھلی الا خیرا" خدا کی قسم! مجھے اپنی اہلیہ کے بارے میں اچھائی کے سوا اور کچھ علم نہیں۔

بر سر منبر قسم کھا کر صفائی کے باوجود یہ کہنا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس بارے میں شک میں تھے۔ اس ارشاد کو جھٹلانا ہے۔

۴) پھر حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا: "وقد ذکروا رجلا ما علمت علیہ الا خیرا" اور ایسے شخص کا ان لوگوں نے اس سلسلے میں نام لیا ہے جس کے بارے میں خیر کے سوا مجھے اور کچھ علم نہیں۔

یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس کا یقین کامل تھا کہ یہ واقعہ سراسر جھوٹ ہے اور افترا ہے۔

وجہ اضطراب:

رہ گیا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اس واقعہ سے اضطراب یہ بہ تقاضائے بشریت تھا کسی بھی شریف انسان کی اہلیہ پر اور وہ بھی سب سے زیادہ عزیز اہلیہ پر کوئی بہتان باندھے اور علانیہ اس کا پروپیگنڈہ کرے تو یہ فطری بات ہے کہ وہ پریشان اور بے چین ہوگا۔ اگرچہ اس کا یقین ہو کہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ خالص افترا ہے۔

رہ گیا کہ حضرت بریرہ وغیرہ سے دریافت فرمایا۔ یہ لاعلمی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس

لیے تھا کہ دوسروں کو مطمئن کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے کہ محوث عنہ کے خصوصاً قریب رہنے والے جب اس کے بارے میں صفائی دیں گے تو اسے ہر دیانت دار اور انصاف پسند قبول کرلے گا۔

رہ گیا خود ام المومنین سے جو فرمایا: اے عائشہ! تمہارے بارے میں مجھ تک ایسی ایسی باتیں پہنچی ہیں الخ...... یہ بھی اس اعلان کے بعد کہ مجھے اپنی اہلیہ کے بارے میں خیر کے سوا اور کسی بات کا علم نہیں۔ اس کی دلیل نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس سلسلے میں کوئی شک تھا، بلکہ یہ اس بنا پر تھا کہ کوئی کہہ سکتا تھا کہ خود منبر پر آ کر صفائی دے رہے ہیں۔ مخالفین کے مقابلے پر مدد کے لیے بلا رہے ہیں، اور جس پر الزام لگا ہے، اس سے پوچھا تک نہیں، یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ جس پر بھی کوئی الزام لگایا جائے، اس سے سوال کیا جائے، یہ ضابطے کی خانہ پری تھی تاکہ ایک نظیر قائم ہو جائے۔

اس واقعے میں حضرت صدیق اکبر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے اعلیٰ فضائل کے متعدد پہلو ہیں۔

۱) یہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قلب پاک میں ان دونوں کی عظیم وقعت کی بین دلیل ہے۔ ایک سیدھی سادی بات ہے کہ کسی شخص پر یہ واجب نہیں کہ کسی بھی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھے، اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معاملہ تو ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اس فتنے کا آسان حل یہ تھا کہ علاحدگی اختیار فرمالیتے، مگر یہ حضرت صدیق اکبر اور خود ام المومنین کے لیے کتنا بڑا سانحہ ہوتا وہ ظاہر ہے کہ ان دونوں پر کیا گزرتی بتانے کی بات نہیں۔ مگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان دونوں کی دل داری بلکہ دل نوازی کے لیے اس آسان حل پر عمل نہیں فرمایا، بلکہ ابتداءً اس فتنے کو فرو کرنے کے لیے صحابۂ کرام کو جمع فرمایا اور ان سے مدد کی درخواست کی، اور پھر ایک مہینے تک وحی ربانی کا انتظار فرمایا۔ یہ صرف اس لیے تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان دونوں کا دل شکستہ ہونا پسند نہیں تھا۔

۲) حضرت صدیق اکبر کے ساتھ مہاجرین کی کثیر تعداد تھی، اور انصار کرام ان کا بے حد احترام کرتے تھے، وہ چاہتے تو جو لوگ اس واقعے میں ملوث تھے، طاقت کے ذریعہ کا ان کا منھ بند کر سکتے تھے، مگر وہ ایک دم خاموش رہے، صرف ایک بار فرمایا تو یہ فرمایا: بخدا! جاہلیت میں ہمارے بارے میں ایسی بات کبھی کسی نے نہیں کہی۔ پھر اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام سے عزت دی۔ یہ کیسے کہا جا رہا ہے۔

مگر ظاہر ہے کہ وہ اگر کوئی سخت اقدام کرتے تو مسلمانوں میں لڑائی کا اندیشہ تو یہ تھا جس سے اسلام کی اشاعت میں خلل پڑتا۔ اس لیے زہر کا گھونٹ پیتے رہے اور خاموش رہے۔ اسلام کی بہبود کی خاطر اتنے عظیم حادثے کے وقت راضی برضائے الٰہی رہنا صدیق اکبر ہی کی شان تھی۔ یہ ان کی اسلام کے ساتھ خیر خواہی، تدبر، دور اندیشی، تحمل، استقامت اور توکل علی اللہ اور رضا بالقضا کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہونے کی برہان قاطع ہے۔

۳) حضرت مسطح بن اثاثہ نے اس میں کھل کر بھرپور حصہ لیا تھا، حتیٰ کہ خود ام المومنین سے مروی بعض طرق میں ہے کہ "الذی تولی کبرہ" جس نے اس میں زیادہ حصہ لیا، میں یہ بھی داخل تھے۔ اس لیے انہوں نے قسم کھالی کہ اب مسطح کو کچھ نہیں دوں گا۔ مگر جب آیت کریمہ نازل ہوئی۔

"وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسَاكِيْنَ"

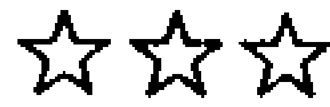
اور جو لوگ مال دار فراخ رزق ہیں وہ یہ قسم نہ کھائیں کہ رشتہ داروں کو کچھ نہیں دیں گے۔ تو فوراً سارا غیظ وجلال ختم ہو گیا، اور حکم ربانی کے حضور سر تسلیم خم کر دیا۔ اپنی لخت جگر نور نظر، سرور قلب وجگر کے خلاف وہ بھی کون جو محبوبہ محبوب رب العالمین ہو ایسی گندگی اور وہ بھی بے بنیاد اچھالنے والے پر بحکم خداوندی دوبارہ داد و دہش کرنا اس کی دلیل ہے کہ وہ ہر وقت ہر آن ہر لحظہ رضائے الٰہی کے طالب تھے، اور وہ بلا شبہہ اس آیت کریمہ کے سب سے اعلیٰ مصداق تھے۔

"وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى"

اور وہ جہنم سے بہت دور رکھا جائے گا جو سب سے بڑا پرہیزگار ہے اور مال اس لیے خرچ کرتا ہے تاکہ پاکیزہ رہے۔

۴) حضرت ام المومنین کی براءت میں دس آیات نازل ہوئیں۔ بارگاہِ خداوندی میں ان کا کتنا اعزاز تھا، وہ اس سے ظاہر ہے۔ اور پھر ان آیات کے سیاق میں قہر و جلال کی کوندتی ہوئی بجلیاں اس کی دلیل ہیں کہ جبار و قہار مولیٰ عزوجل ام المومنین کے مخالفین سے اعلانِ جنگ فرما رہا ہے۔ کیا یہ اس کی دلیل نہیں کہ ام المومنین بارگاہِ قدس کے محبوبوں کی اولین صف میں ہیں۔

اس حدیث میں ام المومنین کی ذہانت و فطانت، اصابت رائے، فصاحت و بلاغت، تحریر بیان اور واقعات کے اسباب وعلل کا اظہار جس حسن خوبی سے ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ اسے دقیق نظر اور اہل معرفت ہی محسوس کر سکتے ہیں، جن میں بعض کی طرف میں نے اشارے کر دیے ہیں۔



باب دوم

تواریخ و سیر



تاریخ ولادت نبوی

سوال:۔

ا:۔ ایک کتاب جمعیۃ العلماء ہند نے نکالی ہے جس کا نام ''دینی تعلیم'' ہے، درجۂ دوم کے لیے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضور کی پیدائش کی صحیح تاریخ ۹ ربیع الاول ہے، سوموار کا دن ہے۔ ۱۲ ربیع الاول غلط ہے، اس کی تشریح کی جائے دوسری کتابوں میں ۲۰ اپریل ۵۷۱ء ہے، یہ صحیح ہے یا غلط اس کی تشریح کریں۔

۲:۔ اسی کتاب میں یہ مضمون درج ہے کہ کعبہ شریف کے پاس ایک دفعہ حضور کو گھیر لیا، سب طرف سے لوگ ہمارے حضرت پر ٹوٹ پڑے، حارث بن ابی ہالہ (حضرت خدیجہ کے لڑکے) گھر میں تھے، ان کو خبر ہوئی دوڑے آئے اور ہمارے حضرت کو بچانا چاہا لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہو گئے، یہ عبارت کہاں تک درست ہے۔

الجواب:۔

ا:۔ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں یہی لکھا ہے کہ ولادت پاک ۹ ربیع الاول کو ہوئی، اور یہ اس کی اپنی تحقیق نہیں بلکہ مصر کا ایک ہیئت داں ملا محمود فلکی گزرا ہے، اس کا حساب ہے۔ نئے مصنفین اسی کی تقلید جامد کر رہے ہیں۔ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا ایک مضمون ''تحفۂ حنفیہ'' جمادی الاولیٰ ۱۳۱۸ھ میں چھپ چکا ہے، اسے بعینہ نقل کر دیتا ہوں۔

فرماتے ہیں:

دو، آٹھ، دس، بارہ، سترہ، اٹھارہ، بائیس، سات قول ہیں (یعنی تاریخ ولادت میں اتنی روایتیں ہیں) مگر اشہر واکثر وماخوذ ومعتبر دوازدہم ربیع الاول شریف ہے۔ مکہ معظمہ میں ہمیشہ اسی تاریخ میں مکان مولد اقدس کی زیارت کرتے ہیں، کذا فی المواہب والمدارج۔ اور خاص اسی مکان جنت نشان میں اسی تاریخ میں مجلس میلاد مقدس ہوتی ہے۔ کذا فی

المدارج۔ علامہ قہستانی وفاضل زرقانی فرماتے ہیں:

المشھور انہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ولد یوم الاثنین ثانی عشر ربیع الاول وھو قول محمد بن اسحاق امام المغازی وغیرہ وعلیہ العمل۔

مشہور یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ یہی امام مغازی ابن اسحاق وغیرہ کا قول ہے، اور اسی پر عمل ہے۔

شرح مواہب میں امام ابن کثیر سے ہے:

المشھور عندالجمھور۔

اسی میں ہے:

ھو الذی علیہ العمل

شرح الہمزیہ میں ہے:

ھو المشھور وعلیہ العمل۔

اسی طرح مدارج وغیرہ میں تصریح کی۔ (قال اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز)

وان کان اکثر المحدثین والمورخین علی ثمان خلون وعلیہ اجمع اھل الزیجات واختارہ ابن حزم والحمیدی وروی عن ابن عباس وجبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنھم وبالاول صدر مغلطائی واعتمدہ الذھبی فی تذھیب التھذیب تبعا للمزی فی التھذیب وحکی المشھور بقیل صحح الدمیاطی عشرا خلت القول وحاسبنا فوجدنا غرۃ المحرم الوسطیۃ عام ولادتہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یوم الخمیس فکانت غرۃ شھر الولادۃ الکریمۃ الوسطیۃ یوم الاحد والھلالیۃ یوم الاثنین فکان یوم الاثنین الثامن من الشھر ولذا اجمع علیہ اھل الزیج وبمجرد ملاحظۃ الغرۃ الوسطیۃ یظھر استحالۃ سائر الاقوال ماخلا الطرفین والعلم بالحق عند مقلب الملوین۔

اگرچہ اکثر محدثین اور مورخین آٹھ تاریخ مانتے ہیں اور اسی پر اہل سنت کا اجماع ہے اور اسے ابن حزم اور حمیدی نے اختیار کیا۔ ابن عباس اور جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم سے مروی

ہے۔ پہلا قول صدر مغلطائی کا ہے۔ اور اسی پر ذہبی نے تذہیب میں صاحب تہذیب مزی کی اتباع میں اعتماد کیا، اور قول مشہور کو قیل سے نقل کیا۔ دمیاطی نے دس تاریخ کی تصحیح کی۔ "اقول" میں نے حساب لگایا تو سن ولادت کے محرم کے غرہ وسطیہ کو پنجشنبہ کے دن پایا۔ تو ماہ ولادت مبارکہ کا غرہ وسطیہ یک شنبہ کو ہوا اور ہلالیہ دوشنبہ کو۔ پس دوشنبہ کو آٹھ ربیع الاول ہوئی۔ اسی وجہ سے اس پر اہل ہیئت نے اجماع کیا۔ محض غرہ وسطیہ کے دیکھنے سے تمام اقوال کا محال ہونا ظاہر ہو جائے گا، علاوہ قول اول واخیر کے (یعنی دو اور بائیس کے) اور حقیقی علم شب وروز بدلنے والے کے ہے۔

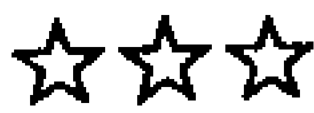
اور شک نہیں کہ تلقی امت بالقبول کے لیے شان عظیم ہے۔ یوم عید میلاد والا بھی کہ عید اکبر ہے، قول وعمل وجمہور ہی کے مطابق بہتر ہے۔ "فالاحق للعمل ما علیه العمل ملخصا"

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ ولادت کے بارے میں اگر چہ اقوال سات ہیں مگر قول مشہور و معمول بہ قول جمہور ہے یعنی بارہ ربیع الاول ہے مگر تلقی امت بالقبول کی وجہ سے عمل کے لیے ۱۲ ربیع الاول کا دن بہتر ہے۔

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی اس تحقیق سے ظاہر ہو گیا کہ ولادت باسعادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول کسی طرح درست نہیں روایتاً تو ظاہر ہے کہ ۹ ربیع الاول کا کوئی قول نہیں۔ درایۃً یوں کہ تمام ماہرین فلکیات اصحاب زیج اس پر متفق ہیں کہ عام ولادت ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو دوشنبہ تھا، اس حساب سے دوشنبہ پھر آٹھ ربیع الاول کو پڑے گا، لہٰذا آٹھ ربیع الاول کی ولادت پاک ہوئی، نو کو نہ دوشنبہ پڑتا ہے، نہ نو کو ولادت ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ یوم ولادت دوشنبہ کا دن قریب قریب متفق علیہ ہے پھر یہ کہ یہ معاملہ تاریخی ہے اور تاریخ میں روایت کو درایت پر یقیناً ترجیح ہے۔ کون واقعہ ہوا اسے عقل سے سوچ کر نہیں معلوم کر سکتے، کسی سے سن کے معلوم کر سکتے ہیں۔ ہاں! یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جب روایتیں متعارض ہوں تو کسی ایک روایت کو قیاسات سے ترجیح دے سکتے ہیں، یہاں جب کہ روایتیں کثیر ہیں تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی روایت کو علم ہیئت کے اصول سے ترجیح دیں لیکن

ان روایت کے برخلاف ایک الگ احتمال پیدا کرنا خصوصا وہ احتمال جو اس فن کے ماہرین کے متفقہ فیصلے کے خلاف ہو، اس بات کی دلیل ہے کہ حساب لگانے والے سے کہیں چوک ہوگئی ہے۔ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی اس فن میں مہارت اتنی تھی کہ وہ اپنے عصر میں یکتا تھے ان کا بھی حساب سابق اصحاب زیج کے مطابق آتا ہے، اس لیے ۹ ربیع الاول والے قول کی ترجیح کسی طرح لائق قبول نہیں۔

۲:۔ سیرۃ النبی میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ اصابہ یہاں موجود نہیں کہ آپ کو پورے طور سے مطمئن کر دیا جائے۔ مواہب اللدنیہ اس کی شرح زرقانی مدارج میں دیکھا گیا نہ یہ واقعہ ملا نہ حضرت خدیجہ کے کسی صاحبزادے کا نام حارث ملا۔ ہاں! اتنا ضرور ملا کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دو صاحبزادے ابو ہالہ سے تھے، ایک کا نام ہند تھا۔ اور ایک کا ہالہ۔ یہ دونوں صحابی ہیں۔ ہند رضی اللہ عنہ سے روایت بھی ہے، حلیہ مبارک انہیں سے مروی ہے۔ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ حضرت ہالہ کا اتنا ذکر ہے کہ وہ سرکار کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوئے کہ سرکار دوپہر میں سو رہے تھے انہیں دیکھ کر سینہ سے چمٹا لیا اور خوشی میں فرمایا: ہالہ! ہالہ! ہالہ! ہوسکتا ہے کہ انہیں کو حارث بھی کہتے ہوں، اور یہی اس واقعہ میں شہید ہوئے ہوں۔ ہوسکتا ہے کوئی اور صاحب ہوں، یہ حضرات ان پر مطلع نہ ہوئے یا مطلع ہوئے کہیں ذکر کیا ہو ہمیں نہ ملا۔ بہر حال! اس واقعہ میں آپ کو استبعاد کیا ہے کہ آپ نے سوال کیا؟



عید میلاد النبی ﷺ

محفل میلاد شریف جس ہیئت کے ساتھ اس زمانہ میں رائج و معمول ہے۔ وہ بلا شبہہ جائز اور مستحسن اور باعث خیر و برکت ہے، اور پوری دنیائے اسلام میں برسہا برس سے رائج و معمول ہے۔ اجلہ علمائے کرام، محدثین وفقہائے عظام نے اس کے جواز واستحسان کی تصریحیں کی ہیں، اور بلا شبہہ قرآن وحدیث سے اس کا جواز واستحسان ثابت ہے۔

احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں: اول وہ جن کے اوقات اور ہیئت کی مقدار معین ہے۔ ان کے لیے احادیث میں پوری تفاصیل موجود ہیں کہ فلاں وقت کی جائیں، اس ہیئت سے ادا کی جائیں، اتنی مقدار میں ادا کی جائیں۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ شریعت نے جس وقت اور جس ہیئت سے ادا کرنے کا حکم دیا ہے اسی طرح ادا کی جائیں۔ ان میں کمی، بیشی ردو بدل جائز نہیں۔ مثلاً نماز کے لیے متعین ہے کہ دو رکعت سے کم نہ پڑھی جائے، ہر رکعت میں ایک قیام ایک رکوع دو سجدے ہوں۔ پہلے قیام ہو پھر رکوع ہو پھر سجدے ہوں۔ ہر دو رکعت پر قعدہ ہو۔ روزے کے لیے تعین ہے کہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہی ہو، رات میں نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے وہ جن کا حکم مطلق ہے۔ ان کے لیے نہ وقت مقرر ہے، نہ ہیئت، نہ مقدار۔ جیسے تلاوت قرآن مجید، ذکر خدا وذکر رسول، درود شریف، ان کا حکم یہ ہے کہ کرنے والا جس وقت چاہے کرے۔ جس طرح چاہے کرے، جس مقدار میں چاہے کرے۔

اصول الشاشی وغیرہ تمام اصول فقہ کی کتابوں میں تصریح ہے کہ "حکم المطلق ان الآتی بأی فرد کان آتیا للمامور بہ" یعنی مطلق کا حکم یہ ہے کہ جس فرد کو بھی کوئی ادا کرے گا، مامور بہ کو ادا کرے گا، مثلاً ایک شخص روزانہ نماز فجر کے بعد قبلہ رخ چہار زانو بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے۔ قرآن وحدیث میں کہیں ذکر نہیں کہ نماز فجر کے بعد تلاوت

کرو۔ اس کے باوجود اس وقت اس طرح تلاوت کرنا عبادت ہے، اور کارِ ثواب ہے۔ بات وہی ہے کہ چوں کہ تلاوت کا حکم مطلق ہے، ہم جس طرح جس وقت بھی تلاوت کریں گے وہ خدا کی عبادت ہی ہوگی۔ جب تک کہ کسی خاص وقت کی ممانعت نہ ہو۔ میلاد شریف اور اس میں قیام وسلام اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ.

اپنے رب کی نعمت کا خوب خوب چرچا کرو۔

اور فرمایا گیا:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا.

فرمادو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر خوشی مناؤ۔

ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ اللہ عزوجل کا سب سے بڑا فضل اور اس کی سب سے بڑی نعمت اور رحمت حضور اقدس سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ جب اللہ عزوجل نے اپنی ہر نعمت کا زیادہ سے زیادہ چرچا کرنے اور ہر فضل ورحمت پر خوشی منانے کا حکم دیا ہے تو جو اللہ عزوجل کی سب سے بڑی رحمت ونعمت اور فضل ہیں، ان کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے اور ان پر زیادہ سے زیادہ خوشی منانے کا حکم ان آیتوں سے ثابت ہوگیا۔ یہاں بھی اللہ عزوجل نے زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے اور خوشی منانے کا مطلق حکم دیا ہے۔ اس کی کوئی تعیین وتخصیص نہیں فرمائی۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے اور خوشی منانے کا جو بھی جائز طریقہ ہو سب اس میں داخل ہیں۔ جب تک کی کسی خاص طریقہ سے شریعت میں ممانعت نہ آئی ہو۔ میلاد شریف کی محفل اور میلاد النبی کا جلوس یہ سب اسی کی فرع ہیں کہ یہ ضرور بالضرور زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے اور خوشی منانے کا ایک طریقہ ہے، جس سے شریعت میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ اس کا ثبوت ہے۔

جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو صحابۂ کرام نے بہت عظیم الشان جلوس نکالا تھا۔ اسی طرح غزوۂ تبوک سے واپسی پر بے مثال

جلوس نکالا تھا۔ ہجرت والے جلوس میں جوش مسرت میں یا رسول اللہ، یا رسول اللہ کا نعرہ بھی لگائے تھے۔

مسلم شریف جلد ثانی صفحہ ۴۱۹ پر ہے:

ینادون یا محمد یا رسول الله یا محمد یا رسول الله

اس سے ثابت ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے جلوس نکالنا اور اس میں یا رسول اللہ یا رسول اللہ کا نعرہ لگانا صحابۂ کرام کی سنت ہے۔ انسے بدعت کہنا، شرک کہنا صحابۂ کرام کو بدعتی یا مشرک بنانا ہے۔ بلکہ خود حضور اقدس سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس لئے کہ اس جلوس میں حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرماتھے۔ حضور کے سامنے ہی یا رسول اللہ کا نعرہ لگا، حضور نے اس کو سنا اور صحابۂ کرام کو منع نہیں فرمایا، تو حضور بھی بقول مخالفین اسی زمرے میں داخل ہو گئے۔

حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

صوموا لاثنين لاني فيه ولدت

دوشنبہ کو روزہ رکھو اس لیے کہ میں اسی دن پیدا ہوا۔

اس سے ثابت ہوا کہ یوم ولادت کی یاد باقی رکھنے کے لیے روزہ رکھنا مسنون ہے۔ اور اسی کے حکم میں ہر کار خیر ہے۔ میلاد شریف کی محفل بلا شبہہ اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی محفل ہے۔ اور بلا شبہہ کارِ خیر ہے۔ حضور اقدس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی بشارت ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے جب اس کو دی، تو اس خوشی میں اس کو آزاد کردیا۔ ابولہب کے مرنے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو خواب دیکھا، پوچھا کیا حال ہے؟ اس نے بتایا کہ جہنم میں ہوں مگر ہر دوشنبہ کو عذاب میں تخفیف ہوجاتی ہے۔ اور ان دوانگلیوں سے پانی چوستا ہوں اور یہ اس کا انعام ہے کہ جب ثوبیہ نے ولادت اقدس کی بشارت دی تھی تو میں نے اسے آزاد کردیا تھا، اور اس کو دودھ پلانے کا حکم دیا تھا۔ اس پر علامہ ابوالخیر شمس الدین ابن جزری فرماتے ہیں:

فاذا كان هذا الكافر الذى نزل القرآن بذمه جوزى فى النار بفرحه

لیلة مولده به فما حال المسلم الموحد من امته علیه السلام یسر بمولوده ویبذل ما اتصل الیه قدرته فی محبته صلی الله تعالیٰ علیه وسلم لعمری انما یکون جزاءه من الله الکریم ان یدخله جنات النعیم ولازال اهل الاسلام یحتفلون بشهر مولده علیه الصلوٰة والسلام ویعملون الولائم ویتصدقون فی لیالیه بانواع الصدقات ویظهرون السرور، ویزیدون فی المبرات ویعتنون بقراءة مولده الکریم ویظهر علیهم من برکاته کل فضل عمیم ومما جرب من خواصه انه امان فی ذٰلک العام وبشریٰ عاجلة بنیل البغیة والمرام، فرحم الله امرا اتخذ لیالی شهر مولده المبارک اعیادا لیکون اشد علة علی من فی قلبه مرض وعینه داء .

جب کہ اس کافر کو جس کی مذمت میں قرآن نازل ہوا، ولادت کی خوشی پر یہ انعام ملا تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مسلمان امتی اگر ولادت اقدس پر خوشی منائے اور حضور کی محبت میں مقدرت بھر خرچ کرے اس کا کیا حال ہوگا۔ بقسم اس کا انعام رب کریم کی طرف سے جنات نعیم ہے۔

مسلمان مدت دراز سے شہر ربیع الاول کا اہتمام کرتے ہیں۔ کھانا کھلاتے ہیں۔ ہر قسم کی خیرات کرتے ہیں، خوشی ظاہر کرتے ہیں۔ واقعہ ولادت پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کی برکت سے ان پر ہر طرح کا فضل عظیم ظاہر ہوتا ہے۔ میلاد شریف کے خواص میں سے مجرب ہے کہ یہ اس سال کے لیے امان ہے، اور مقصد حاصل کرنے کے لیے بشارت عاجلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو ربیع الاول شریف کی مبارک راتوں کو عید منائے تاکہ جس کے دل میں بیماری ہو اسے جلن پیدا ہو۔

علامہ خطیب احمد قسطلانی شارح بخاری نے اور علامہ عبدالباقی زرقانی نے اس کو مواہب لدنیہ اور اس کی شرح میں نقل فرمایا اور اس کو باقی رکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ حضرات اس سے متفق ہیں۔

سند الحفاظ میں علامہ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری نے اس کے استحسان پر اس

حدیث شریف سے استدلال فرمایا کہ حضور اقدس سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہودیوں کو دیکھا کہ وہ یوم عاشورہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ دریافت فرمایا اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ اس دن اللہ نے فرعون کو غرق فرمایا تھا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس پر روزہ رکھا تھا، ہم بھی رکھتے ہیں۔ حضور نے فرمایا: تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کی اتباع کے ہم حقدار ہیں۔ حضور نے بھی اس دن روزہ رکھا، اس پر فرماتے ہیں:

ویستفاد منه فعل الشکر علیٰ ما من به فی یوم معین وای نعمة اعظم من بروز نبی الرحمة، والشکر یحصل بانواع العبادة کالسجود، والقیام، والصدقة، والتلاوة.

اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس دن اللہ نے کوئی احسان فرمایا ہو، اس دن اللہ کے شکر میں کچھ کرنا چاہیے۔ اور نبی رحمت کی آمد آمد سے بڑھ کر کون سی رحمت ہے؟ اور شکر کا طریقہ مختلف عبادتیں کرنا ہے، جیسے سجدہ، روزہ اور تلاوت، علامہ عبدالباقی زرقانی شرح مواہب میں اسے نقل کر کے فرماتے ہیں:

وسبقه الیٰ ذلک الحافظ ابن رجب.

علامہ ابن حجر سے پہلے حافظ ابن رجب استدلال کر چکے ہیں۔

خاتم الحفاظ علامہ اجل جلالۃ الملۃ والدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواز پر اس حدیث سے استدلال فرمایا کہ حضور اقدس سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عقیقہ فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں:

لا تعاد العقیقة مرة ثانیة فیحمل علیٰ انه فعله شکرا فکذالک یستحب لنا اظهار الشکر بمولده بالاجتماع واطعام الطعام ونحو ذلک من وجوه القربات.

عقیقہ دوبارہ نہیں ہوتا۔ اس کو اس پر حمل کیا جائے گا کہ اس کو حضور نے بطور شکر کیا تو ایسے ہی ہمارے لیے مستحب ہے کہ ولادت اقدس پر شکر کے اظہار کے لیے اکٹھا ہوں،

اور کھانا کھلائیں اور اس کے مثل دوسرے نیک کام کریں۔ (زرقانی علی المواہب)

نیز شیخ الدلائل شیخ احمد عبد الحق مہاجر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اکلیل شرح مدارک التنزیل میں ان سب باتوں کو نقل فرمایا۔ علاوہ ازیں انہوں نے نقل کیا کہ علامہ شمس الدین محمد سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

واصل عمل المولد الشریف لم ینقل عن احد من السلف الصالح فی القرون الثلاثۃ الفاضلۃ وانما حدثت بعدھا بالمقاصد الحسنۃ والنیۃ التی للاخلاص شاملۃ ثم لازال اھل الاسلام فی سائر الاقطار والمدن العظام یحتفلون فی شھر مولدہ صلی اللہ علیہ وسلم وشرف وکرم یعمل الولائم البدیعۃ والمطاعم المشتملۃ علی الامور البھیجۃ الرفیعۃ ویتصدقون فی لیالیہ بانواع الصدقات ویظھرون المسرات ویزیدون فی المبرات بل یعتنون بقراءۃ مولدہ الکریم ویظھر علیھم من برکاتہ کل فضل عظیم عمیم بحیث کان مما جرب کما قال الامام شمس الدین الجزری المقری المقرب ومن خواصہ انہ امان تام فی ذلک العام وبشری تاجیل بنیل ما یبتغی ویرام۔

(اکلیل: جلد ۴۔ص ۲۹۸)

اس عبارت کا بھی حاصل وہی ہے جو اوپر والی عبارت کا ہے۔ پھر نقل فرمایا:

قال واکثرھم بذالک عنایۃ اھل مصر والشام۔

یعنی میلاد شریف کا سب سے زیادہ احترام مصر اور شام والے کرتے ہیں۔

پھر فرمایا:

واما ملوک الاندلس والغرب فلھم فیہ لیلۃ تسیر بھا الرکبان یجتمع فیھا ائمۃ علماء الاعلام فتعلوھا بین اھل الکفر کلمۃ الایمان واظن اھل الروم لا یتخلفون عن ذلک وبلاد الھند تزید علی غیر ھا بکثیر۔

شاہانِ اندلس اور مغرب، ربیع الاول کی ایک رات میں اتنا اہتمام کرتے ہیں کہ لوگ سواریوں پر چل کر آتے ہیں وہاں کے ائمۂ اعلام علمائے کرام اکٹھا ہوتے ہیں۔ اس سے

کافروں کے درمیان کلمۂ ایمان بلند ہوتا ہے۔ میرا گمان ہے کہ اہل روم بھی اس سے پیچھے نہیں رہتے۔ اور بلادِ ہند سب سے بڑھ کر اس میں حصہ لیتا ہے۔

فرماتے ہیں:

واما بعجم فمن حيث دخل هذا الشهر والزمان المكرم لاهلها مجالس فخام من انواع الطعام للقراء الكرام والعلماء العظام وللفقراء الخاص والعام وقراءة الختمات والتلاوات المتلويات والانشادات المعتمدات واجناس المبرات والخيرات وانواع السرور واصناف الحبور ومن تعظيم مشائخهم وعلمائهم هذا المولد العظيم والمجلس المكرم انه لا ياباه احد في حضوره رجاء ادراك نوره وسروره.

جب یہ عظمت والا مہینہ (ربیع الاول) داخل ہوتا ہے تو عجم والے بڑی بڑی محفلیں منعقد کرتے ہیں، جس میں قراء علما، فقرا کے لیے قسم قسم کے کھانے تیار کرتے ہیں۔ مسلسل قرآن مجید کی تلاوتیں ہوتی ہیں۔ اور معتمد اشعار پڑھے جاتے ہیں۔ قسم قسم کی خیرات ہوتی ہے۔ طرح طرح کی خوشی ظاہر کرتے ہیں۔ چونکہ علمائے کرام اور مشائخ عظام اس میلاد پاک اور محفل مقدس کا ادب بجالاتے ہیں، اس لیے ہر شخص اس محفل پاک کے نور و سرور کے حصول کی امید پر بلا انکار اس میں شریک ہوتا ہے۔

پھر نقل فرمایا:

قال السخاوی واما اهل مكة فيتوجهون الى محل مولده رجاء بلوغ كل منهم بذلك بمقصده ويزيد اهتمامهم به على يوم العيد حتى قل ان يتخلف عنه احد من صالح وطالح لاسيما الشريف صاحب الحجاز واهل المدينة به وعلى فعله اقبال وكان للملك المظفر صاحب اربل رحمه الله بذالك فيها اتم العناية واهتمامها مع شانه جاوز الغاية النى عليه به العلامة ابو شامه احد شيوخ النووى وقال مثل هذا الحسن يندب عليه ويشكر فاعله ويثنى عليه . زاد ابن الجزرى ولم يكن فى ذلك الا ارغام الشيطان وسرور

الایمان ۔ (اکلیل جلد:٤ توبہ: صفحہ:۲۹۹)

علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ مکہ والے شب ولادت میں (جائے ولادت اقدس) کی زیارت کرنے جاتے ہیں۔ اس امید پر کہ اس سے ان کا مقصد پورا ہوگا۔ اور اس کا اہتمام عید کے دن سے زیادہ کرتے ہیں۔ نیک و بد سبھی جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی رہ جاتا ہو۔ خصوصا حاکم حجاز شریف مکہ اور مدینہ والے بھی اس دن جشن کرتے ہیں۔ شہنشاہ اربل مظفر رحمۃ اللہ علیہ اس کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے، جتنا وہ کر سکتے تھے۔ اس پر علام ابوشامہ نووی کے استاذ نے ان کی تعریف کی۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ یہ اچھی اور مستحب چیز ہے۔ اس کے کرنے والے کی تعریف کرنی چاہئے۔ ابن جزری نے اتنا اور بڑھایا کہ اس میں شیطان کی ناک خاک آلود کرنا ہے، اور اہل ایمان کا سرور ہے۔

رہ گیا مخالفین کا یہ اعتراض کہ چوں کہ میلادِ شریف قرونِ ثلاثہ میں نہیں تھی۔ اس لیے بدعت اور گمراہی ہے۔ یہ ان کی جہالت بلکہ گمراہی ہے۔ اس لیے کہ اگر ان کی یہ بات مان لی جائے تو پھر ان کا کاروبار سارا کا سارا بدعت و گمراہی ٹھہر گیا۔ ان کے مدرسوں میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، قاعدہ بغدادی سے لے کر یہ ایک بھی ان کے قرون میں نہیں تھیں حتی کہ بخاری شریف بھی۔ بخاری شریف تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی۔

ان کے اس قول کا رد خود حدیث صحیح میں موجود ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من سن في الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شيئ ومن سن في الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شيئ (رواه مسلم جلد:۲-صفحه ۳۴)

جس نے اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کیا، اسے اس کا ثواب ملے گا۔ اور جتنے لوگ اس پر اس کے بعد عمل کریں گے اس کے برابر اسے ثواب ملے گا۔ اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جو اسلام میں کوئی برا طریقہ ایجاد کرے گا، اس پر اس کا وبال

ہوگا، اوراس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے، سب کا وبال اس پر ہوگا۔ اور عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نو ایجاد چیز اچھی ہو تو موجب ثواب بھی ہوسکتی ہے، اور بری باعث گناہ بھی۔ اچھائی اور برائی کا معیار یہ ہے کہ جو نو ایجاد چیز کسی سنت کے مزاحم ہو وہ مذموم وضلالت ہے۔ اور جو نو ایجاد چیز کسی سنت کے مزاحم نہ ہو وہ مذموم نہیں، بلکہ اگر اس میں دینی فوائد ہوں تو محمود و مستحسن اور باعث ثواب ہے۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ہے:

قال الشافعی رحمه الله تعالیٰ ما احدث ممایخالف الکتاب او السنة او الاثر او الاجماع فهو ضلالة وما احدث من الخیر مما لا یخالف شیئا من ذٰلک فلیس بمذموم.

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جو چیز کتاب یا سنت یا اثر یا اجماع کے مخالف ہو وہ گمراہی ہے اور جو اچھی بات ایسی ایجاد کی جائے جو ان میں سے کسی کے مخالف نہ ہو وہ مذموم نہیں۔

اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔ "**من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد**" جس نے دین اسلام میں ایسی بات ایجاد کی جو اسلام سے نہیں وہ قابل قبول نہیں، اس کے تحت اسی مرقاۃ میں ہے:

المعنیٰ من احدث فی الاسلام رایا لم یکن له من الکتاب والسنة سند ظاهر او خفی ملفوظ او مستنبط فهو مردود علیه وفی قوله ما لیس منه اشارة الیٰ ان احداث ما لا ینازع للکتاب والسنة کما سنقرره بعد لیس بمذموم.

اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ اسلام میں ایسی بات ایجاد کی جس کے لیے کتاب وسنت سے کوئی سند نہ ہو نہ ظاہر ہو نہ خفی، نہ ملفوظ نہ مستنبط وہ مردود ہے۔ اور حضور کے ارشاد "**ما لیس منه**" میں اشارہ ہے کہ ایسی بات ایجاد کرنا جو کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو وہ مذموم نہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ محفل میلاد شریف اچھی ہے یا بری، ذکر خدا و رسول کو کون برا کہہ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ دیکھ چکے کہ اجلہ علمائے کرام جو بالاتفاق مقتدائے امت ہیں انہوں نے اس کے جواز اور استحسان کی تصریحیں کی ہیں، اور احادیث کریمہ سے اس کی سندیں بیان فرمائی ہیں۔ چند اور ارشادات سنیے:

مقتدائے وقت فقیہ محدث علامہ عثمان بن حسن دنبالی اپنے رسالہ ''اثبات قیام'' میں فرماتے ہیں:

اجاب بذالک الامام المحقق الولی ابو ذرعة العراقی حین سئل عن فعل المولد مستحب او مکروہ فاجاب بقولہ الولیمة والطعام مستحب کل وقت فکیف اذا انضم الیٰ ذالک السرور بظہور نور النبوة فی ھذا الشہر الشرف ولایلزم من کونہ بدعة کونہ مکروھا فکم من بدعة مستحبة بل واجبة.

امام محقق ابوذرعہ سے سوال کیا گیا کہ میلاد شریف کرنا مستحب ہے یا مکروہ؟ جواب دیا کہ دعوت اور کھانا ہر وقت مستحب ہے تو کیسے ناجائز ہوجائے گا اس کے ساتھ یہ خوشی مل جائے کہ اس مبارک مہینے میں نور نبوت کا ظہور ہوا ہے، اور بدعت ہونے سے مکروہ ہونا لازم نہیں آتا۔ بہت سی بدعت مستحب ہیں بلکہ واجب ہیں۔

زرقانی علی المواہب میں ہے:

وانھا حسنة قال السیوطی و ھو مقتضی کلام ابن الحاج فی مدخلہ فانہ انما ذم ما احتویٰ علیہ من المحرمات مع تصریحہ قبل بانہ ینبغی تخصیص ھذا الشہر بزیادة فعل البرو کثرة الصدقات و الخیرات و غیر ذالک من وجوہ القربات و ھذا ھو عمل المولد المستحسن و الحافظ ابو الخطاب ابن دحیة الف فی ذلک التنویر فی مولد البشیر النذیر و اختارہ ابو الطیب السبطی نزیل قوص والاول اظہر لما اشتمل علیہ من الخیر الکثیر.

یہ بدعت حسنہ ہے۔ علامہ سیوطی نے فرمایا: مدخل میں ابن الحاج کے کلام کا یہی مقتضا

ہے۔انہوں نے برائی ان باتوں کی کی ہے جو اس محفل میں ناجائز ہوتی ہیں (مثلاً مزامیر باجہ وغیرہ) وہ پہلے خود یہ تصریح کر چکے ہیں کہ اس مہینہ (ربیع الاول) کو صدقات و خیرات کی کثرت کے لئے اور دیگر اچھے کاموں کی زیادتی کے لئے خاص کرنا چاہئے۔یہی مستحسن میلاد شریف ہے۔اور حافظ ابو الخطاب ابن دحیہ نے اس بارے میں ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "التنویر فی مولد البشیر النذیر" ہے۔اسی کی ابو الطیب سبطی نے اختیار فرمایا،اس کا بدعت حسنہ ہونا ہی زیادہ ظاہر ہے۔اس لئے کہ یہ بے شمار خیر پر مشتمل ہے۔

حضرت علامہ عبدالباقی زرقانی سب مباحث کا خلاصہ یہ لکھتے ہیں:

والحاصل ان عمله بدعة لكنه اشتمل علىٰ محاسن وضدها ومن تحرى المحاسن واجتنب ضدها كانت بدعة حسنة و من لا فلا .

(زرقانی:جلد:۱-صفحہ:۱۴۰)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں اس محفل میں کچھ ناروا باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ مثلاً مزامیر وغیرہ تو اگر محفل میں کوئی ناروا بات ہے تو ممنوع اور اگر ہرگز ناجائز بات سے محفل خالی ہے تو بدعت حسنہ ہے۔

ثوبیہ کا واقعہ نقل کر کے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ایں جا سنداست مراہل موالیدرا کہ سرورمی کنند و بذل اموال نمایند

یعنی میلاد کی محفل کرنے والوں کے لیے یہ سند ہے کہ خوشی کرتے ہیں اور اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ مروجہ محفل میلاد شریف بلا کسی شک و تردد کے جائز و مستحسن وباعث ثواب ہے۔اس کی اصل قرآن مجید کی متعدد آیتوں اور احادیث کریمہ سے ثابت ہے اور اجلہ علمائے کرام جو تمام امت کے نزدیک معتمد ہیں اس کے جواز واستحسان کے قائل ہیں۔ مثلاً سند الحفاظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری، خاتم الحفاظ علامہ جلال الدین سیوطی، علامہ احمد خطیب قسطلانی شارح بخاری۔ شیخ القراء علامہ جزری۔ علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانی۔علامہ حلبی۔حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

مانعین کے معتمد ماضی قریب کے شیخ العرب والعجم شیخ الدلائل علامہ احمد عبدالحق مہاجر الہ آبادی حنفی کہ مانعین کے پیرانِ پیر حاجی امداداللہ صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' میں تصریح کی کہ فقیر کا مشرب یہ ہے کہ ذریعہ برکات سمجھ کر ہر سال مولود کرتا ہے اور قیام میں لطف ولذت پاتا ہے۔ اوکمال قال۔

یہ محفل اس ہیئت کذائیہ کے ساتھ اگرچہ قرون ثلاثہ میں نہ تھی مگر اس کی وجہ سے حرام وگناہ نہیں ہوسکتی۔ حدیث گزر چکی کہ اگر نوایجاد چیز اچھی ہے تو ایجاد کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا اور عمل کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا۔ اور سب کے برابر ایجاد کرنے والے کو ملے گا۔ اس لیے کہ اس حدیث کے مطابق جس نے میلاد شریف اس ہیئت کے ساتھ ایجاد کیا وہ بھی ثواب کا مستحق ہے۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک جن جن لوگوں نے یہ محفل کی یا قیامت تک کریں گے سب ثواب کے مستحق ہیں، اور سب کے برابر ایجاد کرنے والے کو ثواب ملے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم (ماہنامہ اشرفیہ: اگست ۱۹۸۲ء صفحہ: ۱۰ تا ۱۶)



سیرت نبوی کی بنیادی کتابیں

سیرت پر اگرچہ سیکڑوں تصنیفات موجود ہیں۔ مگر ان سب کا سلسلہ ان چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے۔ سیرت ابن اسحاق، سیرت امام واقدی، طبقات ابن سعد، تاریخ طبری۔ ان کے علاوہ بقیہ جتنی کتابیں ہیں وہ تمام کی تمام انہیں کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ البتہ بعض کتابوں میں کتب احادیث سے بھی مواد فراہم کیا گیا ہے، وہ مستثنیٰ ہیں، یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے فن سیرت کو غیر مستند و غیر معتبر ثابت کرنا چاہے، انہوں نے اپنی تنقید کی پوری قوت انہیں کتابوں پر صرف کر دی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم بھی ان چار کتابوں کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کی رائے نقل کر کے فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیں۔

محمد بن اسحٰق:

یہ تابعی ہیں، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کی ہے۔ امام زہری کے تلمیذ خاص ہیں۔ امام زہری تابعی اور جلیل القدر محدث امام بخاری جیسے محدث کے مشائخ میں سے ہیں۔ ابن اسحٰق کی جلالت شان کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ امام زہری جیسے یگانۂ روزگار امام کے ایسے خاص تلمیذ ہیں کہ امام زہری کے دروازے پر دربان رہتا تھا۔ کوئی شخص بلا اجازت باریاب نہیں ہو سکتا تھا مگر ابن اسحٰق کو اجازت عام تھی، جب چاہیں حاضر ہو جائیں۔

ان پر بعض محدثین نے بہت سخت جرحیں کی ہیں۔ یہاں تک کہ ہشام بن عروہ، پھر امام مالک، پھر وہب، پھر یحییٰ قطان نے کذاب کہا:

اخرجه ابن عدی عن ابی بشر الدولابی و محمد بن جعفر بن یزید عن ابی قلابة الرقاشی ثنی ابو داؤد وسلیمان بن داؤد قالا قال یحیی القطان ان محمد بن اسحق کذاب قلت ما یدریک ؟ قال قال وهب فقلت لوهب ما

یدریک؟ قال قال لی مالک بن انس فقلت لمالک وما یدریک ؟ قال هشام بن عـــروة قلت لهشام بن عروة وما یدریک؟ قال حدث عن امراتی فاطمہ بنت المنذر وادخلت علی وهی تسع و ما راها رجل حتی لقیت الله .

ابن عدی نے ابو بشر دولابی محمد بن جعفر بن یزید سے روایت کی وہ ابو قلابہ رقاشی سے روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ابوداؤد اور سلیمان بن داؤد نے بیان کیا کہ یحییٰ قطان نے کہا محمد بن اسحٰق کذاب ہیں۔ میں نے پوچھا آپ نے کیسے جانا؟ انہوں نے بتایا کہ مجھے وہب نے اور ان کو امام مالک نے اور ان کو ہشام بن عروہ نے بتایا کہ وہ میری زوجہ فاطمہ بنت منذر سے روایت کرتے ہیں۔ حالاں کہ وہ نو سال کی عمر میں میرے یہاں آئی ہے اور زندگی بھر کسی غیر مرد نے اسے نہیں دیکھا۔

مگر عند التحقیق ابن اسحٰق کا ثقہ ہونا ہی ثابت ہے۔ سیر و مغازی کے علاوہ احکام میں بھی ان کی روایت لائق احتجاج ہے۔ ان پر جو جرحیں کی گئی ہیں، ان کا ائمہ حدیث نے جواب دیا ہے۔ ابھی جو جرح مذکور ہوئی، میزان میں اس کا جواب یہ دیا اس جرح کا مدار یہی ہے نا کہ فاطمہ بنت منذر کو کسی غیر مرد نے نہیں دیکھا ان سے روایت کیسے کرتے ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ ابن اسحٰق نے فاطمہ سے مسجد میں حدیث سنی ہو، یا بچپن میں سنی ہو، اس کا بھی احتمال ہے کا فاطمہ نے پردہ کے پیچھے سے یہ حدیث ابن اسحٰق سے بیان کی ہو۔

امام ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

توثیق ابن اسحاق هو الحق الا بلج ومانقل عن کلام مالک فیه لا یثبت ولو صح لم یقبله اهل العلم کیف و قال شعبة فیه هو امیر المومنین فی الحدیث وروی عنه مثل الثوری وابن ادریس وحماد بن زید وزید بن ربیع وابن علیة وعبد الحارث وابن المبارک واحتمله احمد وابن معین وعامة اهل الحدیث غفر الله تعالیٰ لهم وقد قال البخاری فی توثیقه فی کتاب جزء القـــراءة خلف الامــام له ذکره ابن حبان فی الثقات وان مالک رجع عن الکلام فی ابن اسحاق واصطلح معه وبعث الیه هدیة.

ابن اسحٰق کا ثقہ ہونا ہی حق ظاہر ہے۔امام مالک کا جو کلام ان کے بارے میں منقول ہے وہ ثابت نہیں اور اگر وہ صحیح بھی ہو تو اسے اہل علم نے قبول نہیں کیا۔ کیسے قبول کریں حالاں کہ شعبہ نے ان کی شان میں فرمایا ہے کہ وہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں، اور ابن اسحٰق سے ثوری اور ابن ادریس اور حماد بن زید اور زید بن ربیع اور ابن علیہ اور عبد الحارث اور ابن مبارک جیسے (اکابر) نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابن معین نے ان سے روایت لی ہے۔(اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے)

اور امام بخاری نے اپنی کتاب جزء القراءت خلف الامام میں ان کی توثیق کی، اور ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے، اور امام مالک نے ابن اسحٰق پر جو جرح کی تھی، اس سے رجوع فرمالیا اور ان سے صلح کر لی اور ان کے پاس ہدیہ بھیجا۔

ان پر جو جرحیں کی گئیں ہیں امام بخاری جزء القراءت میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

رأيت علي بن عبد الله يحتج بحديث ابن اسحاق وقال علي عن ابن عيينة ما رأيت احدا يتهم محمد بن اسحاق .

میں علی بن عبداللہ کو ابن اسحٰق کی حدیث سے احتجاج کرتے دیکھا ہے اور علی نے ابن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے کسی کو نہیں جانا۔ جس نے محمد ابن اسحٰق کو متہم کیا ہو۔

ان اقوال ائمہ سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ محمد بن اسحٰق ہر حیثیت سے مستند اور ثقہ ہیں۔ عام اہل حدیث نے ان سے روایت کی ہے بلکہ حسب ارشاد شعبہ وہ حدیث میں امیر المومنین کے درجہ پر فائز ہیں۔ اور امام مالک نے جو ان پر جرح کی ہے، اسے اہل علم نے قبول نہیں کیا بلکہ خود امام مالک نے اس سے رجوع کر لیا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بسا اوقات ائمہ حدیث کسی راوی پر جرح کرتے ہیں، مگر وہ جرح واقع کے مطابق نہیں ہوتی۔

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ابن اسحٰق، یہود ونصاریٰ سے روایت کرتے تھے۔ اور ان کو ثقہ جانتے تھے۔ ابن حبان نے اسی جرح کو ذرا واضح کر کے یوں بیان کیا ہے کہ محدثین کو ابن اسحٰق کی کتاب پر جو اعتراض تھا یہ تو تھا کہ انہوں نے خیبر کے واقعات ان یہودیوں

سے نقل کیے ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے اور یہ واقعات ان لوگوں نے یہودیوں ہی سے
ہوں گے اس لیے ان پر کامل اعتماد نہیں کیا جاسکتا لیکن جب کہ ابن حبان نے خود تصر
کردی ہے کہ ابن اسحاق نے خیبر کے واقعات یہودیوں سے نہیں لیے تھے بلکہ انہوں
واقعات ان مسلمانوں سے لیے تھے جو پہلے کبھی یہودی تھے، اور اسی بناپر وہم کیا جاسکتا
کہ شاید ان لوگوں نے یہودیوں سے واقعات سنے ہوں۔ لیکن جس طرح کسی کو یہ توہم
اسی طرح ہم کو اس پر یقین ہے کہ ابن اسحٰق نے جو خیبر کے واقعات اپنے مغازی میں تحر
کیے ہیں۔ ان کے راوی یہود نہیں، بلکہ مسلمان ہیں۔ کیوں کہ ابن اسحٰق کی یہ روایتیں مرسل
ہیں۔ اگر متصل ہوتیں تو راویوں سے خود معلوم ہو جاتا کہ یہ یہودی تھے کہ نصرانی یا مسلمان
اور یہ امر اپنی جگہ ثابت ہے کہ ثقہ اور مستند محدث جب کسی روایت کی سند حذف کرتا ہے
اسی بناپر حذف کرتا ہے کہ اسے راویوں کی تعدیل وتوثیق پر پورا اعتماد ہے اور یہی وجہ ہے ک
حدیث مرسل دربارۂ احکام بھی عند التحقیق حجت ہے۔

مقدمۂ اشعۃ اللمعات میں ہے:

ونزد ابوحنیفہ و مالک رحمۃ اللہ علیہما مقبول است مطلقاً وایشاں گویند کہ ارسال بجہت کمال وثوق واعتماد است زیرا کہ کلام در ثقہ است واگر نزد وے صحیح نمی بود ارسال نمی نمود۔

ترجمہ: امام ابوحنیفہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک مرسل مقبول ہے مطلقاً، اور یہ لوگ فرماتے ہیں کہ ارسال کمال وثوق اور اعتماد کی بناپر ہے۔ اس لیے کہ کلام ثقہ کے ارسال میں ہے، اگر اس کے نزدیک صحیح نہ ہوتی تو ارسال نہیں کرتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ ابن اسحٰق فن سیرت کے نہایت ثقہ اور عادل امام ہیں بلکہ عند التحقیق حدیث میں بھی مقبول و مستند ہیں۔ ان کی کتاب المغازی سیر میں متفقہ طور پر مستند اور لائق اعتبار کتاب ہے، ان کی وفات ۱۵۱ھ میں ہوئی۔

امام واقدی:

ان کا نام محمد بن عمر الواقدی الاسلمی ہے۔ ان پر بعض علما نے سخت سے سخت جرحیں کیں جیسا کہ میزان وتہذیب وغیرہ میں موجود ہے۔

اور آج کل تو تقریبا اس کو اجماعی مسئلہ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جوش تعصب میں لوگ یک طرفہ جرح نقل کر کے خوب خوب ان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ لیکن ٹھنڈے دل سے تعصب نکال کر امام واقدی کے حالات جرح کے سلسلہ میں لوگوں کے دعویٰ اور دلیل میں مطابقت اور استقصا کے ساتھ ان کے بارے میں جو کہا گیا ہے، اس پر غور کرتے ہیں، تو واقعہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ اگر کچھ لوگ ان کو متروک وضاع کذاب کہہ رہے ہیں، تو دوسرے ائمہ ان کو ثقہ عادل متند بتا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ائمہ نے مخصوص طور پر اپنی کتابوں میں ان کے ثقہ اور عادل ہونے کے عنوانات قائم کیے ہیں۔ ان کے متعلق تمام موافق اقوال نقل کر کے ایک ایک مخالف اقوال کا جواب دیا ہے۔ اور تمام موافق اقوال کو دلائل سے مؤید کر کے ان کا ثقہ ثبت عادل متند ہونا ثابت کیا ہے۔

امام ابن ہمام صاحب فتح القدیر جن کی جلالت شان، تبحر علمی تحقیق و تدقیق تمام دنیائے اسلام میں مسلم ہے۔ فتح القدیر فصل آسار میں فرماتے ہیں:

قال فی الامام جمع شیخنا ابو الفتح الحافظ فی اول کتابه المغازی والسیر من ضعفه ومن وثقه ورجح توثیقه وذکر الاجوبة عما قیل.

امام واقدی کے بارے میں ہمارے شیخ ابو الفتح حافظ نے اپنی کتاب مغازی وسیر کے شروع میں مخالف وموافق تمام اقوال جمع کر کے ان کے ثقہ ہونے کو راجح ثابت فرمایا، اور ان پر جتنی جرحیں کی گئی، سب کا جواب دیا۔

علامہ بدر الدین محمود عینی عمدۃ القاری شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

وقال ایضا الواقدی شدید الضعف اذا انفرد فکیف اذا خالف قلت ذکر الحافظ المزنی ولم یتعرض الی شیء من ذلک ومن العجب ان الواقدی احد مشائخ الامام الشافعی ویحط علیه هذا الحط وهو ان کان ضعفه بعضهم فقد وثقه آخرون فقال ابراهیم الحربی الواقدی امین الناس علیٰ اهل الاسلام وعن مصعب بن زبیر ثقة مامون وکذا وثقه ابو عبیدة واثنی علیه ابن المبارک وآخرون (صفحة ۱۵۹: جلد ۱۸)

یہ بھی کہا کہ واقدی جب منفرد ہوں تو بھی سخت ضعیف ہیں تو اگر مخالف ہوں تو کیا حال ہوگا، یہ حافظ مزنی نے ذکر کیا۔ اور اس پر کچھ نہیں کہا۔ تعجب یہ ہے کہ واقدی امام شافعی کے مشائخ میں سے ہیں، اور یہ ان کو اتنا گرا رہے ہیں۔ امام واقدی کو اگرچہ بعض لوگوں نے ضعیف بتایا ہے مگر دوسرے لوگوں نے ان کو ثقہ کہا ہے، ابراہیم حربی نے کہا: واقدی اہل اسلام کے امین ہیں۔ مصعب بن زبیر سے مروی ہے کہ انہوں نے بھی واقدی کو ثقہ مامون کہا۔ یوں ہی ابو عبیدہ نے توثیق کی، اور عبد اللہ بن مبارک اور دوسرے لوگوں نے ان کی تعریف کی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مشائخ میں سے ہونا ہی امام واقدی کی جلالت شان کے لیے کافی تھا۔ اس سونے پر سہاگہ یہ کہ عبد اللہ بن مبارک جو امام بخاری کے مشائخ میں سے ہیں، اور ان کے ہم پلہ دوسرے اماموں نے ان کی تعریف کی ہے۔ مصعب بن زبیر اور ابو عبیدہ جیسے مسلم الثبوت بزرگوں نے ان کو ثقہ مامون کہا ہے حتی کہ ابراہیم حربی نے یہ شاندار خطاب دیا:

امین الناس علیٰ اہل الاسلام

کیا ان روشن تصریحات کے بعد بھی صاحب سیرۃ النبی وغیرہ کی یک طرفہ متعصبانہ جرح کی کوئی علمی حیثیت باقی رہجاتی ہے؟ کہاں وہ شد ومد کہ اگر واقدی سچا تو دنیا میں کوئی جھوٹا نہیں اور کہاں ائمہ حدیث کی یہ زوردار توثیق وتعدیل لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اب علم دنیا سے اٹھ گیا اور اب تنقیدی جائزہ لینے والا کوئی موجود ہی نہیں۔ جس پر ہم چھری چلا دیں گے، اسے دنیا مذبوح مان لے گی۔ لیکن اب واقدی کے ساتھ بغض رکھنے والے سوچیں کہ دنیا ان ائمہ کے یہ ارشادات پڑھے گی تو انہیں کیا کہے گی۔

امام واقدی کے متعلق یہ بحث اور اختلاف اس صورت میں ہے کہ ان کی مرویات دربارۂ احکام مقبول ہیں کہ نہیں اور آپ نے دیکھا کہ راجح مختار یہی ہے کہ وہ باب احکام میں بھی ثقہ مامون مقبول مستند ہیں۔ رہ گئے سیر ومغازی، فضائل ومعجزات کے ابواب، اس سلسلہ میں امام واقدی کا مقبول ومستند ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے، اس میں کسی ایک کا

اختلاف نہیں، جس کی دلیل تمام کتب وسیر مغازی میں ان کی مرویات کا اخذ وقبول ہے، اور اہل علم جانتے ہیں کہ تلقی امت کا کیادرجہ ہے۔اسی لیے میزان میں فرمایا:

کان الی حفظہ المنتھی فی الاخبار والسیر والمغازی والحوادث وایام الناس وغیر ذالک۔

اخبار، سیر، مغازی، حوادث اورایام وغیرہ میں امام واقدی ہی کے حفظ تک منتہی ہے۔

اس لیے سیر ومغازی کے سلسلہ میں ان کی مرویات کے مقبول وغیر مقبول ہونے کی بحث ایجاد بندہ سے زائد اورامت میں انتشار وافتراق کی کوشش کے سوا اورکوئی علمی خدمت نہیں کہی جاسکتی۔

امام واقدی کے وضاع وکذاب ہونے کے ثبوت میں آج سب سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے:

اورحقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑا سے بڑا واقعہ نگارچشم دید واقعات قلم بندنہیں کرسکتا۔(سیرت النبی۔صفحہ:۴۴)

اس مبارک متن کی شرح یہ ہے کہ مثلاً حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فلاں جنگ میں فلاں پہلوان سے مقابلہ کیا۔جو اتنا موٹا تگڑا تھا، اس کے پاس فلاں فلاں اسلحے تھے، فلاں فلاں لباس پہنے ہوئے تھا، اس نے آکر پہلے یہ کہا: حضرت خالد نے اس کا یہ جواب دیا۔پھر اس نے نیزہ کا وار کیا۔حضرت خالد نے ردکردیا، یا پینترا بدل کر وار خالی کردیا اورآگے بڑھ کر اس کا نیزہ چھین لیا، اب اس پہلوان نے تلوار چلائی۔حضرت خالد نے اسے سپر پرلیا، پھر سیف اللہ نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، یا وہ تلوار اس کے سر پر پڑی خود کٹا سر دوٹکڑے ہوگیا۔تلوار سر سے گزر کر کمر تک چیرتی ہوئی نکل گئی۔(یہ صرف تمثیلاً ہے کوئی واقعہ نہیں)

علامہ کا فرمانا ہے کہ یہ تمام تفصیلات یاد کرلینا آج کے اہل حفظ وضبط کی قوت سے باہر ہے، لہذا یہ جھوٹ اورمن گڑھت ہے، لیکن قبلہ اس زمانے کے اہل حفظ وضبط پر اس

زمان برکت نشان کے حفاظ کو قیاس کرنا ہی وہ غلطی ہے، جس کے بعد کتب حدیث کا پورا ذخیرہ فرضی داستان کی صف میں آجاتا ہے، اسی بنیادی غلطی کو دور کرنے کے لیے ہم ناظرین کو ذرا تفصیلی مطالعہ کی تکلیف دے رہے ہیں۔

امام واقدی اگر کسی جزئی واقعہ کی جملہ تفصیل بیان کریں تو وہ ان کے کذاب ووضاع ہونے کی شہادت ہے، لیکن بخاری اور مسلم میں بھی اس قسم کی تفصیلات موجود ہیں تو پھر آپ کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے۔ اٹھایئے صحیحین اور ملاحظہ کیجئے سید الشہداء سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا واقعہ جس تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ کیا واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کسی طرح کم ہے؟ اسی طرح خود آپ کی اصح کتب بعد کتاب اللہ میں ایک دو نہیں دسیوں جزئیات کی وہ حیرت انگیز تفصیلیں مذکور ہیں، جو واقدیؒ نے بھی نہیں بیان کیں مثلاً غزوۂ بدر میں حضرت زبیر بن عوام اور ابوذات کرش کا مقابلہ اور اس کی پوری تفصیل کیا امام واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کم ہیں؟ ابوذات کرش کسی طرح لوہے میں غرق آیا۔ حضرت زبیر نے کیسے اس کی آنکھ میں برچھی ماری، اور یہ برچھی پھر کیسے نکلی، اور اس کی نوک ٹیڑھی ہوئی پھر کس کے پاس رہی پھر کس نے کس قیمت پر خریدی۔ کیا واقدی کے یہاں کسی مجاہد کی تلوار یا برچھی کے بارے میں اتنی لمبی معلومات ہیں۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر امام بخاری جزئی جزئی باتوں کی تفصیلات بیان کریں تو وہ حفظ وضبط کے جبل شامخ ہوں، اور اسی کو آپ بیان کریں تو آپ کی کتاب اصح کتب ہو، اور امام واقدی بیان کریں تو جھوٹے کذاب وضاع ہوں ان کی کتاب میں ہو تو وہ اکذب کتب ہو۔ "سبحنک ھذا بھتان عظیم"

بات دراصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں جنگ کا شجاعانہ طریقہ یہ تھا کہ فوج سے ایک ایک آدمی نکل کر مقابلہ کرتے اور ابتداءً فوج کے منتخب تجربہ کار افراد باہر نکلا کرتے۔ ایسی صورت میں پوری فوج کو لڑنے والوں کی جملہ حرکات وسکنات بغور دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملتا تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فوج کو وہ ساری تفصیل معلوم ہوجاتی، جو ان دونوں نبرد آزما کو پیش آئی۔ اور اگر عام دھاوا ہوجاتا جسے اس وقت جنگ مغلوبہ کہا جاتا تھا تو بھی جو لوگ

جنگ کے طریقہ کار سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مقابلہ ہمیشہ ماہر بہادر کیا کرتے تھے ان کے آس پاس کچھ لوگ ان کی امداد اور حفاظت کے لیے موجود رہتے ۔ یہ لوگ اپنے اپنے نبرد آزما کی ہر حرکت ونقل پر پورے تیقظ کے ساتھ نگاہ رکھتے تھے ۔ اس بنا پر جنگ مغلوبہ کی صورت میں بھی کچھ لوگوں کا ہر قسم کی تفصیلی معلومات محفوظ کر لینا بعید از قیاس نہیں عام طور پر اس قسم کی تفصیلات باعث دلچسپی ہوتی ہیں، لوگ سننے سنانے کے شائق ہوتے ہیں، اس لیے وہ سینہ بسینہ منتقل ہو کر سفینہ میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔

یہی چیز امام واقدی کے یہاں موجود ہے ۔ پھر اس پر طعن کرنا انصاف ودیانت کا خون کرنا ہی نہیں بلکہ جمیع کتب احادیث کے دفتر کو برباد کرنے کا دروازہ کھولنا ہے، بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس زمانے کے حفاظ کو آج کے مشاہدین ومورخین پر قیاس کیا گیا۔ آپ ذرا سوچیے! حضرت امام بخاری کے متعلق محدثین نے تصریح کی ہے کہ ان کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ انہوں نے خود فرمایا ہے کہ میں نے اپنی جامع صحیح کو تین لاکھ صحیح احادیث سے منتخب کیا ہے ۔ یہ تین لاکھ احادیث تو بہت ہیں، صرف صحیح بخاری میں جتنی احادیث ہیں ان کو مع سند آج کا کوئی متحفظ یاد کر سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ مگر امام بخاری کے حفظ وضبط کو سنیے۔ انہوں نے چھ لاکھ احادیث کو بھی یاد کیا، اور ان کے متعلق اس قسم کی گونا گوں تفصیلیں بھی یاد رکھیں۔ فلاں متن کی فلاں سند ہے، اس کے رُواۃ میں تلمیذ وشیخ کی یہ ترتیب ہے ۔ شیخ کی وفات فلاں وقت ہوئی، تلمیذ فلاں وقت سماع وتحمل کے لائق ہوا۔ تلمیذ وشیخ میں ملاقات ہوئی فلاں سند میں فلاں راوی ثقہ ہے، فلاں مطعون ہے ۔ اس پر طعن یہ ہے ۔ مثلاً وہ متروک ہے، منکر ہے فلاں مختلط ہے، فلاں مجہول ہے ۔ فلاں مدلس ہے، فلاں فاسق ہے، فلاں مبتدع ہے ، فلاں کذاب ہے، فلاں وضاع ہے، اس راوی پر فلاں محدث نے یہ طعن کیا، فلاں نے یہ جواب دیا، فلاں نے اس کے بارے میں مجھ سے یہ کہا، مگر صحیح یہ ہے کہ وہ ویسا نہیں، یہ حدیث اس سند سے صحیح ہے اس سند سے حسن ہے، اس سند سے ضعیف ہے، صحیح کے درجے سے تنزل کی وجہ سے یہ ہے، ضعیف اس وجہ سے ہے، یہ حدیث میں نے شیخ کے سامنے پڑھی، وہ حدیث شیخ نے پڑھ کر مجھے سنائی تھی، یہ مجمع میں سنی یا سنائی وغیرہ وغیرہ۔

احادیث کے متعلق یہ ساری تفصیلات اتنی ضروری اور اہم ہیں کہ اگر یہ تفصیلیں نہ یاد کی جائیں تو پھر حدیث وصحیح وحسن ضعیف میں بلکہ حدیث وغیرحدیث میں امتیاز مشکل ہو جائے۔ اسی وجہ سے اس عہد کے تمام محدثین اور فقہا احادیث کے متن ساتھ ساتھ اس قسم کی جملہ تفصیلات کامل طور سے محفوظ رکھتے تھے، اور آج اس دور ترقی میں بڑا سے بڑا دماغ رکھنے والا مدمغ محتفظ واقعات کے بارے میں اس قسم کی آدھی تفصیل بھی یاد نہیں رکھ سکتا۔ ایسی صورت میں اپنی قوت یادداشت پر قیاس کر کے محدثین وفقہا پر طعن کرنے والے کو آپ بھی یہی جواب دیں گے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

اس لیے امام واقدی پر آپ کے طعن کے جواب میں ہم بھی یہی عرض کر کے رخصت ہوتے ہیں، کہ اگر واقدی پر آپ کی جرح صحیح مان لی جائے تو اگر آپ ہی سے سیکھ کر کوئی یہ کہے:

حقیقت یہ ہے کہ محدثین اور فقہا کی تصانیف خود اس بات کی شہادت ہیں، ایک ایک جزئی روایت کے متعلق اس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ یاد رکھتے ہیں، کہ آج بڑے سے بڑا دماغ رکھنے والا محتفظ بھی نہیں یاد رکھ سکتا۔

تو بولیے! دین ومذہب کا کوئی ٹھکانہ رہا؟ بخاری ومسلم کو جانے دیجئے، جناب کی اصح کتب کا کیا حال ہوگا؟ یہی مجھے رونا ہے کہ آپ نے نشہ تحقیق وتصحیح میں وہ وہ لکھ مارا ہے جس کی رو میں تمام دینیات بہ سکتے ہیں۔

ہم اس بحث کو اس تصفیہ پر ختم کرتے ہیں کہ امام واقدی کا ثقہ عادل مستند ہونا ہی صحیح ومرجح ہے۔ ان کی مرویات دربارۂ احکام بھی مقبول ہیں اور سیر ومغازی کے وہ بالاتفاق امام مستند ہیں، یہی میزان میں فرمایا:

وکان الیٰ حفظه المنتهی فی الاخبار والسیر والمغازی والحوادث و ایام الناس وغیر ذٰلک.

امام واقدی کے ہی حفظ تک اخبار، سیر، مغازی، حوادث، واقعات وغیرہ میں منتہی ہے

ان کی وفات ۲۰۷ھ میں ہوئی۔

ابن سعد:۔

ان کا نام بھی محمد ہے۔ کاتب واقدی سے مشہور ہیں۔ امام واقدی کے تلمیذ خاص ہیں۔ نہایت ثقہ مستند مقبول الحدیث صاحب سیرت امام ہیں۔ اس کے باوجود کہ لوگوں نے ان کے استاذ پر سخت سے سخت جرحیں کی ہیں، مگر ان کو سب نے متفقہ طور پر ثقہ اور عادل کہا ہے ان کی کتاب کا نام "طبقات ابن سعد" ہے۔ یہ بارہ جلدوں کی مبسوط کتاب ہے۔ ان میں دو جلدیں سیرت نبوی ہیں، بقیہ دس جلدیں صحابہ و تابعین کے حالات میں ہیں یہ کتاب نایاب ہو چکی تھی، جرمن نے بڑے اہتمام سے چھاپ کر شائع کیا ہے۔

جدید مہربانوں کو جب کوئی گنجائش نہ ملی تو لا محالہ انہیں ثقہ کہنا پڑا۔ لیکن اس طرح سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ مستند ہو جاتا تھا، اس لیے ان پر یہ بے تکی جرح کر دی۔

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں۔ اس لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رُواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں، اور بعض غیر ثقہ۔

یعنی حسب تحقیق آں جناب واقدی جھوٹے کذاب و وضاع اور ان کی مرویات کذب و جعل اور حدیث میں فرمایا ہے:

من حدث عن تحدیث یری انه کذب فهو احد اکاذبین.

جو ایسی حدیث بیان کرے، جسے جانتا ہو کہ جھوٹی ہے تو وہ خود بھی جھوٹا ہے۔

لہٰذا ابن سعد خود بھی جھوٹے، کذاب ہوئے، اور اگر یہ کہا جائے کہ انہیں اپنے استاذ واقدی کا جھوٹا کذاب ہونا معلوم نہ تھا، انہوں نے لاعلمی میں روایت کر دیا تو دوسری حدیث سنیے، فرماتے ہیں:

کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث بکل ماسمع.

کسی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات بیان کر دے۔

اس طرح بھی ابن سعد کا دامن جھوٹ کے داغ سے بری نہیں ہو سکتا۔ پھر مجھے تو

حیرت ہے ہی، ہر ناظر کو حیرت ہوگی کہ ابن سعد کے بارے میں خطیب بغدادی کا یہ قول کس منھ سے نقل کیا گیا:

كان من اهل العلم و الفضل و الفهم و العدالة صنف كتابا كبيرا في طبقات الصحابة و التابعين الى وقته فاجاد فيه و احسن.

ابن سعد اہل علم و فضل و فہم صاحب عدالت ہیں، صحابہ اور اپنے وقت تک کے تابعین کے طبقات میں ایک بہت بڑی کتاب تصنیف کی جو بہت عمدہ اور اچھی کتاب ہے۔

اپنی کتاب میں وہ بھی نصف سے زائد وضاع کذاب کی روایت داخل کرنا اس پر بغیر نقد و جرح کئے بیان کرنا۔صاحب علم و فضل و فہم عدالت کا کام نہیں، لیکن جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہو کہ امام واقدی ثقہ عادل مامون مقبول ہیں اس لئے ان کی وجہ سے ان کے تلمیذ جلیل پر بھی حرف نہیں آسکتا اور نہ ان کی تصنیف پر۔ان کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی ہے۔

امام واقدی اور ان کے تلمیذ ابن سعد پر اتنی زور دار جرح صرف اس وجہ سے ہے کہ علامہ کی دانست میں یورپ کے مستشرقین کو اعتراض کرنے کے مواد انہیں کے کتابوں سے ملے ہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں۔مثلا مغازی واقدی سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحٰق، تاریخ طبری وغیرہ دوسری جگہ ہے۔

مثلا اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔

یورپین متعصبین کے اعتراض کے جوابات یہ نہیں تھے کہ یہ ائمہ جھوٹے کذاب وضاع ناقابل استناد ہیں۔بلکہ ان کے تعصب خیانت کی پردہ دری ہے۔لیکن کیا کیا جائے شمس العلما ہونا اور بات ہے اور دین میں تفقہ و تیقظ اور چیز ہے۔

محب الدین بن جریر طبری:

یہ بھی مسلم الثبوت عادل ثقہ مستند محدث اور مفسر ہیں ان کی تفسیر احسن التفاسیر سمجھی جاتی ہے، ان کی کتاب تاریخ کبیر نہایت مفصل اور جامع مستند کتاب ہے۔ان کی یہ کتاب

بھی نایاب تھی یورپ نے چھاپ کر شائع کیا۔ان پر سلیمانی نے یہ طعن کیا کہ یہ روافض کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے،اس کا جواب علامہ ذہبی نے ان زوردار الفاظ میں دیا:

هٰذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار ائمة الاسلام والمعتمدين.

یہ جھوٹی بدگمانی ہے۔حقیقت میں ابن جریر اسلام کے ایک بڑے امام اور معتمد ہیں۔

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ان کے بعض شیوخ مثلاً سلمہ ابرش ضعیف ہیں لیکن سلمہ ابرش کو ابن معین جیسے ماہر نقاد امام نے ثقہ کہا ہے۔خصوصاً سیر مغازی میں سلمہ کی سیر کو احسن السیر کہا گیا ہے،اور تقریباً یہی حال امام طبری کے دوسرے مشائخ کا ہے،خلاصہ کلام یہ ہے کہ طبری امام معتمد ثقہ ہیں،ان کی کتاب تاریخ کبیر بہت مقبولہ و مستند کتاب ہے۔بعد کے تمام مورخین کا یہی ماخذ ہے۔ان کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔

یہ چاروں کتابیں سیر و مغازی کی بنیاد ہیں۔اس لئے فن سیرت کو بے اعتبار کرنے کے لئے ان پر سخت سے سخت طعن کئے گئے ہیں۔لیکن سطور بالا پڑھنے والوں پر یہ بات اچھی طرح روشن ہوگئی کی محض طعن و جرح سے یہ فن مجروح نہیں ،ہوسکتا اور نہ یک طرفہ جرح سے کسی امام کو ناقابل استناد کہا جا سکتا ہے۔ان ائمہ پر اگر کچھ ناقدین نے طعن کئے تو دوسرے اکابر نے اس کا جواب دیا۔ان کو ثقہ معتمد کہا،اور جب مصنفین مستند ہیں تو ان کی تصنیفات کا مستند ہونا بدیہی امر ہے۔یہی وجہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام نے ان ائمہ کی کتابوں کو قبول کیا،انہیں کتابوں سے روایتیں اخذ کرکے دوسری کثیر تصانیف تیار کیں۔ماہر دینیات جانتا ہے کہ تلقی امت خود کسی تصنیف کے معتمد و مستند ہونے کے لئے کافی ہے۔لیکن ماتم کی بات یہ ہے کہ اب یہ شگوفہ کھلایا جارہا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا،یہ لوگ شریف واقعہ نہیں،اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور راویوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں،لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں۔

اس کے علاوہ ابن اسحٰق کی اصل کتاب ہندوستان میں موجود نہیں۔ابن ہشام نے

ابن اسحٰق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا، وہی آج موجود ہے، لیکن ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں۔ ابن مدینی (امام بخاری کے استاذ) کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے میں نے اس کو ترک کردیا: ابو حاتم کہتے ہیں کہ وہ استناد کے قابل نہیں۔

نسائی کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں۔ ابن اسعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اسی لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رواۃ میں بعض ثقہ ہیں، اور بعض غیر ثقہ۔

طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمہ ابرش ابن سلمہ ضعیف الروایہ ہیں۔
(سیرۃ النبی صفحہ:۴۵، مصنفہ شبلی اعظم گڑھی)

کتب سیرت کے متعلق وہ بھی بنیادی کتابوں کے بارے میں اس تبصرہ سے ہر شخص یہی سمجھے گا کہ جب ائمہ فن اور ان کی تصنیفات کی یہ ناگفتہ بہ حالت ہے کہ جھوٹ کذب متروک، غیر مستند، مرویات سے بھری ہوئی ہے، تو پھر اس مبارک فن کی وقعت شاہنامہ فردوسی سے زائد اور کیا ہوگی۔ لیکن پھر حیرت اور سخت حیرت ہے کہ جس شخص کی یہ تحقیق ہو، وہی اس عظیم فن پر تمام دنیا سے ان الفاظ میں کس طرح مباہات کرتا ہے:

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا ہے کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہو سکے، اور نہ آئندہ توقع کی جاتی ہے۔ (سیرۃ النبی صفحہ:۸)

علامہ تو موجود نہیں کہ ان سے کچھ گزارش کریں لیکن ہر ذی انصاف سے اتنی بات کہنی ہے کی زیاد بکائی کے واسطہ سے جو ضعف بقول آپ کے پیدا ہو گیا ہے، وہ سیرت ابن ہشام میں پیدا ہوگا۔ رہ گئی ابن اسحٰق کی کتاب تو وہ زیاد بکائی کے واسطہ سے پاک ہے، پھر خواہ مخواہ کھینچ تان کر اسے ضعیف بتانا دیانت کا خون کرنا ہے۔ رہ گئی سیرت ابن ہشام تو:

اولا: ابن اسحٰق کی اصل کتاب ہندوستان میں بھی موجود ہے، اور ہندوستان کے باہر بھی موجود ہے اگر چہ بہت کم اس سے مقابلہ کر کے ابن ہشام کی کتاب میں زیاد بکائی کے واسطہ سے جو ضعف بقول آپ کے پیدا ہو گیا ہے، اسے دور کیا جا سکتا ہے۔

ثانیا: زیاد بکائی کا رتبہ آپ کو بھی تسلیم ہے۔ ان کا یہ مسلمہ رتبہ کس سلسلہ میں ہے۔ ان کا یہ رتبہ آپ ظاہر کر دیتے تو آپ کی حق پرستی پر کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ زیاد بکائی سیر و مغازی میں بالاتفاق ثقہ و مستند ہیں، ابن مدینی ابو حاتم نسائی کا ان پر طعن وہی درجہ رکھتا ہے، جو ابن اسحٰق وغیرہ پر طعن کا ہے۔

ثالثا: اس طعن کا حاصل صرف یہ ہے کہ وہ ضعیف الروایہ ہیں، اور فضائل و سیر میں روایات ضعاف بالاجماع مقبول ہیں، جس کی تفصیلی بحث ابھی آتی ہے۔ رہ گئی طبقات ابن سعد، جب کہ امام واقدی کا ثقہ و مستند ہونا ثابت ہو چکا تو اس کتاب کا نصف سے زائد حصہ کا مستند و مقبول ہونا ثابت ہو گیا، رہ گئیں نصف سے کم روایتیں ان میں بعض کا ثقہ ہونا آپ کو بھی مسلم۔ اس بعض سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اکثر یا اقل۔ اگر اکثر مراد ہیں تو آپ ہی کی تحقیق کے مطابق طبقات کا ربع سے بھی کم غیر مامون رہا، اور آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ کسی کتاب میں کچھ حصہ اگر رطب و یابس ہے تو وہ کتاب غیر مستند نہیں کہی جاتی، ورنہ امان اٹھ جائے، کوئی سوائے قرآن مجید کے مستند نہ رہے گی۔

طبری کی تاریخ کبیر کے بعض رواۃ مثلا سلمہ ابرش و ابن سلمہ وغیرہ پر جو طعن ہیں وہ

اولا: مرجوح ہیں۔

ثانیا: ان کا مفاد یہی ہے کہ وہ ضعیف ہیں، اور سیر و مغازی میں ضعاف بالاتفاق مقبول ہیں۔ جیسا کہ آپ نے خود ابن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ سیر و مغازی میں ان کی توثیق کرتے تھے، اور ان کی سیرت کو بہترین سیرت کہتے ہیں۔

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ اس زور و شور کی تنقید کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ صرف اتنا۔

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں۔ البتہ ان میں تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

اس نتیجہ کو دیکھ کر ہمیں شبہہ ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ انہیں مقدمات کا ہے، جو ابھی مذکور ہوئے یا کسی اور کا۔ پھر یہ کہ:

اولا: کس نے یہ دعویٰ کیا کہ کتب سیر کتب حدیث کے ہم پلہ ہیں۔ پھر اس کی تغلیط کے لئے آپ نے اتنی زحمت کیوں اٹھائی؟۔

ثانیا: آپکا دعویٰ یہ تھا یہ کتابیں مستند نہیں، اور ثابت ہوا کہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں، کسی فن کی کتابیں اگر کتب حدیث کے ہم پلہ نہ ہوں تو ان کا غیر مستند ہونا کیسے لازم؟ سیرت کا درجہ استناد مخصوص ہے، اور احادیث کا مخصوص۔ اگر ایک فن اپنے اعلیٰ فن سے فروتر ہو تو اس کو بے اعتبار کہنا کیسے صحیح ہے؟ اس طرح تو ایک بے باک یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کتب احادیث غیر مستند ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن کے ہم پلہ نہیں۔ اور جب علم حدیث کا یہ حال ہے تو علم فقہ وتفسیر سب صاف۔ یہ تحقیق ہے یا علوم دینیہ کے تباہ و برباد کرنے کی یورپین مشین؟۔

ثالثا: یہ بات تو حق ہے کہ فن سیرت، فن حدیث کے بلند درجہ کے مساوی نہیں مگر آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ آپ کی تنقید کی روجتنی تیز کتب سیر کی طرف ہے، اتنی ہی کتب حدیث کی طرف بھی ہے۔ آپ نے ہی احادیث کی مسلم الثبوت کثیر کتابوں کے بارے میں لکھا:

ان کتابوں کی قسم میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں، جن پر اعتماد کرنا جائز نہیں۔

مستدرک کے بارے میں تحریر فرمایا:

اس میں بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثیں موجود ہیں۔

آپ نے ہی اصفہانی، ھثیم بن سلیمان، ابونعیم، ابوبکر خطیب، ابو الفضل، ابو موسیٰ مدینی، ابن عساکر، عبد الغنی وغیرہ کی کتابوں کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی:

ان میں بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل حدیثیں ہیں آپ نے ہی وہ حدیث جس میں وقت ولادت ایوان کسریٰ کے کنگورے گرنے کا ذکر ہے، بیہقی، ابونعیم، خرائطی،

ابن عساکر اور ابن جریر کی روایت کے باوجود یہ کہہ کر کے رد کر دیا کہ وہ بخاری و مسلم صحاح ستہ میں نہیں۔

آپ ہی نے صحاح ستہ کی کثیر احادیث کو صرف اس بنا پر نا قابل قبول بتایا کہ وہ آپ کے خیال میں دلائل عقلیہ وقرائن کے مطابق نہ تھیں۔ جب آپ کی تحقیق کے بموجب تمام کتب احادیث کتب سیر کی طرح احادیث موضوعہ مکذوبہ مہملہ مردودہ پر مشتمل ہیں تو آپ کس منطق سے کتب احادیث کے کتب سیر پر تفوق کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کررہے ہیں:

اس بنا پر سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں۔

اب تو آپ کو اور آپ نہیں رہے تو آپ کے مقلدین کو نہایت اطمنان کے ساتھ اعلان کر دینا چاہئے کہ:

احادیث کا ذخیرہ ہماری تحقیق کے ہم پلہ نہیں۔ البتہ جو تحقیق وتنقید کے معیار پر اتر جائے، وہ حجت اور استناد کے قابل ہے، اور اگر کوئی محدثین کے ثقہ اور عادل ضابط محتاط ہونے کو پیش کرے تو صاف صاف اپنی یہ تحقیق پیش کردیں۔

لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا ان کی تصانیت کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا۔ ان لوگوں نے خود حضور سے نہیں سنا ہے جو کچھ بیان کرتے ہیں، اور راویوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں۔

فن سیرت کی گردن پر یہ چھری صرف اس بنا پر چلائی گئی کہ علامہ کا گمان یہ تھا:

مسلمانوں نے اس فن سیرت کو جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔ اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے، جو خود شریک واقعہ تھا، اور اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے کون لوگ تھے، کیسے تھے، کیا مشاغل تھے، چال چلن کیسا تھا، حافظہ کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے کہ غیر ثقہ، سطح الذہن تھے یا دقیقہ بیں، عالم تھے یا جاہل۔ (سیرۃ النبی: صفحہ ۳۵)

فن سیرت کا اتنا بڑا معیار سمجھنا ہی بنیادی غلطی ہے۔ یہ عقاد واحکام کے لئے معیار

ہے، مگر سیر و مغازی، فضائل و مناقب کے لئے ہرگز نہیں۔ ائمہ سیر اور محدثین سب اس پر متفق ہیں کہ سیر مغازی میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایتیں مقبول ہوں گی۔ ظاہر ہے بانیان فن کے قائم کردہ معیار کے علاوہ جدید معیار قائم کر کے فن سیرت کو پرکھا جائے گا، تو سوائے بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کے اور کیا حاصل ہوگا۔ جس طرح آیات قرآنیہ کے معیار پر احادیث کو پرکھنے سے احادیث غیر مستند نظر آئیں گی، اسی طرح احادیث کے بلند معیار پر سیر و مغازی پرکھنے سے یہ کھوٹی دکھائی دیں گی۔ مگر یہ حقیقت میں فن سیرت کا کھوٹ نہیں بلکہ نقاد کی ذہنیت کا۔ اب آیئے علمائے سیر و ائمہ محدثین کے ارشادات سنئے:

۱۔ امام زین الدین عراقی، سیرت منظوم، میں فرماتے ہیں:

و لیعلم الطالب ان السیر یجمع ماصح وما قد انکر

طالب کو معلوم ہو کہ فن سیرت صحیح اور منکر سب کو جمع کرتا ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ؏

ابن اسحاق رجل تکتب عنه هذه الاحادیث یعنی المغازی و نحوها و اذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما هکذا و قبض الاصابع الاربع.

(فتح المغیث)

ابن اسحٰق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ ان سے مغازی وغیرہ کی حدیثیں مقبول ہیں۔ اور جب حلال و حرام کی باری آتی ہے تو ہم ایسے لوگوں کو چاہتے ہیں اور اپنی انگلیاں دبا کر بند کرلیں۔

۳۔ امام بیہقی نے کتاب المدخل میں ابن مہدی کا یہ قول نقل کر کے ثابت رکھا:

اذا روینا فی الحلال والحرام والاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل و الثواب والعقاب سهلنا فی الاسانید و تسامحنا فی الرجال. (فتح المغیث)

جب ہم حلال و حرام میں روایت کرتے ہیں تو سند میں شدت کرتے ہیں۔ اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں، اور جب فضائل، ثواب و عقاب میں روایت کرتے ہیں تو سند میں

نرمی کرتے ہیں اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں:

یہ تینوں عبارتیں سیرۃ النبی میں بھی ہیں۔

۴۔علامہ حلبی ''سیرۃ الانسان والعیون'' میں فرماتے ہیں:

لا یخفیٰ ان السیر یجمع الصحیح السقیم والضعیف والبلاغ والمرسل و المنقطع والمعضل دون الموضوع و قد قال الامام احمد وغیرہ من الائمة اذارویناً فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل و نحوها تسامحنا .

پوشیدہ نہ رہے کہ فن سیرت وموضوع کے علاوہ صحیح ،سقیم،ضعیف، بلاغ،مرسل، منقطع، معضل سب کو جمع کرتا ہے ۔امام احمد وغیرہ ائمہ نے فرمایا: ہم جب حلال وحرام میں روایت کرتے ہیں تو سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایت کرتے ہیں تو نرمی کرتے ہیں۔

۵۔علامہ عبدالباقی زرقانی ''شرح مواہب اللدنیہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

عادة المحدثین التساهل فی غیر الاحکام و العقائد مالم یکن موضوعا

محدثین کی عادت ہے کہ احکام و عقائد کے غیر میں نرمی کرتے ہیں ،جب تک موضوع نہ ہو۔

۶ تا ۱۰: مقدمہ امام ابو عمرو بن الصلاح مقدمہ جرجانیہ ،وشرح الفیہ للمصنف و تقریب النووی اور تدریب الراوی میں ہے،واللفظ للأخیرین:

یجوز عند اهل الحدیث وغیرهم التساهل فی الاسانید الضعیفة و روایة ماسوی الموضوع من الضعیف و العمل به من غیر بیان ضعفه فی فضائل الاعمال وغیرها ممن لاتعلق به بالعقائد و الاحکام وممن نقل عنه ذالک ابن حنبل و ابن مهدی وابن المبارک قالوا اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل و نحو ها تساهلنا .

محدثین کے نزدیک فضائل اعمال وغیرہ میں جن کو عقائد و احکام سے تعلق نہیں ضعیف سندوں میں نرمی برتنا اور موضوع کے علاوہ ہر ضعیف کو اس کا ضعف بیان کئے بغیر

روایت کرنا اس پر عمل کرنا جائز ہے. جن لوگوں سے یہ منقول ہے ان میں امام احمد بن حنبل ابن مہدی اور ابن مبارک بھی ہیں ان لوگوں نے فرمایا ہے کہ ہم جب حلال و حرام میں روایت کرتے ہیں تو سختی کرتے ہیں، اور فضائل وغیرہ میں نرمی برتتے ہیں۔

ان کے علاوہ نصوص کثیر ہیں، کتنی نقل کی جائیں۔ ناظرین انہیں غور سے پڑھیں، ان پر واضح ہو جائے گا کہ ائمہ سیر نے ساتھ ساتھ جملہ محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ عقائد واحکام چھوڑ کر سیر ومغازی فضائل ومناقب میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایت مقبول ومستند ہے سیر ومغازی کا جو معیار ہے، اس کے لحاظ سے روایات ضعاف بھی اس باب میں حجت ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ فن سیرت ہی سرے سے غیر معتبر اور غیر مستند ہے بلکہ یہ ہے کہ سیر ومغازی میں جن امور کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے ان کا اثبات احادیث متواترہ یا مشہورہ یا صحاح یا حسان ہی پر موقوف نہیں بلکہ یہ امور صحاح و حسان کے علاوہ ان روایات سے بھی ثابت ہو جاتے. ہیں، جنہیں محدثین اپنی اصطلاح میں ضعیف کہتے ہیں۔ کیوں کہ ضعیف کے معنی یہ نہیں کہ وہ جھوٹی روایت ہے اور من گھڑت کہانی ہے، روایت ضعیفہ کی معنی صرف یہ ہیں کہ باعتبار اصطلاح روایت کو صحیح و حسن کہنے کے لئے جس درجہ اور جن شرائط کے مستجمع راوی درکار ہیں، اس کے راوی اس عالی درجہ کے نہیں۔ اس کا ماحصل صرف یہ ہے کہ صحیح اور حسن سے جس اعلیٰ درجہ کا صدق حاصل ہوتا ہے روایت ضعیف سے اس اعلیٰ درجہ کا صدق نہیں حاصل ہوتا۔ صدق جس طرح صحیح اور حسن سے حاصل ہوتا ہے۔ ضعیف سے بھی حاصل ہوتا ہے، اگر چہ درجہ میں اس سے کم ہوتا ہے، اور فن سیرت میں. جس درجہ کا صدق درکار ہے، وہ ضعیف سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

مدعا جس حیثیت کا ہوتا ہے، اس حیثیت کی دلیل کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک وہ مدعا ہے جو اعلیٰ درجہ کا ہے، جیسے عقائد کے وہ مسائل جو مدار کفر وایمان ہیں، ان کے ثبوت کے لئے ایسی قطعی دلیل کی حاجت ہے، جس میں شک شبہہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ اس باب میں احادیث آحاد اگر چہ صحیح ہوں، اگر چہ صحیحین کی ہوں حجت نہیں۔ یہاں صرف

قرآن مجید اور احادیث متواترہ حجت ہیں۔

دوسرے وہ مدعا جو اوسط درجے کا ہے، جیسے حلت وحرمت۔اس کا ثبوت ایسی قطعی دلیل پر موقوف نہیں، تاہم اس کے ثبوت کے لئے ایسی دلیل ضروری ہے جو مفید ظن غالب ہو،اس کے لئے احادیث صحیحہ وحسنہ اگر چہ وہ آحاد ہوں،کافی ہیں۔اگر چہ وہ صحیحین میں نہ ہوں،اگر چہ وہ صحاح ستہ میں نہ ہوں۔

تیسرے وہ مدعا جو اس سے بھی ادنیٰ ہے۔اس کا ثبوت نہ دلیل قطعی پر موقوف ہے نہ ایسی مرجح الصدق دلیل پر جو رواۃ کے اعلیٰ درجہ کے ثقہ اور عادل اور سند کے اتصال اور علل قادحہ سے خالی ہوئے بغیر حاصل نہیں ہوتا،جیسے کسی معزز فی الدین انسان یا محمود عند الشرع فعل کی مخصوص یا غیر مخصوص فضیلت کا ثبوت یہ احادیث صحیحہ کے حسنہ کے علاوہ ضعاف سے بھی ثابت ہوتا ہے،البتہ موضوع یہاں بھی ناقابل قبول ہے،موضوع حدیث ہی نہیں کسی بدطینت انسان کی من گڑھت ہے۔

اب آیئے ہم اور آپ غور کریں کہ سیرت کے جزئیات کا درجہ ان تینوں میں کس درجہ پر ہے جو بھی عاقل منصف غور کرے گا،وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کا مقام تیسرا ہے۔کیوں کہ ظاہر ہے کہ جزئیات سیر و مغازی کا انکار نہ کفر ہے،نہ موجب اثم۔اس لئے ابواب مغازی وسیر میں تیسرے درجے کی روایات جنہیں ضعیف کہتے ہیں،مستند ہیں،جس طرح واجبات ومکروہات کے اثبات کے لئے آیات قرآنیہ یا احادیث متواترہ تلاش کرنا تکلیف مالا یکلف اور اصول شرع سے نابلدی ہے،اسی طرح مغازی وسیر فضائل ومناقب کے لئے احادیث صحیحہ متصلہ کی تحدید اپنے اوپر شدت بے جا لازم کرنا،اور اصول دین سے بے خبری ہے۔

ضعیف اور موضوع کا فرق:

اب جب کہ دلائل عقلی ونقلی سے ثابت ہو چکا کہ سیر و مغازی میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایت مقبول ہیں تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کی بھی توضیح کرتے چلیں کہ موضوع اور ضعیف میں فرق کیا ہے۔اس کی ضرورت یوں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے،جب ہم

یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت علامہ اور ان کے مقلدین جس روایت کو رد کرنا چاہتے ہیں، اس اتنی جرح کافی سمجھتے ہیں کہ کسی نے اس کے بارے میں یہ کہہ دیا ہو، یہ صحیح نہیں، یہ ثابت نہیں ۔ اس کا رفع صحیح نہیں۔اس کا رفع ثابت نہیں۔ یہ شاذ ہے ۔منکر ہے ۔متروک ہے۔اس سے ان عوام میں جو محدثین کی اصطلاح سے واقف نہیں یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ غالبا یہ سب موضوع کی تعبیرات ہیں ۔

ا۔موضوع اگر چہ ضعیف ہی کی قسم ہے مگر کتب قوم میں یہ دونوں بحیثیت قسیم مستعمل ہیں، جیسے عرف عام میں انسان اور حیوان کہ اگر چہ حقیقت میں انسان حیوان کی ایک نوع ہے، مگر عرف عام میں دونوں متقابل معنوں میں بولے جاتے ہیں ۔اس لئے اثبات ضعف سے اثبات وضع لازم نہیں ۔یونہی کسی حدیث کے بارے میں محدثین کے اس کہہ دینے سے کہ یہ صحیح نہیں، حدیث کا موضوع ہونا تو درکنار ضعیف ہونا بھی لازم نہیں ۔ہو سکتا ہے کہ وہ حسن ہو بلکہ بعض ائمہ نقد نے "لا یصح" کو عدم وضع کی دلیل بتایا، اس کی تفصیل یہ ہے:

صحیح ان کی اصطلاح میں اس حدیث کو کہتے ہیں، جس کے تمام رواۃ کا اعلیٰ درجہ کا حفظ وضبط پر فائز ہونا ثابت ہو۔اس کی سند متصل اور علت شذوذ نکارت سے خالی ہو، ان تمام شرائط کا اجتماع اور ان کے خلاف کا ارتفاع بہت کم ہوتا ہے ۔ پھر ان شرائط کے اثبات میں بڑی دشواریاں ہیں۔محدثین ان شرائط میں جہاں کچھ کمی دیکھتے ہیں، فرمادیتے ہیں، یہ حدیث صحیح نہیں اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ صحیح ہونے کے لیے جن جن شرائط کی ضرورت، وہ سب اس میں موجود نہیں، صحیح کے بعد حسن کا درجہ ہے لایصح کا مطلب کبھی یہ ہوتا ہے کہ یہ حسن ہے، حسن وہ حدیث جس میں صحیح ہونے کے بعض شرائط میں وہ معیار نہ پایا جائے جو صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے، فی نفسہ اس میں کوئی نقص نہیں، ورنہ حسن نہ کہلاتی، ناقص کہلاتی۔ حدیث حسن میں جو تنزل ہے وہ اگر کسی طرح منجبر ہو جائے تو اسے صحیح لغیرہ کہتے ہیں۔حدیث حسن سیر وفضائل کے علاوہ احکام میں بھی حجت ہے ۔

حسن کے بعد ضعیف کا درجہ ہے ۔اس کی تعریف یہ ہے کہ حدیث صحیح وحسن میں

جو شرائط معتبر ہیں، ان میں سے کل یا بعض مفقود ہوں۔ اس کا تین درجہ ہے، ضعیف ضعف بہ اخف، جس میں راوی پر اختلاط وسوءِ حفظ جیسے ہلکے طعن ہوں، پھر ضعیف بہ ضعف خفیف جیسے فسق وکذب وغیرہ شدید جرحوں سے راوی مطعون ہو، تیسرے ضعیف بہ ضعف شدید کہ اصلاً حدیث ہی نہ ہو بلکہ کسی بے باک کی من گڑھت ہو، یہی موضوع ہے۔

ضعیف بہ ضعف اخف، جابر سے قوت پا کر حسن لغیرہ بلکہ صحیح لغیرہ کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔

یہ کل سات قسمیں ہوئیں: صحیح لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ ضعیف بہ ضعف اخف، ضعیف بہ ضعف خفیف، موضوع۔

پہلی چار قسمیں احکام، وسیر ومغازی فضائل ومناقب سب میں لائق احتجاج ہیں۔ پانچویں قسم شواہد ومتابعات وغیرہ میں مقبول اور جابر سے قوت پا کر حسن لغیرہ یا صحیح لغیرہ کے رتبہ کو پہنچ جائے، تو احکام میں بھی معتمد، چھٹی قسم احکام میں غیر مقبول، مگر سیر ومغازی، فضائل ومناقب میں بالاجماع مستند۔

ساتویں قسم نہ حدیث نہ اس کا کہیں اعتبار۔ ہر منصف فیصلہ کر لے کہ "لا یصح" کہنے سے صحیح کی نفی ہوئی۔ صحیح اور موضوع کے مابین پانچ قسمیں ہیں۔ یہ کسی عاقل کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اعلیٰ کی نفی سے سب سے ادنیٰ کا اثبات ہوگیا۔ اسی بنا پر علما نے تصریح کی ہے:

بین قولنا لایصح وبین قولنا موضوع بون کبیر فان الوضع اثبات الکذب والاختلاق وقولنا لم یصح لایلزم منہ العدم انما ھو اخبار عن عدم الثبوت وفرق بین الامرین. (کتاب النکت علیٰ ابن الصلاح للعلامۃ الزرکشی، تنزیہ الشریعۃ لآلی مصنوعۃ خاتمۃ مجمع بحار الانوار)

ہمارے ان دونوں قول "میں یہ صحیح نہیں" اور "یہ موضوع ہے" بہت بُعد ہے۔ اس لیے کہ وضع جھوٹ اور من گڑھت ثابت کرتا ہے اور ہمارے اس کہنے سے کہ صحیح نہیں حدیث نہ ہونا لازم نہیں یہ تو صرف عدم ثبوت بتاتا ہے اور دونوں میں بہت فرق ہے۔

اسی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محدثین کے یہ فرمانے سے کہ یہ ثابت نہیں

ثبوت وضع نہیں ہوتا۔

حلیہ شرح منیہ میں ہے:

قول الترمذی لم یصح من النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی ھذا الباب شیئ انتھی لا ینفی وجود الحسن ونحوہ والمطلوب لایتوقف ثبوتہ علی الصحیح بل کما یثبت بہ یثبت با لحسن.

ترمذی کا یہ فرمانا کہ اس باب میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کچھ صحیح نہیں، یہ قول حسن کے وجود کی نفی نہیں کرتا ہے۔ اور مطلوب کا ثبوت صرف صحیح پر موقوف نہیں بلکہ جیسے صحیح سے ثابت ہوتا ہے، حسن سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

صواعق محرقہ میں امام ابن حجر مکی فرماتے ہیں:

قول احمد انہ حدیث لا یصح ای لذاتہ فلا ینفی کونہ حسنا لغیرہ و الحسن لغیرہ یحتج بہ کما بین فی الحدیث .

امام احمد کا یہ قول کہ یہ حدیث صحیح نہیں، یعنی صحیح لذاتہ۔ یہ حسن لغیرہ کی نفی نہیں اور حسن لغیرہ حجت ہے جیسا کہ علم حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

سند الحفاظ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اذکار امام نووی کی تخریج احادیث میں فرماتے ہیں:

من نفی الصحۃ لا ینفی الحسن .

صحت کی نفی سے حسن کی نفی نہیں ہوتی۔

موضوعات کبیر میں ہے:

لا یصح لا ینافی الحسن .

لایصح کہنا حسن کے منافی نہیں۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں

نفیہ الصحۃ لا ینافی انہ الحسن کما علم .

صحیح ہونے کی نفی اس کے منافی نہیں کہ وہ حسن ہے جیسا کہ معلوم ہے۔

ان ارشادات علما سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ حدیث حسن احکام میں بھی مستند اور لائق احتجاج ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوگیا کہ لا یصح کہنے سے حسن کی بھی نفی نہیں ہوتی، چہ جائے کہ ثبوت وضع ہو۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ ناقدین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں اور وہ حسن ہوتی ہے۔ لا یصح سے ثبوت وضع تو بہت دور ہے، ادنیٰ ضعف بھی لازم نہیں۔ بلکہ بعض علما نے لا یصح کو موضوع نہ ہونے کی دلیل بتایا۔

موضوعات کبیر میں حدیث "البطیخ قبل الطعام یغسل البطن غسلا ویذهب الداء اصلا" کے متعلق ابن عساکر کا قول لا یصح نقل کر کے فرماتے ہیں:

وهو يفيد انه غير موضوع كما لا يخفىٰ.

لا یصح کہنا یہ افادہ کرتا ہے کہ یہ حدیث موضوع نہیں جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ حدیث موضوع ہوتی تو صاف صاف فرمادیتے یہ موضوع ہے، صرف لا یصح پر اکتفا نہیں کرتے۔

ناظرین غور کریں! آج کسی حدیث کے بارے میں لا یصح کہیں مل گیا تو بغیر یہ تحقیق کیے ہوئے کہ یہ لا یصح کہنے والا کون ہے، اور اس کا مطلب کیا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے جو قائل نے کہی ہے یا اس کے برعکس ہے۔ حدیث کو پوری بے دردی کے ساتھ مردود ومطرود کردیتے ہیں، اور خود لا یصح کہنے والے اس کا مطلب یہ بتارہے ہیں کہ لا یصح کہنے سے یہ حدیث کا ضعیف ہونا لازم نہیں، حدیث حسن کو بھی لا یصح کہہ دیتے ہیں۔ اسے مستند ومعتمد بتاتے ہیں بلکہ لا یصح کو موضوع نہ ہونے کی دلیل بتاتے ہیں اور یہ سخن فہم لوگ اس کا صرف یہی مطلب لیتے ہیں کہ یہ غیر مقبول ہے، غیر مستند ہے، مردود ہے، مطرود ہے۔

اسی طرح آپ کو جگہ جگہ ملے گا کہ ذرا کسی روایت کے بارے میں ملا یہ مجہول ہے بس رد کردیا۔ حالانکہ سند میں کسی راوی کا مجہول ہونا صحت حدیث میں قادح ہونا علما میں مختلف فیہ ہے، اور اگر ہے بھی تو صرف اس حد تک کہ مورث ضعف ہے نہ کہ موجب وضع۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ مجہول کی تین قسمیں ہیں: مستور، مجہول العین مجہول الحال۔

۱۔ مستور: وہ ہے جس کی عدالت ظاہری معلوم ہو، باطنی کی تحقیق نہ ہو۔

۲۔ مجہول العین: وہ ہے جس سے صرف ایک شخص نے روایت کی ہو۔
۳۔ مجہول الحال: وہ ہے جس کی عدالت ظاہری اور باطنی کسی کی تحقیق نہ ہو۔
مستور کی روایت جمہور محققین کے نزدیک مقبول ہے، اور قطعاً مخل صحت نہیں۔
چنانچہ صحیح مسلم میں اس قسم کے راویوں کی کثیر روایتیں موجود ہیں۔
فتح المغیث میں ہے:

قبله ابو حنيفة خلافا للشافعي

مستور کی روایت امام ابو حنیفہ نے قبول فرمائی، امام شافعی کا اس میں اختلاف ہے۔
امام نووی نے اس کی تصریح فرمائی۔
امام عمرو بن الصلاح نے اس کو مختار فرمایا۔ یعنی مستور کی روایت کے مقبول ہونے کو۔
مجہول الحال کو بھی بعض اکابر لائق حجت جانتے ہیں۔ البتہ جمہور محدثین اس کو ضعیف مانتے ہیں بلکہ امام نووی نے مجہول العین کے بھی مقبول ہونے کو محققین کی طرف منسوب کیا۔
مقدمہ منہاج میں فرماتے ہیں:

المجهول اقسام مجهول العدالة ظاهراً و باطنا ومجهولها باطنا مع وجودها ظاهرا وهو المستور ومجهول العين فاما الاول فالجمهور علىٰ ان لا يحتج به واما الآخر فاحتج بهما كثيرون من المحققين.

مجہول کی چند قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی عدالت ظاہری و باطنی دونوں نا معلوم ہو۔ دوسرے وہ کہ عدالت ظاہری معلوم ہو باطنی نا معلوم ہو، یہ مستور ہے۔ تیسرے مجہول العین اول تو جمہور کے نزدیک لائق احتجاج نہیں۔ رہ گئے آخرین تو اکثر محققین اس سے احتجاج کرتے ہیں۔

عارف باللہ امام ابو طالب مکی نے اسی کو اولیائے کرام اور فقہا کا مسلک بتایا۔
قوت القلوب میں فرماتے ہیں:

بعض ما اضعف به رواة الحديث وتعلل به احاديثهم لايكون تعليلا

ولا جرحا عند الفقهاء ولا عند العلماء باللہ تعالیٰ مثل ان یکون الراوی مجهولا لایثاره الخمول وقد ندب الیه ولقلة الاتباع له اذ لم یقع لهم الاثرة عندی.

بعض وہ باتیں جن سے رُواۃ اور احادیث کی تضعیف وتعلیل کی جاتی ہے۔ فقہا اور اولیا کے نزدیک طعن اور جرح نہیں۔ جیسے راوی کا مجہول ہونا، کیوں کہ اس نے گمنامی پسند کی، اور یہ شریعت میں پسندیدہ بھی ہے۔ یا اس کے تلامذہ کم ہوئے، اس بنا پر کہ لوگوں کو اس سے روایت کا موقع کم ملا۔

المختصر اس میں اختلاف ہے کہ جہالت راوی سرے سے وجوہ طعن میں سے ہے بھی یا نہیں۔ اور جو لوگ اسے طعن مانتے ہیں، وہ بھی صرف مورث ضعف بتاتے ہیں۔ موجب وضع کوئی نہیں کہتا بلکہ اگر کسی نے جہالت راوی کی بنا پر حدیث کو موضوع کہا تو علما نے اس کی تردید فرمائی۔

امام بدرالدین زرکشی نے پھر لآلی مصنوعہ میں فرمایا:

لو ثبت جهالته لم یلزم ان یکون الحدیث موضوعا ما لم یکن فی اسناده من یتهم بالوضع.

اگر مجہول ہونا ثابت بھی ہو جائے تو اس سے حدیث کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ جب تک اس کی اسناد میں کوئی متہم بالوضع نہ ہو۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

قال السهیلی فی اسناده مجاهیل وهو یفید الضعف فقط.

سہیلی نے کہا کہ اس کی سند میں مجہول ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضعیف ہے اور بس۔

یوں ہی راوی پر جن وجوہ سے طعن ہوتا ہے، ان میں کذب ووضع کے علاوہ جتنے وجوہ ہیں، سب زیادہ سے زیادہ مورث ضعف ہیں۔ مثبت وضع صرف کذب ہے کہ معاذ اللہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا۔ جس بے باک نے ایک دفعہ بھی عمر میں

ولا جرعا عند الفقهاء ولا عند العلماء بالله تعالیٰ مثل ان یکون الراوی مجهولا لایثاره الخمول وقد ندب الیه ولقلة الاتباع له اذ لم یقع لهم الاثرة عندی.

بعض وہ باتیں جن سے رُواۃ اور احادیث کی تضعیف وتعلیل کی جاتی ہے۔ فقہا اور اولیا کے نزدیک طعن اور جرح نہیں۔ جیسے راوی کا مجہول ہونا، کیوں کہ اس نے گمنامی پسند کی، اور یہ شریعت میں پسندیدہ بھی ہے۔ یا اس کے تلامذہ کم ہوئے، اس بنا پر کہ لوگوں کو اس سے روایت کا موقع کم ملا۔

المختصر اس میں اختلاف ہے کہ جہالت راوی سرے سے وجوہ طعن میں سے ہے بھی یا نہیں۔ اور جو لوگ اسے طعن مانتے ہیں، وہ بھی صرف مورث ضعف بتاتے ہیں۔ موجب وضع کوئی نہیں کہتا بلکہ اگر کسی نے جہالت راوی کی بنا پر حدیث کو موضوع کہا تو علما نے اس کی تردید فرمائی۔

امام بدرالدین زرکشی نے پھر لآلی مصنوعہ میں فرمایا:

لو ثبت جهالته لم یلزم ان یکون الحدیث موضوعا ما لم یکن فی اسناده من یتهم بالوضع.

اگر مجہول ہونا ثابت بھی ہوجائے تو اس سے حدیث کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ جب تک اس کی اسناد میں کوئی متہم بالوضع نہ ہو۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

قال السهیلی فی اسناده مجاهیل وهو یفید الضعف فقط.

سہیلی نے کہا کہ اس کی سند میں مجہول ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضعیف ہے اور بس۔

یوں ہی راوی پر جن وجوہ سے طعن ہوتا ہے، ان میں کذب ووضع کے علاوہ جتنے وجوہ ہیں، سب زیادہ سے زیادہ مورث ضعف ہیں۔ مثبت وضع صرف کذب ہے کہ معاذ اللہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا۔ جس بے باک نے ایک دفعہ بھی عمر میں

کا موضوع ہونا اور بات ہے، جہاں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا استحقاق نار کا موجب ہے، وہاں قول رسول کو یہ کہنا کہ یہ قول رسول نہیں اسی درجہ کا جرم ہے کہ درحقیقت یہ بھی جھوٹ باندھنا ہے، اس کو یوں سمجھئے کہ غیر قرآن کو قرآن کہنا اور قرآن کے کسی جز کو قرآن نہ ماننا دونوں یکساں طور پر کفر ہیں۔ یوں ہی غیر حدیث کو حدیث کہنا اور حدیث کو حدیث نہ ماننا ایک درجہ پر ہے، اس لیے کسی حدیث کو موضوع کہنے میں جلدی کرنا عند الشرع محمود نہیں۔ اس لیے اس بارے میں بڑی احتیاط کامل تتبع اور استقصا کے بعد ہی کسی حدیث کے بارے میں یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ یہ موضوع ہے یہ بھی بر سبیل ظن، یہاں یقینی حکم بہت مشکل ہے۔ "فان الكذوب قد يصدق"

حضرت شیخ مقدمہ اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

وحکم بوضع وافترا بحکم ظن غالب است وقطع ویقین را بداں راہ نیست فان الكذوب قد يصدق.

ترجمہ: وضع وافترا کا حکم ظن غالب سے ہے، قطعی یقین کی یہاں کوئی صورت نہیں۔ اس لیے کہ پکا جھوٹا بھی کبھی سچ بولتا ہے۔

اور حقیقت میں یہ کام ہمارا آپ کا نہیں، علمائے محدثین نے ہمیں اس سے مستغنی فرما دیا۔ اس راہ میں سوائے ان کی تقلید کے کوئی چارۂ کار نہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ناقد نے کسی ایک سند کو سامنے رکھ کر ایک حدیث کو موضوع یا ضعیف کہا، مگر اسی حدیث کی ایک یا زیادہ سندیں ایسی ہوتی ہیں، جن میں خلل نہیں ہوتا، اور اس سند سے وہ حسن یا صحیح ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کسی ناقد نے کسی حدیث کو موضوع یا ضعیف کہا ہے، تو آنکھ بند کر کے اس پر یقین کرنا درست نہیں۔ دوسرے ناقدین کی رائیں اور دوسرے طرق تلاش کرنا ضروری ہے، اگر مل جائیں تو اس کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔

مثلاً ایک طریقہ سے وہ موضوع ہے مگر دوسرے طریقے سے صحیح یا حسن ہے تو اس کو صحیح یا حسن ہی مانیں گے، یہ نہیں کہ دوسرے طریقوں کے ہوتے ہوئے جو وضع وقدح سے

خالی ہیں اس کو موضوع ہی کہیں، یوں ہی کسی ناقد نے کسی حدیث کو موضوع کہا دوسرے اس کو صحیح یا حسن کہتے ہیں یا ضعیف کہتے ہیں تو دونوں ناقدین کی حیثیت، رتبہ، امت میں اعتبار واعتماد، دلائل وقرائن کی قوت پر فیصلہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ بس جب فلاں نے موضوع کہہ دیا تو وہ موضوع ہی ہے۔ خواہ ساری امت اسے حدیث مانے، اسے قبول کرلے۔ یہ وہ اہم اور لطیف نکتے ہیں، جن سے غفلت کی وجہ سے لوگ قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں، اور امت میں انتشار وافتراق کے باعث بنتے ہیں۔ (ماہنامہ المیزان، کچھوچھہ شریف ص: ۴۲ تا ۴۳)

خلاصہ ابحاث

ہماری اس کتاب میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، جنہیں تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کر آئے۔

۱۔ سیر ومغازی، فضائل ومناقب کے وہ ابواب جو قطعی نہیں، ان میں علاوہ موضوع کے ہر حدیث اور ہر روایت مستند ہے۔ اسی پر تمام امت اور علمائے سیر ومغازی کا عمل ہے۔

۲۔ عقائد واحکام میں البتہ موضوعات کے ساتھ ضعاف بھی غیر معتمد ہیں، اگرچہ وہ سیر وفضائل کا جز ہوں۔

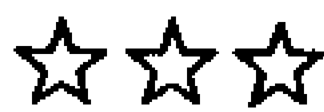
۳۔ جب تک علمائے معتمدین محتاطین جن پر امت کو اطمینان ہے، یہ تصریح نہ کریں کہ یہ حدیث موضوع یا ضعیف ہے، کسی غیر محتاط متغالی یا متہوّر کے موضوع کہہ دینے سے موضوع نہ ہوگی۔

۴۔ کسی حدیث یا روایت پر کسی محدث کا طعن اس کے ساقط الاعتبار ہونے کے لیے کافی نہیں، جب تک کہ اس کی مکمل چھان بین نہ کر لی جائے۔

۵۔ لایصح، لایثبت، صحیح نہیں، ثابت نہیں، مجہول ہے، شاذ ہے، منکر ہے، منقطع ہے۔ مرسل ہے، مدلس ہے، معضل ہے، مضطرب ہے، مدرج ہے، معلل ہے، غریب ہے، اس قسم کی اور جرحیں سیر ومغازی اور فضائل ومناقب میں مستند ہونے میں مخل نہیں، بلکہ ان میں سے بعض احکام میں بھی معتمد ہیں۔

۶۔ ہاں! تعارض کے وقت کتاب اللہ پھر احادیث صحاح، حسان کو ہمیشہ ترجیح ہوگی۔

۷۔ روایت مقبولہ کے ہوتے ہوئے محض اپنی رائے اور قیاس سے مزاحم ہونے کی وجہ سے کسی مروی کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری عقل خواہ کتنا ہی اِبا کرے۔





مسلمانوں کے فرقے

۱۔ ہر مذہب کی بنیاد دو باتوں پر قائم ہے۔ پہلی یہ کہ ایک ایسی ذات ضرورت موجو
ہے۔ جو ساری موجودات سے زیادہ قوت اور قدرت رکھتی ہے۔ اسی نے ساری دنیا کو پید
کیا۔ اور دنیا کا ہمارا نظام حقیقت میں اسی کے قبضے میں ہے۔ وہ حاکم مطلق ہے۔ اس کے
اوپر کوئی حاکم نہیں وہ سب پر حاکم ہے۔ سب کا مالک ہے۔ وہ جو چاہے کرے۔ وہ جلاتا بھی
ہے مارتا بھی ہے۔ وہی پیدا بھی کرتا ہے۔ وہی فنا بھی کرتا ہے اور تمام عالم میں جو کچھ ہوتا ہے
سب اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ ذات میں نہ صفات میں نہ عبادت
میں۔ وہ بے مثل و بے مثال ہے۔ اس کی کوئی صورت اور شکل نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور
ہمیشہ رہے گا۔ اور نہ وہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ کبھی مرے گا۔ وہ ہر آن دنیا کے ذرے ذرے کی
خبر رکھتا ہے۔ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے جانتا ہے۔ مگر نہ اسے کان ہے نہ آنکھ ہے نہ دماغ
ہے۔ وہ جسمانی اعضا اور عوارض سے پاک ہے۔ اسی ذات کو ہم لوگ اللہ کہتے ہیں۔ دوسری
یہ کہ اس نے بندوں کی ہدایت کے لیے کچھ مخصوص انسانوں کو چن لیا ہے جن کے پاس وہ
ڈائرکٹ بھی اور فرشتوں کے واسطے سے بھی اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ ان مخصوص انسانوں کو نبی اور
رسول کہا جاتا ہے۔ اس لیے مسلمان ہونے کے لیے اللہ عزوجل کو بھی ماننا ضروری اور رسول کو
بھی ماننا ضروری ہے۔

۲۔ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ رسولوں کے ذریعہ اللہ عزوجل کا جو پیغام انسانوں تک
آئے یا رسول جو کچھ فرمائیں ان سب کو دل سے سچا مانے اور زبان سے ان کے سچے ہونے کا
اقرار بھی کرے۔ رسول کی بات بلا چون و چرا تسلیم کرے۔

۳۔ اللہ کی شان میں یا رسول کی شان میں کوئی گستاخی کا جملہ بولنا ان کی تحقیر کرنا
ایمان نہیں کفر ہے۔

۴۔رسول جو اللہ کا پیغام لائے یا رسول نے جو کچھ بھی فرمایا۔اور یہ سب جن لوگوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا ان سب کو سچا مسلمان،شریعت کا پابند،اللہ سے ڈرنے والا،رسول کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا نہ ہونا،،دنیوی باتوں میں بھی سچا،راست باز اعلی کیرکٹر کا ہونا ضروری ہے۔

۵۔اللہ کے مخصوص پیغام کو قرآن کہا جاتا ہے اور رسول کے اقوال کو حدیث۔

جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی ان سے تعلیم براہ راست حاصل کی۔ان کے جو معانی ومطالب بتائے وہ صحیح اور برحق ہیں۔اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لائق نہیں۔

۶۔اسی طرح جو عمل یا قانون صراحت کے ساتھ قرآن وحدیث میں نہیں ان کے بارے میں صحابہ اور تابعین اور اسی طرح آج تک کے معتمد علمائے کرام کا فیصلہ حق ہے۔اسے بھی قبول کرنا۔ان پر بھی عمل کرنا ضروری ہے۔بشرطیکہ وہ قرآن وحدیث اور پہلے کے گزرے ہوئے بزرگوں کے قول اور فیصلے کے خلاف نہ ہو۔

۷۔جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایمان کی حالت میں زیارت کی اور اخیر دم تک وہ ایمان پر قائم رہے وہ صحابی ہیں۔اور جن لوگوں نے اسی تفصیل کے ساتھ صحابی کی زیارت کی وہ تابعی ہیں۔

۸۔چوں کہ قرآن واحادیث سے قانون بنانے کے لیے بہت اعلیٰ دماغ بھی چاہئے اور بہت زیادہ علم بھی چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اسے خداترس متقی پرہیزگار مخلص سچا بھی ہونا چاہیے۔اس لئے ہر شخص یا کم علم والے یا کم دماغ والے قرآن وحدیث سے قانون نہیں بنا سکتے۔ان اعلیٰ صفات کے اور کمال کے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ان کو مجتہد کہا جاتا ہے۔ان میں چار بہت مشہور اور ممتاز ہیں امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت،ان کو امام اعظم کہا جاتا ہے۔یہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں انتقال کر گئے۔ان کے ماننے والوں کو حنفی کہا جاتا ہے۔دوسرے امام مالک بن انس یہ ۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔یہ مدینہ طیبہ میں رہتے تھے۔ان کے مقلدین یعنی ماننے والوں کو مالکی کہا جاتا ہے۔تیسرے محمد بن ادریس شافعی۔یہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔اور یہ ۲۰۴ھ میں فوت

ہوئے۔ یہ مصر میں رہتے تھے۔ ان کے مقلدین کو شافعی کہا جاتا ہے۔ چوتھے امام احمد بن حنبل۔ یہ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں فوت ہوئے۔ یہ بغداد کے باشندے تھے۔ ان کے مقلدین کو حنبلی کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مجتہدین ہوئے مگر ان لوگوں نے جو مسائل (قانون) قرآن وحدیث سے بنائے وہ محفوظ نہیں رہ سکے۔ اس لیے ان کے مقلدین نہیں رہے۔

۹۔ اس وقت دنیا کے ایک ارب مسلمانوں میں تقریباً ۹۵ رفی صد مذکورہ بالا مجتہدین کے مقلدین ہیں۔ جن کو اہل سنت وجماعت کہا جاتا ہے۔ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اب کوئی مجتہد نہیں۔ اب پوری دنیا کے مسلمانوں کو انہیں چاروں میں سے کسی ایک کی تقلید واجب ہے۔ اس کی اجازت نہیں کہ کوئی از خود ڈائرکٹ قرآن وحدیث سے کوئی قانون بنالے۔ کیوں کہ اجتہاد یعنی قرآن وحدیث سے مسائل (قوانین) بنانے کی کسی کو قدرت نہیں۔ نہ وہ دماغ ہے نہ وہ علم ہے اور نہ اتنی دیانتداری۔

۱۰۔ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، چاروں عقیدے میں متفق ہیں۔ عقیدے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب کا عقیدہ ایک ہے۔ صرف عبادات اور اعمال کے طریقوں میں اور کچھ چیزوں کے حلال وحرام ہونے میں معمولی سا اختلاف ہے اس اختلاف کی وجہ سے آپس میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ان کے سب سے پہلے خلیفہ وجانشین حضرت ابوبکر صدیق ہوئے ان کے بعد حضرت عمر فاروق ان کے بعد حضرت عثمان غنی اور ان کے بعد حضرت مولا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم خلیفہ ہوئے۔

۱۱۔ اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر ہیں ان کے بعد حضرت عمر فاروق، ان کے بعد حضرت عثمان وحضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

۱۲۔ حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلیفہ برحق ہونے پر سب کا اتفاق ہے ان تینوں کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی خود خلیفہ تسلیم کیا۔

۱۳۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ۱۸/ ذی الحجہ ۳۵ھ تک مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے اخیر دنوں میں عبداللہ بن سبا نامی ایک یہودی نے تخریب کاری کے لیے بظاہر کلمہ پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا۔ بظاہر بہت بڑا نمازی، شریعت کا پابند، متقی، اور پرہیزگار تھا اور ساتھ ہی ساتھ انتہائی چالاک اور عیار تھا اس نے ایک خفیہ گروہ بنایا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف اکساتا رہا۔ جس کے نتیجہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد مدینہ طیبہ میں جو ذی اثر اور بڑے بڑے صحابہ اور سردار تھے ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔ ان کی خلافت کو تمام دنیا کے مسلمانوں نے تسلیم کیا۔ مگر شام کے گورنر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تسلیم نہیں کیا اور ان کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے یہ بہانا بنایا کہ پہلے حضرت عثمان کے قتل کا قصاص لیا جائے اور جن لوگوں نے ان کے گھر کا محاصرہ کیا تھا یعنی ان کے گھر کو گھیرا تھا ان کو سزا دی جائے حضرت علی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ قاتلین مفرور ہیں اور ان کا صحیح پتہ معلوم نہیں کہ ان کا قاتل کون ہے۔ میں ان کا پتہ لگا رہا ہوں اگر وہ مل جائیں گے تو ضرور ان سے قصاص لوں گا۔ جن لوگوں نے حضرت عثمان کا گھر گھیرا تھا انہوں نے حضرت عثمان کو قتل کرنے کے لیے نہیں محاصرہ کیا تھا ان کا مطالبہ یہ تھا کہ مشہور فتنہ پرور سازشی مروان بن حکم کو ہمارے حوالے کیا جائے جو حضرت عثمان کے گھر میں چھپا ہوا تھا اس لیے وہ حضرات مجرم نہیں۔ اس پر بات بڑھی اور ۳۷ھ میں صفین کے مقام پر حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما میں بہت زبردست جنگ ہوئی۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ میں شکست کھا جاؤں گا تو انہوں نے نیزوں پر قرآن باندکر اٹھایا اور یہ کہا کہ ہم قرآن کے حکم کے مطابق صلح چاہتے ہیں۔ اس پر لڑائی رک گئی پھر باہمی بات چیت سے یہ طے پایا کہ طرفین اپنا اپنا ایک نمائندہ مقرر کر دیں جو چھ مہینہ تک عام مسلمانوں کی رائے معلوم کر لے۔ پھر مقام "دومۃ الجندل" میں فریقین اور ان کے نمائندے اکٹھے ہوں اور اپنا فیصلہ سنا دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو

اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ اس کے بعد حضرت معاویہ دمشق چلے گئے۔ اور حضرت علی کوفہ آ گئے۔ اس اثنا میں خارجی فرقہ پیدا ہوا انہوں نے کہا کہ قرآن مجید میں ہے: "اِنَّ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ آپ نے قرآن کے حکم کی خلاف ورزی کی اس لیے آپ خلافت کے لائق نہیں۔ ان لوگوں نے کوفہ کے قریب "حرورا" نامی جگہ پر ایک لشکر جمع کر لیا جب حضرت علی کو اس کی اطلاع ملی۔ تو انہوں نے ان خارجیوں کو سمجھانے کے لیے اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ ابن عباس کو بھیجا۔ انہوں نے ان خارجیوں سے کہا کہ قرآن مجید ہی میں ہے کہ جب میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے تو شوہر اپنا ایک نمائندہ بھیجے اور بیوی اپنا ایک نمائندہ مقرر کرے۔ دونوں بیٹھ کر جھگڑے کو طے کر لیں۔ قرآن مجید میں ہے:

فابعثوا حکما من اهله وحکما من اهلها ان یریدا اصلاحاً یوفق الله بینهمــــــــــا"

ایک پنچ مرد والوں کی طرف سے اور ایک پنچ عورت والوں کی طرف سے بھیجو۔ یہ دونوں اگر صلح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان میں میل کر دے گا۔ (سورۂ نساء ۳۵)

اس لیے حضرت علی کا حکم بنانا قرآن کے خلاف نہیں اس پر خارجیوں کے لشکر میں سے ہزاروں آدمی ٹوٹ گئے مگر جو شر پسند تھے وہ نہیں مانے۔ اس کے بعد حضرت علی نے ان سے جنگ کی اور انہیں بری طرح پسپا کر دیا۔ جو لوگ بھاگ گئے ورنہ سب مارے گئے۔

پھر "دومۃ الجندل" میں دونوں فریق اور ان کے پنچ اکٹھا ہوئے۔ حضرت عمرو بن عاص نے (حضرت معاویہ کے نمائندے) حضرت ابو موسیٰ اشعری (حضرت علی کے نمائندے) سے کہا کہ سارا جھگڑا علی اور معاویہ کی طرف سے ہے اس کا حل یہ ہے کہ ان دونوں کو معزول کر دیا جائے اور کسی تیسرے کو خلیفہ منتخب کیا جائے۔ ابو موسیٰ اشعری نے یہ بات مان لی اب عمرو بن عاص نے کہا کہ تم علی کے نمائندے ہو اور بزرگ بھی ہو اس لیے پہلے تم کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دو کہ میں نے علی کو معزول کیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے یہی کہا اس کے بعد حضرت عمرو بن عاص کھڑے ہوئے اور انہوں نے یہ کہا کہ ابو موسیٰ اشعری

نے حضرت علی کو معزول کر دیا لہذا اب وہ خلیفہ نہیں رہے میں حضرت معاویہ کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں اس پر حضرت ابو موسیٰ اشعری نے ان کو ٹوکا پھر دونوں میں شدید جھڑپیں ہوئیں جس پر وہاں ایک ہنگامہ ہو گیا اور دونوں فریق اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ گئے ۔ اور اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد حضرت علی ۲۰ رمضان ۴۰ھ کو شہید کر دیئے گئے ۔ اس اختلاف کے نتیجے میں مسلمانوں میں تین گروہ پیدا ہو گئے ۔

اول خارجی: جو حضرت علی اور حضرت معاویہ دونوں کو ناحق پر مانتے تھے ۔ حروراء کی جنگ میں حضرت علی نے اگر چہ ان کا زور ختم کر دیا تھا مگر جو بچ گئے تھے وہ جہاں بھی تھے وہیں چپکے چپکے اپنی تحریک چلا رہے تھے ۔

دوسرے شیعان علی: شیعان شیعہ کی جمع ہے جس کے معنی گروہ کے ہیں یہ لوگ حضرت علی کے ساتھ تھے اور ان کو خلیفہ برحق مانتے تھے ۔

تیسرے عثمانی: جو حضرت معاویہ کو برحق مانتے تھے اور حضرت علی کو اس بنیاد پر ناحق مانتے تھے کہ انہوں نے حضرت عثمان کے قتل کا بدلہ نہیں لیا اور نہ ان کا گھر گھیرنے والوں کو سزائیں دیں ۔

عبداللہ بن سبا

یہ ایک یہودی تھا جو صرف مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے مسلمان بنا بظاہر بہت پکا مسلمان معلوم ہوتا تھا نماز روزے کا بہت پابند تھا برائیوں سے بالکل دور رہتا تھا جس کی وجہ سے مسلمان اس کے گرویدہ ہو گئے اس نے جب یہ دیکھا کہ کچھ لوگ میرے معتقد ہو گئے ہیں تو اس نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر تنقیدیں شروع کر دیں مثلاً یہ کہ حضرت ابو بکر حضرت عمر بہت سادے رہتے تھے اور معمولی غذا کھاتے تھے ظاہری طور پر ان کی شان و شوکت کا کوئی سامان نہیں تھا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ چوں کہ بہت بڑے کروڑ پتی تھے اس لیے ان کا لباس رہن سہن بہت اونچا تھا عمدہ لباس پہنتے غلاموں کے جھرمٹ میں چلتے ۔ عبداللہ بن سبا نے چپکے چپکے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ پہلے کے

دونوں بزرگ خلیفہ کس سادگی سے رہتے تھے اور یہ کس شان وشوکت سے رہتے ہیں۔

حضرت عثمان خاندان بنو امیہ کے فرد تھے جس نے شروع شروع میں رسول اللہ ص اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بہت بڑی مخالفت کی تھی لیکن بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو گئے۔ امیہ کے لوگ بہت ذہین، ہوشیار اور حکمرانی کی صلاحیت رکھتے تھے جس کی وجہ سے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خاندان کے لوگون کو بڑے بڑے ملکوں کا حاکم بنایا۔ حضرت عمرو بن عاص کو مصر کا حاکم بنایا۔ حضرت یزید ابن ابوسفیان کو شام کا اور ان کے فوت ہونے کے بع ان کے بھائی معاویہ بن ابوسفیان کو ان جگہ شام کا والی بنایا۔ حضرت عثمان نے اپنے دور میں اپنے خاندان کے باصلاحیت لوگوں کو مختلف ممالک کا حاکم بنایا۔

عبد اللہ بن سبا نے لوگوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ یہ اقربا پروری ہے اس طریقے سے تنقیدیں کر کے حضرت عثمان کے خلاف جوشیلے اجڈ لوگوں کو ورغلایا جس کے نتیجے میں ان کی شہادت ہوئی۔ اب جب کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کا اختلاف ہوا تب عبد اللہ بن سبا اور اس کے چیلوں نے اندر ہی اندر بہت آگ بھڑکائی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے تین گروہ ہو گئے۔ خارجی، شیعہ، عثمانی، جن کا ذکر اوپر ہوا۔

ابتداء یہ گروہ صرف سیاسی تھا مگر عبد اللہ بن سبا ہی نے اور اس کے چیلوں نے بھرا کہ جب تک عام مسلمانوں سے عقائد میں اختلاف نہیں کرو گے اور اپنے لوگوں کو یہ نہیں یقین کراؤ گے کہ عام مسلمان اصل اسلام سے ہٹ گئے ہیں تمہیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوگی۔ جس کے نتیجے میں عام مسلمانوں کے خلاف سب سے پہلے خارجیوں نے کچھ عقیدہ بنایا۔ ایک اسلامی عقیدہ یہ تھا کہ انسان جب تک اسلام کے بنیادی عقیدوں کو مانتا رہے گا مسلمان رہے گا اگر چہ اس سے کچھ گناہ ہو جائیں گناہ کرنے کی وجہ سے کوئی کافر نہ ہوگا البتہ گنہگار اور فاسق ہوگا۔

خارجیوں نے اس کے برخلاف یہ عقیدہ بنایا کہ اگر کوئی شخص کوئی گناہ کرے تو وہ مسلمان نہیں رہتا بلکہ وہ کافر ہو جاتا ہے اگر چہ وہ اسلام کے بنیادی عقیدوں کو حق مانے اس کا فائدہ خارجیوں کو یہ ہوا کہ انہیں عام مسلمانوں سے لڑنے کا حق مل گیا ابتداء میں یہ فرقہ بہت

زور پکڑ گیا تھا جن کے ساتھ عام مسلمانوں کی بڑی زبردست لڑائیاں ہوئی ہیں بالآخر یہ زیر ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد نیست و نابود ہو گئے۔

رافضی یا شیعہ

شروع شروع میں تو یہ لوگ صرف حضرت معاویہ کے مقابلے میں حضرت علی کو برحق مانتے تھے مگر عبداللہ بن سبا اور اس کے چیلوں نے ان ایرانیوں کو جن کی ہزار سالہ حکومت حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت عثمان نے ختم کر دی تھی یہ پٹی پڑھانی شروع کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ان کے جانشین اور خلیفہ ہونے کا حق صرف حضرت علی کو تھا کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خاندان کے اعتبار سے قریبی تھے۔ ان کے چچا کے لڑکے بھی تھے اور داماد بھی یہ بات ایران کے اصول کے مطابق تھی کیونکہ ایران میں ایک بادشاہ کے بعد اس کا جانشین اس کا بیٹا ہوتا۔ بیٹا نہ ہوتا تو بیٹی ہوتی۔ جب ابن سبا اور اس کے چیلوں نے ایرانیوں کو یہ باور کرایا کہ خلیفہ ہونے کا سب سے پہلا حق حضرت علی کو تھا تو اس نے پھر یہ سکھانا شروع کیا کہ حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت عثمان غاصب تھے۔ انہوں نے حضرت علی کا حق غصب کیا ایرانی چونکہ دل سے ان تینوں حضرات سے کڑھتے تھے کہ ان تینوں حضرات نے ایرانیوں کی ہزار سالہ حکومت ملیا میٹ کر دی ہے اس نے اسے بڑی آسانی سے قبول کر لیا، ایرانی چونکہ ایک بہت چالاک قوم تھی، اس لئے کھل کر سامنے آنے کے بجائے بہت پوشیدہ احتیاط کے ساتھ اپنی اس تحریک کو چلایا اس کے لئے انہوں نے دو بنیادی قاعدے بنا لئے۔ ایک ''کتمان'' یعنی اپنے عقیدے کو چھپائے رکھنا اور جب تک مکمل اعتماد نہ ہو جائے کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ دوسرے تقیہ۔ کہ اپنے عقیدے کے خلاف ظاہر کرنا۔ رافضی اور شیعہ کی بنیاد یہی چیز ہے پھر بعد میں چالاک ایرانیوں نے اپنے مذہب میں بہت سی باتیں داخل کر لین مثلاً یہ کہ کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک حضرت علی اور قیامت تک آنے والے بارہ اماموں کو امام برحق نہ مانے۔ قرآن مجید کو پہلے والے تینوں خلفا نے گھٹا دیا ہے حضرت علی اور بارہ ائمہ کے بارے میں جو آیتیں تھیں ان کو نکال دیا اور اس قرآن میں

بھی بہت کچھ رد و بدل کیا۔ ترتیب بدل دی پھر اس کے بعد ان لوگوں نے نئی نئی ہزاروں حدیثیں گڑھ لیں اور اس سلسلے میں بہت موٹی موٹی کتابیں لکھیں۔

پہلے دور میں ان میں خود مختلف فرقے پیدا ہوئے جو خود آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے پھر بعد میں اثنا عشری یا امامیہ نام سے ان کی اکثریت متفق ہوگئی ان کے بیسوں فرقے نا پید ہوگئے ان کے اب چار فرقے موجود ہیں۔

اول امامیہ اثنا عشریہ: ایران، عراق، ہندوستان، وغیرہ میں غالب اکثریت اسی فرقے کی ہے۔

نصیری: یہ حضرت علی کو خدا مانتے ہیں بنیادی طور پر اور دیگر اعتقادیات و عملیات میں تمام شیعوں سے مختلف ہیں یہ فرقہ آج کل شام میں بہت زور پکڑے ہوئے ہے شام کے صدر حافظ الاسد اسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

تفضیلی: دیگر اعتقاد اور عملیات میں اہل سنت کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں مگر ان کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی تمام صحابہ حتی کہ تینوں خلفا سے افضل ہیں اور خلافت کے مستحق لیکن، جب خود حضرت علی نے تینوں خلفا کو مان لیا تو وہ تینوں خلیفہ برحق ہوگئے یہ صحابہ کرام پر تبرا نہیں کرتے یعنی انہیں گالیاں نہیں دیتے۔

داؤدی بوہرے: جو بمبئی میں رہتے ہیں دیگر شیعوں سے بہت سے عقائد اور اعمال میں یہ مختلف ہیں مگر یہ اپنے عقیدوں کو ایسا چھپاتے ہیں کہ دوسری کو ہوا بھی نہیں لگ پاتی۔ ان چار علاوہ شیعوں کے محدود پارٹیاں اور بھی ہیں مثلاً آغا خانی، خوجہ، بابی یہ بہت محدود ہیں اور اپنے عقائد کو اتنا خفیہ رکھے ہوئے ہیں کہ باوجود کوشش کے بھی کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

معتزلہ: اہل سنت کے مخالف فرقوں میں معتزلہ دیگر فرقوں کے بہ نسبت تعداد میں بھی زیادہ رہے اور کئی صدی تک باقی رہے۔ ان میں بہت نامور اہل علم اور صاحب تصنیف اور ذی اثر افراد گزرے ہیں ان کا زور اتنا بڑھا کہ بنی عباس کے بہت سے شہنشاہوں نے بھی

ان کا مذہب قبول کرلیا۔مثلاً مامون، متوکل، معتصم وغیرہ۔یہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔علامہ جاراللہ زمخشری تفسیر کشاف کے مصنف ،ابویعقوب سکا کی مفتاح العلوم کے مصنف ،جاحظ وغیرہ جیسے علم و فضل والے معتزلی تھے۔اس فرقے کی بنیاد دوسری صدی ہجری کے اوائل ہی میں پڑ گئی تھی۔اس فرقے کا بانی واصل ابن عطا متوفی ۱۳۱ھ/۷۴۸ء تھا یہ بہت سے عقائد میں اہل سنت کے مخالف ہیں۔چند اختلافات یہ ہیں۔اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان مومن ہو گا یا کافر، بیچ میں کوئی درجہ ایسا نہیں کہ ایک شخص نہ مومن ہو نہ کافر۔اگر چہ وہ کتنا ہی گناہ کرے معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو مسلمان گناہ کرے وہ نہ مومن ہے نہ کافر وہ بیچ کے درجے میں ہیں۔اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ بندوں کا خالق ہے اسی طرح ان کے افعال کا بھی خالق ہے اور بندے کا سبب ہیں بندوں کو یہ قوت ہے کہ وہ اپنے اختیار سے جو چاہیں کریں مگر ان افعال کو پیدا اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خالق ہے اور بندے اس کے کاسب ہیں۔اس کے برخلاف معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں اللہ تعالیٰ کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان کے مرنے کے بعد ایک زندگی ہوتی ہے جس کو برزخی زندگی کہتے ہیں اس کے برخلاف معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان مٹی ہو جاتا ہے اسے کسی قسم کی کوئی زندگی نہیں ملتی۔اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں مومن اور نیک انسانوں کو انعام ملتا ہے ان کے لیے جنت کی کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں جنت کے بچھونے بچھا دیئے جاتے ہیں۔کافر اور کچھ گنہگاروں کو قبر میں عذاب ہوتا ہے اس برخلاف معتزلہ کہتے ہیں کہ قبر کا انعام اور عذاب باطل ہے۔

اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جنتیوں کو جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اس کے برخلاف معتزلہ کہتے ہیں کہ یہ محال ہے۔اس قسم کے بہت کثیر اختلافات ہیں۔یہ فرقہ صدیوں تک رہا مگر علمائے اہل سنت کے دلائل اور ان کی کوششوں سے اب نیست و نابود ہو گیا لیکن اس فرقے کی کچھ باتیں اس وقت کے کچھ فرقوں نے اختیار کر لی ہیں۔

قدریہ: یہ فرقہ صحابہ کرام کے اخیر دور میں پیدا ہو چکا تھا یہ فرقہ تقدیر کا منکر

تھا۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل اپنے ازلی قدیم علم سے ہر بندے کے بارے میں جانتا تھا کہ مومن ہوگا یا کافر۔ نیک ہوگا یا بد۔ امیر ہوگا یا غریب وغیرہ وغیرہ۔ اسی کے مطابق اس نے لوح محفوظ میں فرشتوں سے لکھوادیا۔ لوح محفوظ ایک بہت بڑا دفتر سمجھ لیجئے۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے یا قیامت تک ہونے والا ہے سب اس میں لکھا ہوا ہے، اس میں ردو بدل نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اسی کے مطابق ہو رہا ہے اس کے خلاف ہونا محال ہے۔ قدریہ اس کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی صلاحیت، اپنی محنت اور اپنی کوشش سے ترقی کرتا ہے یا اس میں کمی کی وجہ سے تنزلی پاتا ہے۔ امیر ہوتا ہے یا غریب ہوتا ہے۔ مومن ہوتا ہے یا کافر ہوتا ہے ہر حال میں اس کی محنت و کوشش ہی کو دخل ہے۔

جبریہ: یہ فرقہ بھی پہلی صدی ہجری کے اخیر میں پیدا ہو چکا تھا۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اگرچہ اللہ عزوجل تمام بندوں کا اور ان کے افعال کا خالق ہے مگر اس نے بندوں کو کچھ قدرت اور اختیار بھی دے رکھا ہے اس نے انسان کو سمجھ دی ہے۔ پڑھنے لکھنے کی قوت دی۔ اچھے برے کے پرکھنے کی قوت دی اور پرکھنے کے لئے عقل دی۔ انسان کے اعضاء میں حرکت کی قوت دی۔ انسان اپنی صواب دید سے مذہب اختیار کرتا ہے۔ چلتا پھرتا ہے۔ وہ چاہے تو مسجد میں نماز کے لئے جائے۔ وہ چاہے تو شراب خانے میں شراب پینے کے لئے جائے۔

اس کے برخلاف جبریہ یہ کہتے ہیں کہ بندہ مجبور محض ہے جس طرح (رعشہ) کپکپی والے ہاتھ پاؤں سر وغیرہ بے اختیار ہلتے ڈولتے ہیں حالانکہ رعشہ کا مریض انہیں ہلانا نہیں چاہتا اسی طریقے سے ہر بندہ مجبور محض ہے وہ اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرسکتا۔

مرجیہ: یہ فرقہ بھی دوسری صدی ہجری میں پیدا ہو چکا تھا۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جو اسلام کی بنیادی باتوں کو حق مانے اس کے باوجود کوئی گناہ کرے تو وہ جہنم کا مستحق ہے اپنی گناہ کی سزا میں وہ کچھ دن جہنم میں رہے گا مگر یہ کہ اللہ عزوجل اسے معاف فرمادے۔ اس کے برخلاف مرجیہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان کو گناہ کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

قرامطہ: عراق کے مشہور شہر واسط میں ایک بستی قرمطہ ہے وہاں ۲۵۸ھ میں حم

ان نامی ایک شخص پیدا ہوا اس نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی اس کا بھی اصل رشتہ اسمٰعیلی رافضیوں سے تھا۔ اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا۔ یہ بہت ہی خطرناک فرقہ تھا۔ یہ خفیہ خفیہ اپنی تحریک چلاتا تھا اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا مگر قرآن واحادیث کے وہ معانی بتاتا تھا جو ظاہر کے بالکل خلاف اور ایچ پیچ سے ثابت ہوتے تھے۔ مثلاً وضو کے معنی امام وقت کی محبت بتاتا تھا اور تیمم کا معنی یہ بتاتا تھا کہ امام جب غائب ہو تو اس کی اطاعت میں کچھ کچھ ڈھیل دی جائے۔ زکوٰۃ کے معنی یہ بتاتا تھا کہ جو باتیں دین کی ہیں انہیں جان کر اپنی ذات کو صاف وستھرا رکھا جائے۔ یہ فرقہ بہت زور پکڑ گیا تھا۔ حجاج کو لوٹتا تھا مکہ معظمہ پر قابض ہو گیا۔ کعبہ شریف کا وہ مقدس پتھر جسے حجر اسود کہتے ہیں اکھاڑ کر لے گیا تھا اس کے آدمی تقیہ کر کے بڑے بڑے علماء ومشائخ اور حکام کے یہاں رسوخ حاصل کرتے پھر انہیں ختم کر دیتے لیکن پھر ایک ہی صدی میں سلاطین اسلام نے ان کو بالکل ہی ختم کر دیا۔

نجدی: یہ فرقہ بارہویں صدی کے اخیر اور تیرہویں صدی کے اوائل میں ظاہر ہوا۔ اس فرقے کا بانی محمد بن عبدالوہاب نامی ایک شخص ہے جو نجد کی ایک بستی عیینہ میں پیدا ہوا تھا اس کے باپ دادا پیری مریدی کرتے تھے جس کی وجہ سے اس کے خاندان کا نجد میں کافی اثر تھا اس نے درعیہ کے حاکم محمد بن مسعود سے اپنی لڑکی بیاہی اور اس کو اپنا بنایا۔ پھر اس کو ساتھ لے کر تلوار کے زور سے اپنے فرقے کو پھیلانا شروع کیا پہلے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے علاقے کو زیر کیا پھر نجد سے حجاز تک قابض ہو گیا۔ اس وقت حجاز پر ترکوں کی حکومت تھی۔ مگر ان دنوں ترک برطانیہ، جرمنی، اس کے ساتھ جنگ میں الجھے ہوئے تھے اس لئے ابن سعود نے آسانی سے حجاز پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں کے ہزار ہا باشندوں کو قتل کیا۔ پھر جب ترکوں کو اطمینان ملا تو ترکوں نے ان کو حجاز ہی نہیں بلکہ نجد سے بھی نکال باہر کیا۔ پھر ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ترک اپنے محدود علاقے میں رہ گئے اور حجاز، شام، مصر وغیرہ کے لوگوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں تو برطانیہ کی امداد سے عبدالعزیز بن سعود نے پھر پورے نجد وحجاز پر قبضہ کر لیا اور ترکوں کو نکال باہر کر دیا۔ ان کو وہابی بھی کہا جاتا ہے ان کی مذہبی بنیادی کتاب ”کتاب التوحید“ ہے جو ابن عبدالوہاب نے لکھی ہے اس فرقے کے بنیادی عقائد یہ ہیں:

۱۔سوائے ان کے (وہابیوں کے) پوری دنیا کے مسلمان کافر و مشرک ہیں ان سے جہاد کرنا ان کو قتل کرنا ان کے ملکوں کو لوٹنا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔

۲۔اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا و اولیا کو یہ قوت بخشی ہے کہ لوگوں کی مدد کریں۔یہ قوت انہیں زندگی میں بھی حاصل ہے اور فوت ہونے کے بعد بھی حاصل رہتی ہے نجدی وہابی یہ کہتے ہیں اللہ عزوجل کے علاوہ کسی نبی ولی سے مدد مانگنا شرک ہے۔

۳۔تمام اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ انبیا و اولیا قیامت کے دن گنہ گاروں کی شفاعت کریں گے وہابی نجدی شفاعت کے منکر ہیں۔

۴۔تمام اہل سنت و جماعت میلاد و فاتحہ،عرس وغیرہ کرتے ہیں وہابی نجدی ان سب کو حرام و گناہ کہتے ہیں۔

ان مذکورہ بالا فرقوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے فرقے پیدا ہوئے جو محدود دائرے میں رہ کر چند دن کے بعد فنا ہوئے۔

ہندوستان کے موجودہ فرقے

وہابی: یہ فرقہ ہندوستان میں نجد سے آیا۔اس کی بنیاد محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کتاب ''التوحید'' پر ہے۔اس فرقے کے بانی مولوی اسمٰعیل بن عبدالغنی بن ولی اللہ دہلوی ہیں۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی گیارہویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے بہت زبردست عالم تھے اور بہت بڑے پیر بھی۔ان کا اثر پورے ہندوستان پر تھا۔بلکہ ہندوستان کے باہر بھی تھا۔انہیں کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہیں جو دہلی کے بہت بڑے مرکزی عالم تھے۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی چونکہ شاہ ولی اللہ کا پوتہ اور شاہ عبدالعزیز کا بھتیجا اور شاگرد بھی تھا۔عوام میں بزرگ پرستی عام ہے جس کے نتیجے میں اپنے استاذ اور پیر کی اولاد کو پیروں کی طرح ماننے کا جذبہ موجود ہے اس کی وجہ سے مولوی اسمٰعیل دہلوی کے ماننے والوں کی اچھی خاصی تعداد دہلی اور اس کے علاقوں میں موجود تھی۔چونکہ ان کے والدین کا بچپن ہی میں

انتقال ہو گیا تھا اس لئے ان کی کما حقہ تربیت نہیں ہو سکی ۔ساتھ ہی ساتھ فطری طور پر منچلے اور شوخ اور نئی نئی باتوں کے گرویدہ تھے ۔یہ دور وہ تھا کہ مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی ۔انگریز پورے طور پر اس کو اپنی مٹھی میں لے چکے تھے ۔صرف دہلی پر مغل شہنشاہ کی حکومت رہ گئی تھی ۔وہ بھی برائے نام ۔ان کی حیثیت انگریزوں کی وظیفہ خوار کی کی تھی ۔پورے پنجاب پر سکھ قابض ہو چکے تھے ۔البتہ پشاور اور سرحد کے لوگ آزاد تھے مولوی اسمٰعیل کے اندر بادشاہ بننے کا خبط پیدا ہوا انہوں نے پہلے ایک کتاب لکھی جس کا نام ''تقویۃ الایمان'' رکھا اس میں انہیں عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جو ابن عبدالوہاب نجدی کی کتاب ''التوحید'' میں ہے۔

ان عقائد کو پھیلانے کے لئے مسلمانوں میں دو تحریک چلائی ایک یہ کہ اللہ ہی کو مان ۔اوروں کو مت مان ۔اوروں کو ماننا خبط ہے ۔دوسرے یہ کہ قرآن مجید سمجھنے کے لئے بہت زیادہ علم کی ضرورت نہیں ۔عربی زبان جان لینا کافی ہے ۔اس لئے ان کو زیادہ دین کا علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ۔اس سے وہ یہ فائدہ حاصل کرتا تھا کہ ہر عربی داں خود قرآن مجید کو سمجھے ۔قرآن مجید کے وہ معانی و مطالب جو صحابہ کرام اور ان کے بعد کے آنے والے مسلمانوں نے بتایا ہے ان کو ماننے کی ضرورت نہیں۔

تقویۃ ایمان میں مولوی اسمٰعیل دہلوی نے انبیاء کرام و اولیاء عظام کی شان میں بہت سے نازیبا الفاظ استعمال کئے ۔مثلا وہ ذرہ ناچیز سے کم تر ہیں ۔عاجز و نادان ہیں ۔زیادہ سے زیادہ ہمارے بڑے بھائی کی طرح ہیں ۔بلکہ یہ بھی ایک جگہ لکھ دیا کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے ایک جگہ لکھ دیا کہ جس کا نام محمد یا علی ہو وہ کسی چیز کا مالک و مختار نہیں ۔ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں لکھا وہ مر کر مٹی میں مل گئے۔

تمام اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوسرے انبیاے کرام و اولیاعظام قیامت کے دن اللہ عزوجل کی بارگاہ میں شفاعت فرمائیں گے انہوں نے جگہ جگہ اس کا بھی انکار کیا ۔تقویۃ الایمان کے بارے میں خود ان کا اپنا یہ خیال تھا اس سے شورش ہوگی ۔لڑائی اور جھگڑا ہوگا ۔چنانچہ ان کے اس گمان کے مطابق تقویۃ الایمان کے شائع ہونے کے بعد لڑائی جھگڑا اور شورش شروع ہوئی اس وقت کے تمام علمائے اہل سنت نے اس کا رد

لکھا۔

خود ان کے بھتیجے مولانا موسیٰ، مولانا مخصوص اللہ نے تقویت الایمان کا رد لکھا، جس کا نام ''معید الایمان'' ہے اس زمانے میں دہلی کے سب سے بڑے عالم علامہ فضل حق خیر آبادی نے بھی اس کا رد لکھا جس کا نام ''تحقیق الفتویٰ'' ہے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے حادثے میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ انگریزوں سے باقاعدہ جنگ کیا، جس کی سزا میں جزیرۂ انڈمان جلا وطن کر دیئے گئے۔ وہیں ان کا انتقال بھی ہوا، وہیں ان کا مزار بھی ہے اس وقت کے علمائے اہل سنت کی متحدہ مخالفت کے نتیجے میں مولوی اسماعیل دہلوی کا مذہب وہابیت پنپ نہ سکا محدود دائرے میں رہ گیا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد انگریزوں سے اجازت لے کر سکھوں کے خلاف جہاد کی تحریک چلائی، اس کے لیے پورے ملک کا دورہ کیا، جہاد کے نام پر مولوی اسماعیل کے ساتھ ایک بھیڑ جمع ہوگئی اور یہ اس بھیڑ کو لے کر صوبۂ سرحد پہنچے، وہاں اس وقت مختلف سرداروں کی منتشر حکومتیں تھیں۔ سرحد کے جن سرداروں نے ان کا مذہب قبول کیا، ان کو اپنے ساتھ لیا، ورنہ انہیں تباہ و برباد کر دیا، یہاں تک کہ وہاں کے کچھ سردار جن کی سکھوں سے مسلسل جنگ چلی آرہی تھی، صلح کر لی اور مولوی اسماعیل سے بچنے کے لیے سکھوں کے ساتھ مل گئے، جن کے نتیجے میں مولوی اسماعیل بالاکوٹ میں قتل کر دیئے گئے۔

غیر مقلد:

دہلی میں کچھ لوگوں نے ان کی تحریک کو قبول کر لیا تھا، جن میں ایک مشہور عالم نذیر حسین دہلوی ہیں۔ یہ بہت قابل ذہین عالم تھے، انہوں نے اپنے طور پر فری (بلا معاوضہ) حدیث پڑھانا شروع کیا، اور اپنے شاگردوں کو وہابیت کی تلقین کی جو عقائد نجدی وہابیوں کے تھے، وہی عقائد ان کے بھی تھے۔ بنیادی طور پر انہوں نے اپنے شاگردوں کو یہ سمجھایا کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی وغیرہ نے قرآن واحادیث سے جو مسائل نکال کر فقہ کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اکثر غلط ہیں۔ حدیث کی کتابیں موجود ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم براہِ راست قرآن واحادیث سے مسائل نکالیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ''اہل حدیث'' کہتے ہیں

اور عرف عام میں انہیں "غیر مقلد" کہا جاتا ہے۔ ان سے اہل سنت کا سیکڑوں مسائل میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل بہت طویل ہے۔

دیوبندی:

مولوی اسماعیل ہی سے متاثر ہو کر کچھ لوگ عقیدے میں ان کے ساتھ تھے۔ لیکن عملی طور پر وہ اپنے آپ کو حنفی کہتے تھے۔ یعنی عملیات میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے مقلد تھے اور تقلید کو واجب جانتے تھے۔ ایسی ہی لوگوں سے نانوتہ ضلع سہارن پور کے مولوی قاسم بانی مدرسہ دیوبند نے تعلیم حاصل کی۔ فراغت کے بعد دیوبند میں ایک مدرسہ کو دارالعلوم بنانے کی تحریک چلی جو وہاں کے مقامی لوگوں نے قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ دیوبند کی ایک مسجد جس کا نام چھتہ کی مسجد ہے قائم ہوا تھا۔ جب مدرسہ جم گیا تو مولوی محمد قاسم دیوبند پہنچ گئے اور مدرسے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس مدرسے میں مولوی اسماعیل دہلوی اور عبدالوہاب نجدی کے عقائد کی تعلیم دینے لگے۔ ادھر مولوی رشید احمد گنگوہی نے اپنے وطن گنگوہ میں خانقاہ قائم کرلی اور پیری مریدی کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس طرح وہابیت کی دوسری شاخ وجود میں آئی۔ یہ لوگ تمام عقائد میں وہابیوں کے ہمنوا ہیں۔ دیوبندی اور غیر مقلدین میں عقیدے کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف ہے تو صرف یہ کہ غیر مقلد کسی امام کی تقلید کو شرک سمجھتے ہیں اور دیوبندی تقلید کو واجب جانتے ہیں اور اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں۔ غیر مقلد پیری مریدی کو حرام اور بدعت کہتے ہیں اور دیوبندی بہت دھوم سے پیری مریدی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اہل سنت سے عقیدے کا اختلاف یہ ہے:

تمام اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا کو خصوصاً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب عطا فرمایا اور دیوبندی یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لیے علم غیب ثابت کرنا شرک ہے۔

تمام اہل سنت میلاد، نیاز، عرس، فاتحہ کرتے ہیں اور دیوبندی اس کو حرام و بدعت کہتے ہیں۔ اور بھی چھوٹے چھوٹے بہت سے اختلافات ہیں۔ خاص دیوبندیوں کے مزید عقائد یہ ہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی کر خاتم الانبیا نہیں کہ آپ سب میں آخر نبی ہیں اگر آپ کے زمانے میں یا آپ کے زمانے کے بعد کوئی نبی پیدا ہو جائے تو خاتمیت نبی میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔ آپ بدستور خاتم الانبیاء ہیں۔ (تحذیر الناس)

(۲) شیطان کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے۔ (براہین قاطعہ)

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا علم غیب ہر زید، عمر، بکر بلکہ ہر صبی (بچہ، و مجنون (پاگل) جمیع حیوانات (جانوروں) بہائم (چوپایوں) کو بھی حاصل ہے۔ (حفظ الایمان)

(۴) اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ ہر کام جو بندے کر سکتے ہیں وہ بھی کر سکتا ہے۔

نیچری:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں انگریزوں سے بہت قریب تھے اور انگریزوں سے کافی متاثر بھی۔ انگریزوں نے اسلام پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ جو باتیں قرآن وحدیث میں مذکور ہیں، اگر ہمارا نیچر قبول کرے تو مانیں ورنہ ان کے ایسے معانی بیان کریں جسے ہمارا نیچر قبول کرے۔ مثلاً فرشتوں کا کوئی وجود نہیں۔ چیزوں میں جو قدرتی خیر کی قوت ہوتی ہے، انہیں کا نام فرشتہ ہے۔ جنت کوئی گھر نہیں جو بطور انعام مسلمانوں کو ملے گا۔ بلکہ اپنی نیکیوں پر خوش ہونے کا نام ہے۔ دوزخ کسی جگہ کا نام نہیں بلکہ اپنی برائیوں پر کڑھنے کا نام دوزخ ہے۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر لکھی جس میں ان سب باتوں کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانے میں تمام مسلمانوں نے ان سے عقیدے کی بنیاد پر بیزاری ظاہر کی۔ جس کے نتیجے میں نیچری فرقہ منظم نہیں ہو سکا، پھر بھی ہزاروں مسلمان کہلانے والے انہیں کے مطابق اعتقاد رکھتے ہیں۔

قادیانی:

پنجاب ضلع گرداسپور میں ایک بستی قادیان ہے۔ وہاں ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی پیدا ہوا۔ اس نے مولوی محمد قاسم دیوبندی سرغنہ کی کتاب "تحذیر الناس" پڑھ کر یہ

سوچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کا پیدا ہونا خاتم الانبیا ہونے کے منافی نہیں تو اس نے نبوت کا دعویٰ کرلیا کہ میں ظلی اور بروزی نبی ہوں اور یہ کہا کہ حدیثوں میں جو آیا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم قیامت کے قریب آئیں گے، وہ میں ہوں اس کے علاوہ اور بھی مسلمانوں کے خلاق عقیدے ایجاد کیے۔ چوں کہ وہ آدمی بہت ذہین پڑھا لکھا اور چالاک تھا، اس لیے اس نے زیادہ تر انگریزی داں طبقہ کو اپنا ہموا بنایا۔ اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس نے اپنی تحریک کو چلایا جس کے نتیجے میں ہندوستان کے ہزاروں آدمی قادیانی ہوگئے اور اب بھی موجود ہیں۔

اہل قرآن:

ایک شخص عبداللہ نامی پیدا ہوا۔ یہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کا بہت زبردست ماہر تھا۔ اس نے یہ کہا کہ احادیث معتبر نہیں۔ اس لیے کہ آج جو حدیث کی کتابیں ملتی ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ایک صدی گزرنے کے بعد لکھی گئی ہیں اور یہ کتابیں لکھنے والے سب ایرانی ہیں جنہوں نے اپنے جی سے گڑھ کر حدیثوں کے دفتر تیار کیے۔ ہاں! قرآن مجید محفوظ ہے۔ ہم صرف قرآن کو حق مانتے ہیں جو کچھ ہمیں قرآن سے سمجھ میں آئے وہی عقیدہ رکھیں گے۔ اور اسی پر عمل کریں گے۔ حدیثوں کا اور علمائے اسلام نے جو کچھ لکھا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ بجائے پانچ وقت کے صرف دو وقت نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز کا طریقہ بھی عام مسلمانوں سے الگ تھلگ ہے۔ اس فرقے کے لوگ بہت تھوڑے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

مودودی:

اس فرقے کے بانی ابو الاعلیٰ مودودی صاحب ہیں یہ لوگ اپنے آپ کو جماعت اسلامی کہتے ہیں یہ فرقہ بھی حقیقت میں وہابیت ہی کی ایک شاخ ہے یہ لوگ بھی تمام دیوبندیوں کی طرح ابن عبدالوہاب نجدی اور اسماعیل دہلوی کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں اور ابن عبدالوہاب کی کتاب ”کتاب التوحید“ اور مولوی اسماعیل دہلوی کی کتاب ”تقویۃ

الایمان'' کو اپنے مذہب کی بنیادی کتاب مانتے ہیں۔ مزید برآں ان کا اختلاف غیر مقلد اور دیوبندیوں سے بھی بہت باتوں میں ہے۔

ابو الاعلیٰ مودودی صاحب صحابۂ کرام کی شان میں بہت گستاخ ہیں۔ اپنی کتاب خلافت وملوکیت میں انہوں نے صحابہ کرام پر بے جا، ناروا حملے کیے ہیں۔ نیز قرآن مجید کے بعض قوانین میں ترمیم کے بھی حامل ہیں۔ مثلاً چور کی سزا میں ہاتھ کاٹنا، یا زنا کی سزا میں سنگساری کرنا، اگرچہ وہ یہ ترمیم محدود دائرے میں چاہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا اختلاف دیوبندیوں سے بھی ہے اور غیر مقلدین سے بھی ہے۔ اہل سنت سے تو ہے ہی انہوں نے بھی انگریزی طبقہ کو زیادہ تر اپنا ہم نوا بنایا ہے۔ اس وجہ سے یہ جماعت بہت منظم اور مضبوط ہے لیکن مسلمانوں کی اکثریت خواہ وہ عوام ہوں یا علما و مشائخ سب ان سے بے زار ہیں۔

نیازی:

ایک شخص شمع نیازی پیدا ہوا، جس کا رجحان شیعیت کی طرف زیادہ تھا۔ اس نے یہ کہا کہ کعبہ بیت اللہ نہیں بلکہ وہ حضرت آدم کی قبر ہے اسی لیے اس کا طواف کیا جاتا ہے، اور حج کیا جاتا ہے یہ لوگ تعزیہ داری وغیرہ بہت دھوم سے کرتے ہیں۔ شیعوں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے، اور قبر پرستی میں بہت آگے ہیں، اس فرقے کے بہت تھوڑے اشخاص کہیں کہیں خال خال پائے جاتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے، سوائے ایک کے سب جہنم میں جائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک اتنے فرقے ہوں گے اور اس سے مراد بنیادی فرقے ہیں۔ ورنہ بنیادی فرقوں کی شاخوں کو لیا جائے تو اب تک بہت سے زائد ہو چکے ہیں، جن میں اکثر فنا ہو گئے۔

(۱۵؍ جمادی الآخرہ ۱۴۱۱ھ۔ ۲۸؍ دسمبر ۱۹۹۰ء)

باب سوم

تحقیقات و فقہیات



پیغمبر خدا

قانون داں بھی قانون ساز بھی

قانون ساز اور قانون دان یہ دو لفظ عرف میں الگ الگ معنی کے لیے آتے ہیں۔قانون داں کے معنی ہیں ۔قانون جاننے والا،جس کی حیثیت صرف قانون کے کلیات و جزئیات کے معتد بہ حصہ پر عبور کی ہوتی ہے،ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر اتنی مہارت ضروری ہے کہ وہ ہر نئے پیش آنے والے حادثہ کا حکم قانون کی کلیات سے یا اس کے مثل و نظیر دوسری جزئی سے قیاس کر کے نکال سکے جس کی مثال وکیل اور بیرسٹر ہیں کہ یہ لوگ صرف قانون داں ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی قابل ،ذہین ،فطین ہوں یہ لوگ قانون کی دفعات یا اس کی عبارت میں کوئی ادنیٰ رد و بدل نہیں کرسکتے۔قانون کے اصطلاحی معنوں میں کوئی تغیر نہیں کر سکتے ۔اگرچہ ان میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ نئے مقدمات کے لیے قانون کی دفعات سے احکام نکال لیتے ہیں اور اسے اپنے دعویٰ کے مطابق کرنے کے لئے ہفتوں،مہینوں بحث و تمحیص کر سکتے ہیں،مگر قانون میں کوئی ترمیم ہیں کر سکتے ہیں۔

شریعت اسلامیہ میں ان کی نظیر علماے دین ہیں جو شریعت کے اصول و فروع پر حاوی ہوتے ہیں۔اتنی استعداد رکھتے ہیں کہ کوئی نیا واقعہ رونما ہو تو اس کا حکم استخراج کر لیتے ہیں۔حتیٰ کہ مسائل شرعیہ پر اعتراض کرنے والوں کو دندان شکن جواب دے لیتے ہیں،مگر شریعت کے کسی حکم کو بدل نہیں سکتے اس میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے اس کے الفاظ کو نیا معنی نہیں پہنا سکتے۔

رہ گیا قانون ساز تو یہ لفظ اس اختیار ہستی پر اطلاق کیا جاتا ہے جو جب چاہے خواہ باختیار خود یا باذن مختار مطلق قانون کی جس دفعہ کو چاہے منسوخ کردے،اس میں رد و بدل

کردے۔الفاظ کے نئے معنی معین کردے،جن افراد کو چاہے جس قانون سے چاہے مستثنیٰ کردے۔اس کی ایک مثال ہمارے معاشرے میں شہنشاہ کی ہے کہ وہ اپنی مملکت کا آمر مطلق ہوتا ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے،جو قانون چاہتا ہے ختم کردیتا ہے جسے چاہتا ہے جس قانون سے چاہتا ہے مستثنیٰ کردیتا ہے۔دوسری مثال وزیر قانون کی ہے کہ وہ شہنشاہ کے اذن واختیار سے قانون بناتا ہے،اس میں ترمیم وتبدیل کرتا ہے۔

اب جب قانون داں و قانون ساز دونو الفاظ کے معانی ذہن نشین ہوگئے تو اب آیئے شریعت اسلامیہ کی تاسیس کا ایک تحقیقی جائزہ لیں اور یہ تلاش کریں کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیثیت صرف قانون داں کی تھی یا یہ کہ آنحضور ﷺ باذن اللہ قانون ساز بھی تھے۔

۱۔اس بحث کے چند پہلو ہیں ایک یہ کہ آنحضور ﷺ باذن اللہ قانون ساز تھے۔قرآن کی روشنی میں۔

۲۔آنحضور ﷺ قانون ساز ہیں احادیث کی روشنی میں۔

۳۔آنحضور ﷺ قانون ساز ہیں شواہد کی روشنی میں۔

۴۔اس بارے میں امت کا عقیدہ آج سے پہلے کیا رہا اور کیا ہے؟

(۱) آیات:

آیات قرآن کریم پر اگر کوئی تحقیقی نظر ڈالے تو اسے اس بارے میں صدہا نصوص مل جائیں گی۔سرسری نظر ڈالنے پر بھی جو نصوص سامنے ہیں وہ کم نہیں۔

آپ قرآن مجید کی تلاوت کریں،جگہ جگہ ملے گا اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔جس نے اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی وہ فاسق وظالم ہے،اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔اللہ عزوجل کے مختار مطلق ہونے کے بارے میں کسی مدعی اسلام کو ادنیٰ شبہ نہیں ہوسکتا ہے۔اس کی شان تو فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ اور يَحْكُمُ مَا يَشَاءُ ہے۔اللہ عزوجل کی اطاعت وعصیان کے موازی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم اور عصیاں کی ممانعت اس کی دلیل ہے کہ اس باب میں مختار و ماذون ،عطائی و ذاتی و جوب

وامکان، حدوث وقدم وغیرہ کا فرق تو ہے مگر واجب الاِتباع و مطاع دونوں ہیں۔اس لیے ماننا پڑے گا کہ جس طرح اللہ عزوجل شریعت میں نسخ، ترمیم، تبدیل، تخصیص، تقیید کر سکتا ہے اس کے اذن سے اس کے رسول ﷺ بھی یہ سب اختیار رکھتے ہیں، اور یہی معنی قانون ساز کے ہیں۔ان عمومی ارشادات کے علاوہ آیئے چند خصوصی ارشادات ملاحظہ کریں، ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ.

(آل عمران: پ۳۔ع۱۲ آیت ۳۱)

ترجمہ فرمادو! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب بنالے گا۔

اور ہر شخص جانتا ہے کہ اتباع کا یہی مطلب ہے کہ جو حکم دیا جائے اس کو مانا جائے اور پر عمل کیا جائے۔اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ رسول جو حکم دیں اس کا ماننا لازم ہے ثابت ہو گیا کہ رسول کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ امت کو جو چاہیں حکم دیں، یہی قانون ساز کے معنی ہیں، اور فرمایا گیا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا. (سورہ نساء: پ۵۔ع۱۴۔ آیت ۱۱۵)

ترجمہ: حق ظاہر ہو جانے کے بعد جو بھی رسول کے خلاف کرے، اور مومنوں کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ پکڑے ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ مڑا اور اسے جہنم میں ڈالیں گے اور یہ برا ٹھکانا ہے۔

رسول کا خلاف یہی ہے کہ وہ جو فرمائیں نہ مانا جائے اس پر عمل نہ کیا جائے یہ اسی بنا پر ہے کہ ان کا ہر حکم قانون شریعت ہے اور جس کا حکم ہر قانون شریعت ہوتا ہے، وہ قانون ساز ہوتا ہے، صرف قانون داں نہیں۔اور سنیئے سورۂ نور میں ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. (سورہ نور: پ۱۸۔ع۱۵۔ آیت ۶۳)

ترجمہ: جولوگ رسول کے حکم کے خلاف کرتے ہیں وہ ڈریں کہیں ان کو فتنہ نہ آئے
یا دردناک عذاب نہ پہنچے۔

رسول کے حکم کے خلاف کرنے والے پر یہ وعید اسی لئے ہے کہ ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی شریعت کی خلاف ورزی ہے، اور یہ حیثیت شریعت ساز کی ہو سکتی ہے صرف شریعت دان کی نہیں۔ لیجئے سورۂ احزاب کی آیت ہے:

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا.

(سورہ احزاب: پ ۲۲۔ ع ۲۔ آیت ۳۶)

ترجمہ: کسی مسلمان مرد یا مسلمان عورت کی مجال نہیں کہ اللہ ورسول کوئی حکم فرمائیں تو انہیں اپنے معاملہ کا اختیار رہے اور جو اللہ ورسول کا حکم نہ مانے وہ بلاشبہ کھلے بند گمراہ ہوگا۔

اس آیت کریمہ کی مراد کی توضیح کے لیے اس کا شان نزول بھی سنتے چلیے۔ حضور سید عالم ﷺ نے اپنے متبنیٰ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح کا پیام زینب بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے بھائی کو دیا، ان لوگوں نے نامنظور کیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ غور کیجئے! زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت زینب کا نکاح ہونا حضور ﷺ ہی نے بہ نفس نفیس طے فرمایا۔ خود ہی پیام دیا، اس بارے میں کوئی آیت نہیں اتری تھی، مگر اسے نامنظور کرنے پر اتنی سخت وعید آئی اور اسے اللہ کا بھی حکم فرمایا گیا، اس کی نافرمانی اللہ کے حکم کی نافرمانی قرار دی گئی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آں حضور ﷺ کی حیثیت صرف قانون داں کی نہیں قانون ساز کی بھی ہے۔

(۲) احادیث:

(۱) ترکت فیکم امرین لن تضلو اما ان تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ.

ترجمہ: میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان دونوں کے پابند رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔

کتاب اللہ کے قانون شریعت ہونے میں کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔ اس کے

موازی آنحضور ﷺ نے سنت رسول اللہ کو بھی رکھا، جس سے معلوم ہوا کہ سنت رسول اللہ بھی قانون شریعت ہے اور یہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو قانون ساز تسلیم کیا جائے، جن کے ارشاد، کردار، اور تقریر کا نام سنت ہے۔

(۲) حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جسے ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی نے نقل فرمایا۔ ارشاد ہے:

الا یوشک رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن ما وجدتم فیه من حلال فاحلوه وما وجدتم من حرام فحرموه وان ما حرم رسول الله کما حرم الله.

ترجمہ: کوئی پیٹ بھرا اپنی مسند پر بیٹھا یہ نہ کہنے لگے: تم صرف قرآن کے پابند رہو اس میں جو حلال پاؤ اسے حلال جانو، اور اس میں جو حرام پاؤ اسے حرام جانو۔ حالاں کہ رسول اللہ نے جسے حرام فرمایا وہ اسی کے مثل ہے جسے اللہ نے حرام فرمایا۔

(۳) امام ابو داؤد نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے اسی کے ہم معنی روایت کی، اس میں یہ ارشاد فرمایا:

الا وانی والله قد امرت و نهیت عن اشیاء انها لمثل القرآن.

ترجمہ: سنو! قسم خدا کی میں نے کچھ چیزوں کا حکم فرمایا ہے اور کچھ چیزوں سے منع فرمایا ہے، بے شک وہ قرآن کے مثل ہے۔

(۴) امام ترمذی، ابو داؤد وابن ماجہ اور امام احمد و بیہقی نے حضرت ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کے مثل روایت فرمائی، اس میں ارشاد ہے:

لا الفین احد کم متکئا علیٰ اریکته یاتیه الامر من امری مما امرت او نهیت عنه یقول لا ادری ما وجدنا فی کتاب الله اتبعناه.

ترجمہ: اپنی مسند پر ٹیک لگائے کسی کو یہ کہتے نہ پاؤں کہ جب اس کے پاس کوئی چیز میری فرمودہ یا میری منع کردہ آئے تو یہ کہہ دے میں نہیں جانتا۔ ہم نے جو کتاب اللہ میں پایا اس کی اتباع کی۔

ان احادیث کو پڑھیے اور دیکھئے جن لوگوں نے صرف اللہ کے حلال کیے ہوئے کو حلال جانا اور اللہ کے حرام کیے ہوئے کو حرام اور رسول اللہ ﷺ کے حلال کیے ہوئے کو حلال، اور حرام کیے ہوئے کو حرام نہیں جانا ان پر کتنا شدید غضب فرمایا۔ اور بلا کسی اشتباہ کے فرمایا کہ میری حلال کردہ اشیاء اور حرام کردہ اشیاء اسی کے مثل ہیں جنہیں اللہ نے حلال یا حرام فرمایا۔ کیا کسی قانون داں کا قول، قانون ساز کے قول کے مثل ہوسکتا ہے؟ کیا جو قانون داں اور قانون ساز کے اقوال میں تفریق کرے وہ اس شدید غضب کا مستحق ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہیں اور ضرور نفی میں ہے تو جو لوگ اللہ عزوجل کو قانون ساز مانتے ہیں انہیں ماننا پڑے گا کہ حضور سید عالم ﷺ بھی ضرور بالضرور قانون ساز ہیں۔

(۵) امام مالک و احمد و بخاری و مسلم و نسائی و ابن ماجہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ ارشاد فرمایا:

لو لا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوٰۃ .

ترجمہ: اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم فرمادیتا۔

تیسیر وغیرہ میں اس حدیث کو متواتر بتایا ہے، انہیں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام احمد و نسائی نے یوں روایت فرمائی کہ ارشاد ہوا

لو لا ان اشق علی امتی لامرتھم عند کل صلوٰۃ بوضوء و مع کل وضوء بسواک.

ترجمہ: اگر اس کا لحاظ نہ ہوتا کہ میری امت پر شاق ہوگا تو انہیں حکم دیتا کہ ہر نماز کے وقت وضو کریں اور ہر وضو کے ساتھ مسواک کریں۔

(۶) ابن ماجہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ یوں ارشاد ہوا:

لو لا ان اشق علیٰ امتی لفرضتہ علیھم.

ترجمہ: اگر میری امت کی مشقت کا خوف نہ ہوتا تو مسواک ان پر فرض کردیتا۔

(۷) امام ابو نعیم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی کہ ارشاد فرمایا:

لو لا ان اشق علی امتی لامرتھم ان یستاکوا بالاسحار.

ترجمہ: اس کا لحاظ نہ ہوتا کہ میری امت پر شاق ہو تو میں حکم فرمادیتا کہ ہر پچھلے پہر مسواک کیا کریں۔

(۸) امام بخاری و مسلم ونسائی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

لو لا ان اشق علی امتی لامرتھم ان یصلوھا ھکذا یعنی العشا نصف اللیل.

ترجمہ: اگر میری امت پر شاق ہونے کا خیال نہ ہوتا تو میں حکم دیتا کہ اسے یعنی عشاء کو اس وقت یعنی آدھی رات کو پڑھیں۔

غور کیجیے! ہر نماز کے وقت وضو یا مسواک یا ہر وضو کے ساتھ مسواک یا ہر صبح کو مسواک یا نماز عشاء کا نصف لیل تک موخر کرنا فرض نہیں، مگر حضور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا لحاظ ہے کہ ان چیزوں کے فرض فرمادینے سے امت مشقت میں پڑ جائے گی ورنہ ان چیزوں کو فرض کر دیتا مگر چوں کہ ان کے فرض کر دینے سے امت مشقت میں پڑ جائے گی، اس لیے میں نے ان کو فرض نہیں فرمایا۔

(۹) یہ قول کسی قانون داں کا نہیں ہو سکتا یہ قول صرف قانون ساز کا ہو سکتا ہے فرماتے ہیں:

انی احرم علیم حق الضعیفین الیتیم والمرأۃ.

ترجمہ: میں دو کمزوروں کی حق تلفی تم پر حرام کرتا ہوں: یتیم اور عورت۔ متفق علیہ

(۱۰) ارشاد ہے:

لا تشرب مسکر افانی حرمت کل مسکر.

ترجمہ: نشہ کی کوئی چیز نہ پی، میں نے ہر نشہ آور حرام فرمادیا۔

(۳) شواہد:

شواہد ونظائر بھی اس باب میں اتنے کثیر ہیں کہ ان سب کا احاطہ دشوار ہے۔ بلکہ جو فقیر کے علم میں اس وقت ہیں ان سب کا بھی کہ یہ نمبر متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ایک صاحب حاضر ہوئے، عرض کی: میں ہلاک ہو گیا۔ فرمایا کیا بات ہے؟ عرض کی، میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے ہم بستری کر لی ہے۔ فرمایا: ایک غلام آزاد کر سکتا ہے؟ عرض کی نہیں۔ فرمایا: کیا اسی طاقت ہے کہ مسلسل ساٹھ روزے رکھے، عرض کی نہیں۔ فرمایا: کیا اتنی استطاعت ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ عرض کی نہیں۔ اتنے میں سوا دو من خرمے کسی نے پیش کئے۔ فرمایا: انہیں خیرات کر دے۔ عرض کی: اپنے سے زیادہ محتاج پر نہ؟ مدینہ بھر میں کوئی گھر ہمارے برابر محتاج نہیں۔

یہ سن کر حضور سید عالم ﷺ اتنا ہنسے کی دندان مبارک ظاہر ہو گئے، فرمایا: جا، اپنے گھر والوں کو کھلا دے۔

(۲) اسی کے مثل کفارہ ظہار میں بھی وارد ہے:

ظہار اور روزے کا کفارہ یہ مقرر ہے کہ وہ غلام آزاد کرے، اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے میں لگاتار روزے رکھے۔ اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کھانا کھلائے۔ مگر یہ حضور سید عالم ﷺ کی شان قانون سازی ہے کہ ان دونوں صاحبوں کو اس کفارہ سے مستثنیٰ فرما دیا، نہ صرف یہ کے مستثنیٰ فرما دیا، بلکہ انہیں اتنے کثیر خرمے عطا فرمائے۔

(۳) امام احمد مسند میں ثقات رجال صحیح مسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص آئے اور اس شرط پر اسلام لائے کہ صرف دو ہی نماز پڑھوں گا، نبی کریم ﷺ نے قبول فرما لیا۔ کیا صرف قانون داں کی حیثیت ہے کہ وہ اللہ کی فرض کی ہوئی تین نمازوں کو معاف کر دے۔ یہ صرف قانون ساز کا عہدہ ہے۔

(۴) حارث بن اسامہ بن نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور خود حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، مصنف ابن ابی شیبہ و تاریخ بخاری و مسند ابو یعلی و ابن خزیمہ اور معجم کبیر طبرانی میں مروی ہے کہ فرمایا:

من شهد له خزيمة فهو شهد عليه وحسبه.

ترجمہ: خزیمہ کسی کے موافق یا مخالف گواہی دیں ان کی تنہا گواہی کافی ہے حالاں کہ قرآن کریم میں ہے:

واشھدوا ذوی عدل منکم. (طلاق: پ ۲۸. ع ۱۷. آیت ۲)

ترجمہ: تم میں سے دو عادل گواہی دیں۔

مگر آنحضورﷺ نے حضرت خزیمہ کی تنہا شہادت کو دو کے برابر فرمادیا، یہ دلیل ہے کہ آنحضورﷺ قانون ساز ہیں:

(۵) سونا اور ریشمی کپڑا مردوں کے لیے حرام ہے۔ مگر حضورﷺ نے حضرت براء کے لیے سونے کی انگوٹھی اور حضرت سراقہ کے لیے کسریٰ کے زریں کنگن اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف وزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لیے خارش کے وقت ریشمی لباس حلال فرمایا۔

(۶) حکام کے لیے تحفے قبول کرنا جائز نہیں، مگر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے حلال فرمایا۔ (سیف فی کتاب المفتوح)

(۷) فرماتے ہیں:

قد عفوت عن الخیل والرقیق وھاتو اصدقة الورقة من کل اربعین درھما درھم.

ترجمہ: میں نے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ معاف کردی، روپیوں کی زکوٰۃ دو ہر چالیس درہم میں ایک درہم ہے۔

صحیحین اور مسند امام احمد اور شرح معانی الآثار میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا:

اللھم ان ابراھیم حرم مکة انی احرم ما بین لابتیھا.

ترجمہ: اے اللہ! ابراہیم نے مکہ کو حرم کردیا اور میں (مدینہ کی) دونوں پہاڑیوں کے درمیان کو حرم بناتا ہوں۔ "یعنی مدینہ طیبہ کو"۔

(۸) حجۃ الوداع کا موقع ہے، حرم مکہ کے احکام بیان فرمارہے ہیں، ارشاد ہوا۔ اس کا میدان نہ صاف کیا جائے یعنی گھاس نہ چھیلی جائے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کی:

الا الا ذخر فانه لقينهم و بيوتهم.

ترجمہ: سوائے اذخر کے یا رسول اللہ! اس لیے کی یہ ان کی بھٹی کے لیے ہے اور ان کے گھروں کے لیے ہے۔

فوراً بلا تاخیر اس کا استثنا فرمادیا۔

حجۃ الوداع کا موقع ہے۔ حضور سید عالم ﷺ حج کی فرضیت بیان فرمارہے ہیں کہ اقرع بن حابس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے عرض کیا:

العامنا هذا ام للأبد.

کیا اسی سال کے لیے یا ہمیشہ کے لیے۔

فرمایا: اسی سال کے لیے۔ اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال کے لیے واجب ہو جائے۔

ان شواہد کو دیکھئے کیا یہ سب پکار پکار کر نہیں بتا رہے ہیں کہ آنحضور ﷺ قانون ساز ہیں۔ صرف قانون داں نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک حدیث سے قرآن مجید کا نسخ جائز ہے۔ مرقات میں ہے:

قد اثبت عند الحنفية ان الحديث يكون ناسخا للكتاب.

ترجمہ: حنفیہ کے نزدیک ثابت ہے کہ حدیث کتاب اللہ کی ناسخ ہوسکتی ہے۔

اور یہ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ ارشاد فرمایا:

كلامي ينسخ بعض بعضنا كنسخ القرآن.

میرا کلام بعض بعض کو منسوخ فرمادیتا ہے جیسے قرآن کو منسوخ کرتا ہے۔

امت کا عقیدہ:

حضور سید عالم ﷺ قانون ساز ہیں۔ اس بارے میں امت کا عقیدہ عہد صحابہ سے لے کر یہی رہا ہے کہ حضور سید عالم ﷺ قانون ساز ہیں، صرف قانون داں نہیں۔

(۱) سنن ابی داؤد ابن ماجہ و مسند امام طحاوی و معجم طبرانی و بیہقی وغیرہ میں حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

جعل رسول اللہ ﷺ للمسافر ثلاثا ولو مضیٰ السائل علی مسالتہ لجعلھا خمسا.

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کے لیے موزوں پر مسح کی مدت تین دن مقرر فرمائی۔ اگر مانگنے والا مانگے جاتا تو ضرور پانچ دن کر دیتے۔

(۲) بخاری میں زید بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

وجدتھا مع خزیمۃ الذی جعل رسول اللہ ﷺ شھادتہ وشھادتین.

ترجمہ: میں نے یہ آیت خزیمہ کے پاس پائی، جن کی شہادت رسول ﷺ نے دو گواہوں کے برابر فرمائی۔

(۳) حرم مدینہ کے سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

نھی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان یعضد شجرھا او یخبط او یوخذ طیرھا.

ترجمہ: نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ مدینے کے درخت کاٹے جائیں یا پتے جھاڑے جائیں یا چڑیا پکڑی جائے۔

ان کے علاوہ خود یہی حضرت ابو ہریرہ، انس بن مالک، سعد بن ابی وقاص، زید بن ثابت، ابو سعید خدری، عبدالرحمٰن بن عوف، صعب بن جثامہ، رافع بن خدیج، خبیب بن ہذلی، اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا:

حرم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ما بین لابتی المدینۃ و لابتیھا شجرھا ان یعضد او یخبط حرم صیدھا حرم البقیع باختلاف الالفاظ بعضھم بعضا.

ترجمہ: مدینہ کے دونوں پہاڑیوں کے مابین حرم بنایا۔ اس کے درخت کاٹنا یا پتے کا جھاڑنا حرام فرمایا، اس کا شکار حرام فرمایا بقیع کو حرم بنایا۔

یہ دس صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ارشادات ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ کو حرم بنایا اس کے درخت کاٹنا پتے جھاڑنا، اس کی چڑیا پکڑنا حرام فرمایا۔ حرام کرنے کی اسناد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف کرنی اس کی دلیل ہے کہ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس کا اختیار تھا کہ جس چیز کو چاہیں حلال فرمادیں، جسے چاہیں حرام فرمادیں۔ اسناد میں اصل حقیقی ہے جب تک کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو، جو یہاں منتفی ہے تو ثابت ہوگیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا عقیدہ یہی تھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قانون ساز ہیں۔

۴۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

نهانا رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم عن خاتم الذهب.

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا

۵۔ حضرت جیش بن اویس نخعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خدمت اقدس میں حاضر ہوکر ایک قصیدہ مدحیہ عرض کیا، جس میں ہے:

شرعت لنا دين الحنيفة بعد ما

عبدنا كامثال الحمير طواغيا

ہمارے لیے دین حنفیہ کی آپ نے تشریح فرمائی اس کے بعد کہ ہم گدھوں کی طرح بتوں کو پوجتے تھے۔

۶۔ امام قدوری فرماتے ہیں:

سن رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم الغسل للجمعة والعيدين والاحرام وعرفة.

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسنون فرمایا غسل جمعہ اور عیدین اور احرام اور عرفہ کے دن۔

سَنَّ کی اسناد حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف کرنی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قانون ساز ہیں۔

۷۔ امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ میزان الشریعۃ الکبریٰ میں فرماتے ہیں:

کان الحق تعالیٰ جعل له صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ان یشرع من قبل نفسه ما شاء .

اللہ عزوجل نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ اپنی طرف سے جو چاہیں مشروع فرمادیں۔

۸۔ امام احمد خطیب قسطلانی مواہب میں فرماتے ہیں:

من خصائصه صلی الله تعالیٰ علیه وسلم انه کان یخص من شاء من الاحکام.

سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خصائص میں سے یہ ہے کہ شریعت کے احکام میں جسے چاہیں جس حکم سے چاہیں مستثنیٰ فرمادیں۔

۹۔ علامہ زرقانی نے اس کی شرح میں اضافہ فرمایا:

من الاحکام وغیرها

احکام کی تخصیص نہیں جس چیز سے چاہیں جسے چاہیں خاص فرمادیں۔

۱۰۔ علامہ اجل سیوطی قدس سرہ نے خصائص کبریٰ میں اس مضمون کا ایک باب منعقد فرمایا:

باب اختصاصه صلی الله تعالیٰ علیه وسلم بانه یخص من شاء بما شاء من الاحکام.

اس کا بیان کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس منصب کے ساتھ خاص ہیں کہ جسے چاہیں جس حکم سے چاہیں خاص فرمادیں۔

۱۱۔ علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانی شرح مواہب میں فرماتے ہیں:

قد اشتهر اطلاقه علیه صلی الله تعالیٰ علیه وسلم لانه شرع الدین والاحکام.

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شارع کہنا مشہور ہے اس لیے کہ حضور نے دین اور

احکام کی تشریع فرمائی۔

۱۲۔قصیدۂ بردہ شریف میں ہے:

نبیـنـــا الآمـر الـنــاهـی فـلا احـد

ابــرَّ فـــی قـول لا مـنـــه ولا نـعـم

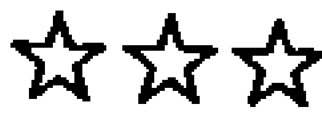
ہمارے نبی آمر اور ناہی ہیں۔"ہاں" اور "نہیں" کہنے میں ان سے زیادہ کوئی سچا نہیں۔

۱۳۔علامہ شہاب خفاجی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں:

معنی نبینا الآمر الخ انه لا حاکم سواه صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم فهو حاکم غیر محکـــوم.

نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آمر و ناہی ہونے کے معنی یہ ہیں حضور حاکم ہیں، حضور کے سوا عالم میں کوئی حاکم نہیں، وہ کسی کے محکوم نہیں۔

اور آج اس بارے میں امت کا کیا عقیدہ ہے یہ معلوم کرنا ہو تو ترجمان ملت مجدد وقت اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا رسالۂ مبارکہ **منبــه اللبیب** اور **الامـن و الـعـلـیٰ** کا مطالعہ کریں۔



اسلامی فکر کی تعمیر نو

جامعہ ملیہ دہلی میں ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو ایک سیمینار منعقد ہونے والا تھا۔ اس میں اسلامی فکر کی تعمیر نو کے عنوان پر ایک مقالہ پڑھا جانے والا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے وہاں سے یہ چند سوالات بھیجے تھے۔ باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے قلم برداشتہ جوجوابات ارسال کیے گئے ہیں، وہ ہدیہ ناظرین ہیں۔ اس امید پر کہ ہوسکتا ہے یہ مضمون اسلامی مفکرین کو بہت سی غلط فہمیوں سے بچالے۔ (فقیر امجدی)

(۱) کیا اسلام فکر کی اجازت دیتا ہے؟

(۲) اگر جواب اثبات میں ہے تو کوئی مثال دیجئے کہ اسلامی تاریخ کے ارتقائی کن مراحل پر فکر سرگرم عمل رہی۔ آزادی فکر کن حدود کی پابند رہی؟

(۳) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اسلامی فکر میں جمود آگیا ہے؟

(۴) اگر جمود آگیا ہے تو کب سے؟

(۵) جمود کے لیے کون سے مخصوص حالات ذمہ دار قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ ذمہ داری فکر کی ہے یا سماجی حالات کی۔

(۶) کیا اجتہاد کے دروازے کھولے جاسکتے ہیں، یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو بتایئے اجتہاد کا حق کس کو دیا جائے؟ اور اس کا نفاذ کس طرح کیا جائے؟

(۷) کیا موجودہ دور میں اسلامی فکر کے احیا کی ضرورت ہے؟

(۸) اگر جواب اثبات میں ہے تو بتایئے وہ کون سی سمتیں ہیں جن میں اسلامی فکر کی تعمیر نو اسلامی معیشت اور انسانیت کی ترقی کے لیے معاون ہوسکتی ہے؟

(۹) اسلامی فکر کی تعمیر نو کے سلسلے میں کون سے مسائل یا مشکلات حائل ہوسکتے ہیں۔ کیا انہیں دور کیا جاسکتا ہے؟

جوابات:

(۱) فکر مبہم لفظ ہے۔آپ کی مراد کیا ہے، واضح کریں۔عرف عام میں کسی الجھے ہوئے معاملہ کو سلجھانے کے لیے غور کرنے کو فکر کہتے ہیں۔منطقی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں: جو باتیں معلوم ہوں ان کو منضبط قواعد کے تحت اس طرح ترتیب دینا کہ ان کے ذریعہ وہ بات معلوم ہو جائے جو معلوم نہیں تھی۔

لیکن سوال ۲/ سے شبہہ ہوتا ہے کہ فکر سے آپ کی مراد اجتہاد ہے۔یہ ایک خالص شرعی لفظ ہے، اور مخصوص شرعی معنی کے لیے بولا جاتا ہے۔یعنی ایک شی کا حکم شرعی دوسری شی کے لیے ثابت کرنا۔اس بنا پر کہ اس حکم شرعی کی علت دوسری شی میں بھی پائی جاتی ہے۔ بشرطیکہ شی ثانی کا حکم منقول نہ ہو۔

فکر سے آپ کی مراد کچھ بھی ہو۔اس نمبر کا جواب اثبات میں ہے۔اسلام نے بڑی فراخ دلی سے فکر کی اجازت ہی نہیں، حکم دیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَار ۝ (الحشر: پ۲۸-ع۴-آیت۲)

ترجمہ: اے بصیرت والو! غور کرو۔

فاعتبروا، اعتبار مصدر کا امر ہے۔اعتبار کے دو معنی ہیں۔عبرت حاصل کرنا، غور کرنا۔الفاظ قرآنیہ کے اگر چند معانی ہوں اور وہ آپس میں مزاحم نہ ہوں تو دونوں معتبر ہیں۔ یہاں دونوں معانی مراد ہیں۔عبرت حاصل کرو، اور غور و فکر کرو۔ترمذی، ابوداؤد، اور دارمی کی یہ حدیث اس پر نص صریح ہے۔حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کے لیے قاضی مقرر فرمایا تو ان سے دریافت کیا:

معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟

عرض کیا: کتاب اللہ سے۔

فرمایا: اگر اس میں نہ ملے تو؟

عرض کیا: پھر رسول اللہ کی سنت سے۔

فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟

عرض کیا: غور و خوض کرکے اپنی رائے سے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله لما یرضیٰ به رسول الله

ترجمہ: اس اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے فرستادہ کو اس بات کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔

صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں دوسری حدیث حضرت عبد اللہ بن عمرو، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یوں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حاکم خوب غور کرکے فیصلہ کرے، اور صحیح کرے تو اسے دونا ثواب ہے اور اگر چوک جائے تو ایک ثواب کا مستحق ہے"

۲۔ اسلامی فکر کی ایک نہیں سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ عہد رسالت میں جو باتیں باہمی غور و خوض سے طے ہوتیں ان سے چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم متفق ہوتے تھے۔ اس لیے وہ بہ فحوائے: "مَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" وحی ہے۔ اس لیے اس کو جانے دیجئے۔ عہد رسالت کے بعد کی مثال لیجیے:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ کتنا اہم تھا۔ اسلام کی ترقی و تنزلی، بقا و فنا کا مدار یہ مسئلہ تھا۔ اس وقت پوری دنیا کا مزاج شاہنشاہی تھا۔ مرنے والے حکمراں کے بعد اس کے عصبات رشتہ دار، الاقرب فالاقرب کی ترتیب سے جانشیں ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانشینی کے سلسلہ میں ایک رجحان یہ بھی پیدا ہوا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی بنا پر اس کے خواہش مند بھی ہوئے مگر کامل بحث و تمحیص، مکمل غور و خوض کے بعد جملہ صحابہ کرام نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جانشین منتخب کیا۔ خلافت راشدہ کی تیس سالہ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اس سے موزوں تر کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔

صدیوں سے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے قانون کے خلاف ایک نئی راہ نکالنا اسی کا ثمرہ تھا کہ اسلام نے اپنے پرستاروں کو مکمل آزادی فکر کی اجازت دی ہے۔ یہ دوسری بات

ہے کہ اسلامی فکر بہر حال! قرآن وحدیث کی پابند ہے۔ جس کی بنیاد یہ ہے کہ اسلامی فکر کی جولانگاہ وہ ہے جہاں کتاب وسنت سے کوئی حکم منقول نہ ہو۔ جس پر دلیل قاطع اوپر گزری ہوئی حدیث معاذ ہے۔ یہ دروازہ بند نہیں ہوا۔ خلافت راشدہ کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

عہد صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا۔ قرآن مجید گھر گھر پہنچا۔ احادیث کا سلسلۂ اشاعت پورے بلادِ اسلامیہ میں پھیل گیا۔ قرآن مجید میں ناسخ بھی ہے، منسوخ بھی، عام بھی ہے، خاص بھی۔ مطلق بھی ہے، مقید بھی، ظاہر البیان بھی ہے، خفی البیان بھی، یہی حال احادیث کا ہے۔ علاوہ ازیں احادیث میں صحیح بھی تھیں اور سقیم بھی، بلکہ نا خدا ترسوں کی من گھڑت تراشیدہ خرافات بھی بنام احادیث عوام تو عوام کتنے خواص کی زبانوں پر جاری اور صحائف میں مسطور تھیں۔ اب تک کا مزاج یہ تھا کہ کسی معاملہ میں اتنا کہہ دینا کافی تھا: قال رسول اللہ کذا، فعل رسول اللہ کذا وغیرہ وغیرہ مگر اب اس میں دشواریاں بھی تھیں، اور خطرے بھی۔ اب اہل حل وعقد علما نے ایک نیا راستہ اپنی صواب دید سے نکالا۔

مقتدایان اسلام دو گروہ میں منقسم ہوگئے۔

ایک تو احادیث کریمہ کی حفاظت وصیانت، نشر واشاعت، نقد وجرح میں مصروف ہوگیا، یہ محدثین کہلائے۔

دوسرا گروہ ان احکام کی تدوین وترتیب میں مشغول ہوگیا، جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہوئے، یہ فقہا ومجتہدین کہلائے۔

اگر اس وقت ملت کے ذمہ داروں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو یہ یقین کرلیں کہ اسلام کا بھی وہی حال ہوتا جو یہودیت اور نصرانیت کا ہوا۔ جو کچھ ہوا علما نے اپنی صواب دید سے کیا۔ مگر ہوا کتاب وسنت کی روشنی میں، ان کی مقرر کی ہوئی حدود میں۔ اس لیے اس نکتے سے کبھی غفلت نہیں کی جاسکتی کہ اسلامی فکر کی آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قرآن وسنت سے بھی آزاد ہے۔

(۳) اسلامی فکر سے مراد، اگر اجتہاد ہے تو بلا شبہہ اس میں جمود ہے۔ اور عرفی ومنطقی فکر مراد ہے تو اس میں نہ اب جمود ہے، اور نہ رہ سکتا ہے۔

(۴) اجتہاد میں کب سے، جمود ہے اس کی صحیح تاریخ بتانا مشکل ہے۔ اندازہ ہے کہ تیسری صدی کے بعد کوئی مجتہد نہیں پیدا ہوا۔

(۵) اجتہاد کے بند ہونے کے اسباب نہیں صرف ایک سبب ہے۔ یعنی صرف مجتہدین کا فقدان ہے۔ اور یہ اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے کہ شرائط اجتہاد معلوم ہوں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

الف: کتاب اللہ کے اس حصے کا عالم ہونا جس کا تعلق احکام سے ہے، کتاب اللہ کے عالم ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے الفاظ و تراکیب کے اپنے شرعی، عرفی معنی بخوبی جانتا ہو۔

ب: اسی تفصیل کے ساتھ احادیث کریمہ کا بھی عالم ہو، مزید یہ کہ احادیث صحیحہ وغیرہ صحیحہ، ضعاف، حسان میں تمیز کی صلاحیت رکھتا ہو۔ نیز احادیث سے متعلق جملہ علوم پر مکمل حاوی ہو۔

ج: قیاس کے طریقے جانتا ہو نہ صرف جانتا ہو بلکہ اس کا ملکہ تامہ رکھتا ہو۔ قیاس صحیح و فاسد میں امتیاز کی پوری مہارت رکھتا ہو۔

د: مسلمان صحیح العقیدہ ہو۔

ہ: تقویٰ، خداترسی، دیانت میں اعلیٰ درجہ پر فائز ہو۔

و: اعلیٰ درجہ کا ذہین، طباع، نکتہ رس ہو۔

یہ کہنے کے لیے چھ شرطیں ہیں، لیکن اگر ان کی تفصیل کی جائے تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائے۔ اندازے کے لیے ایک جھلک دیکھ لیں۔

قرآن و حدیث کے معنی لغویہ و عرفیہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ عہد رسالت میں ان الفاظ و تراکیب کے کیا معانی تھے، اس کو کماحقہ جانے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد میں اہل حجاز خصوصا قریش کے کلام کا پورا ذخیرہ اسی کی معلومات کے احاطے میں ہو، اور آج یہ ممکن نہیں۔ آج قریش اور اہل حجاز کے کلام کا جو سرمایہ موجود ہے، وہ چند اشعار اور گنتی کے مقولوں کے سوا کچھ نہیں۔ یہ شرط ضروری ہے یا نہیں اس کا اندازہ اس واقعے سے کیجیے۔

قرآن کریم میں ایک جگہ "لن یحور" ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آج ہی کے نہیں اپنے دور کے بھی سید المفسرین ہیں۔فرماتے ہیں: میں اس کا معنی نہیں جانتا تھا۔ایک دفعہ ایک بدویہ کو سنا اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی: حوری یعنی لوٹ، تو میں نے جانا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔

حضرت ابن عباس حجازی قریشی ہیں۔علم وفضل، ذہانت وذکاوت میں اپنے اقران ہی نہیں، بہت سے اسلاف پر بھی فائق ہیں۔مگر وہ قرآن کریم کے معنی جانتے نہیں۔ان لوگوں کے دست نگر ہیں جن کی لغت میں قرآن اترا ہے۔تو آج کے ماوشما، زید وعمرو کیسے مستغنی ہو سکتے ہیں۔

معانی لغویہ جاننے کے بعد کیا کیا دشواریاں ہیں، ان کا بھی ایک منظر ملاحظہ کریں:

قرآن مجید نے طلاق کی عدت تین قروء بتائی ہے، ارشاد ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ.(بقرہ: پ ۲. ع ۱۲. آیت ۲۲۸)

ترجمہ: طلاق والیاں اپنے کو تین قروء روکے رکھیں۔

قروء قرء کی جمع ہے۔قرء کے دو متضاد معانی ہیں۔حیض اور طہر۔امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہاں طہر مراد ہے۔اور امام اعظم فرماتے ہیں: حیض مراد ہے۔دونوں اپنی اپنی تاویل پر جو قرائن پیش کرتے ہیں وہ اتنے ٹھوس اور مضبوط ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، اتنی نکتہ رسی اس زمانے میں محال عقلی نہیں تو محال عادی کے قریب ضرور ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا.(بقرہ : پ۳. ع ۶. آیت ۲۷۵)

ترجمہ: اللہ نے بیع حلال فرمائی اور سود حرام۔

ربوا کا ترجمہ سود ہے، اس کے لغوی معنی نفع کے ہیں، اور یہ قطعاً مراد نہیں ورنہ بیع بھی حرام ہوتی۔لامحالہ! متعین ہے کہ ربوا کا شرعی معنی مراد ہے۔شرعی معانی کیا ہیں؟ یہ وہ اہم سوال ہے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور ربوا کے ابواب کو شافی طور سے بیان

نہیں فرمایا۔

سود کے معنی کے تعین میں مجتہدین کو کتنی کدو کاوش کرنی پڑی ہے، وہ وہی جان سکتا ہے جو شروح حدیث، اصول فقہ، فقہ کی کتابو میں اس باب کا مطالعہ کرے۔ سود کے بارے میں وارد تمام احادیث کا استقصا، ان سب کو سامنے رکھ کر اس جامع علت کا معلوم کر لینا جو سود کی حرمت کا مدار ہے، جس کی رو سے، سود سے دیگر بیوع سے ممتاز ہوتا ہے۔ پھر اس سے متعلق جزئیات کی تفصیل، یہ وہ ہفت خواں ہے کہ اگر مجتہدین نے ان سب کو طے نہ کرایا ہوتا تو آج سود اور بیع میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ قوت فیصلہ جواب دے جاتی۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بعض الفاظ قرآنیہ کے بارے میں طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس سے مراد لغوی معنی ہیں یا شرعی۔ جیسے یہ آیات کریمہ ہے:

انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر و ما اهل به لغیر الله فمن اضطر غیر باغ و لاعاد فلا اثم علیه:(بقرہ: پ ۲ . ع ۵ . آیت ۱۷۳)

ترجمہ: یہی چیزیں تم پر اللہ نے حرام کی ہیں۔ مردار، خون، سور کا گوشت، اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو جو لاچار ہو اور بغیر خواہش کے ضرورت سے زیادہ نہ کھائے، اس پر کوئی گناہ نہیں۔

یہاں باغی کے بارے میں سخت معرکہ ہے کہ اس کے لغوی معنی مراد ہیں یا شرعی۔ باغی کے لغوی معنی خواہش کرنے والے کے ہیں۔ باغی کے شرعی معنی امام و سلطان عادل کی طاعت سے باہر ہونے والا۔ شوافع کہتے ہیں کہ باغی سے یہاں اس کا شرعی معنی مراد ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ اس کا لغوی معنی مراد ہے۔ ہر ایک کے الگ الگ دلائل ہیں۔ ان دلائل تک از خود آج کے بڑے سے بڑے عالم کی رسائی نہیں ہو سکتی ہے، کم از کم یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

اس کے قریب قریب ''عادی'' بھی معرکہ ہے۔ اگر مجتہدین نے ان گتھیوں کو سلجھا نہ لیا ہوتا تو آج کیا ہوتا، نہیں کہا جا سکتا۔

پھر آج دیانت کا معاملہ بہت اہم ہے۔ جب کہ بندگان غرض نے لاکھوں حدیثیں

گڑھ لیں۔علما کی کتابوں میں الحاقات کر دیے۔حتیٰ کہ قرآن کریم میں تبدیل وترمیم کرنے سے نہیں چوکے تو قرآن واحادیث کے معانی بیان کرنے میں کیا کیا گل کھلاتے وہ ظاہر ہے۔پھر بھی جو گل کھلائے جارہے ہیں وہ کم عبرت آموز نہیں۔

ابھی جو میں نے آیت کریمہ لکھی ہے۔اس میں یہ ہے کہ سور کا گوشت حرام ہے۔ایک صاحب نے تحقیق کی کہ سور کی چربی حلال ہے۔صرف گوشت حرام ہے۔قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں۔ایک صاحب نے فتویٰ دیا کہ دادی اور نانی سے نکاح حلال ہے۔

ابھی چند دن کی بات ہے کہ ایک بزرگ جنہیں لوگ نعمان زماں،جنید عصر کہتے تھے۔ان کی یہ کرامت مع دستاویز موجود ہے۔ایک حدیث لوگوں کی زبان پر تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بخدا!میں نہیں جانتا،اس دیوار کے پیچھے کیا ہے۔

اس کے بارے میں حضرت محقق عبدالحق محدث دہلوی قدق سرہ نے مدارج النبوۃ جلد اول میں فرمایا ہے۔

ایں سخن اصلے ندارد و روایت بداں صحیح نہ شدہ است۔

ترجمہ:اس کی کوئی اصل نہیں،یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

ان بزرگ نے اپنے عقیدے کے اثبات میں لکھ دیا:

شیخ عبدالحق روایت کرتے ہیں کہ مجھے دیوار کے پیچھے کا علم نہیں۔

انہیں بزرگ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک سوال کے جواب میں زید کو کافر لکھ دیا ہے، مگر جب پتہ چلا کہ یہ زید ان کے بزرگ ہیں تو گول ہو گئے۔

ابھی چند دن کی بات ہے کہ ایک بہت مشہور درسگاہ کے مفتی نے زید پر اس کی ایک عبارت سے متعلق بہت بھیانک فتویٰ دیا۔یہ زید کفری عبارت لکھنے والا اس درس گاہ کا افسر اعلیٰ تھا۔جب بات ظاہر ہوئی اور افسر اعلیٰ نے مفتی صاحب سے مواخذہ کیا تو فتویٰ تو بدل ہی گیا،معذرت بھی کرنی پڑی کہ میں نہیں جانتا تھا،یہ عبارت آپ کی ہے۔اور آپ ہی وہ زید

ہیں۔ جب ان لوگوں کی دیانت کا یہ حال ہے جو اس دور میں مذاہب کے ٹھیکے دار جانے جاتے ہیں تو اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اس زمانہ میں کوئی شخص ان تمام علوم کا جامع بھی پیدا ہو جائے جو اجتہاد کے لیے لازم ہیں، تو کیا مذکورہ صورت حال میں اس کی دیانت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ کسی کو حیرت ہو تو ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ جس عالم میں جتنی ہی زیادہ دین داری، خدا ترسی ہوگی وہ اتنا ہی تقلید میں راسخ ہوگا اور اجتہاد سے بچے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ مگر اجتہاد کے لیے جن شرائط کی ضرورت ہے وہ صدیوں سے کسی شخص میں پائی نہیں گئیں۔ اور نہ اس دور میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے صدیوں سے مجتہد کوئی نہیں ہوا اور نہ آج ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ بالفرض اگر کوئی ہستی شرائط اجتہاد کی جامع پیدا ہو جائے تو کیا اسے بھی اجتہاد کی اجازت نہ ہوگی۔

جواب ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ اسے اجتہاد کی اجازت ہے۔ یہی نہیں اسے تقلید جائز نہ ہوگی۔ مگر کام فرض سے نہیں چلتا، وقوع سے چلتا ہے اور وقوع کا مسئلہ لاینحل ہے اگر کوئی ادعا کرے یا کسی کے بارے میں دوسرا کوئی دعویٰ کرے تو اس وقت انگلی پکڑ کے بتا دیا جائے گا کہ دیکھئے ان میں یہ کمی ہے، یہ کمی ہے۔

آج کل کچھ لوگوں کو اس کا خبط ہوا ہے کہ میں مجتہد ہوں یا ہمارا فلاں بزرگ مجتہد ہے لیکن جب ان لوگوں کے اجتہادی مسائل سامنے آئے تو پتا چلا ہے کہ اجتہاد کی منزل تو بہت دور ہے، یہ لوگ مترجم ہونے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔

لطیفے کے طور پر ایک اجتہاد کا نظارہ کر لیں۔

ان مجتہدین نے دعویٰ کیا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ اگر پانی میں نجاست گر جائے تو جب تک نجاست سے پانی کا رنگ یا مزہ یا بو نہ بدلے پانی پاک ہے۔ اب ایک متفق علیہ مسئلہ ہے جو ان مجتہدین زمانہ کو بھی تسلیم ہے۔ اگر کتا کسی برتن میں منھ ڈال دے۔ تو برتن ناپاک ہے۔ فرض کیجئے، ایک برتن میں پانی ہے اس میں کتے نے منھ ڈال دیا ہے، منھ ڈالتے ہی کسی کی دھتکار پر کتا بھاگ گیا۔ تجربہ کر لیں، اس برتن کے پانی کا نہ رنگ بدلے گا نہ مزہ

بدلے گا نہ بو۔ مذکورہ بالا اجتہاد کی رو سے پانی پاک رہا، مگر برتن ناپاک۔ اس قسم کے بے شمار لطائف ان مجتہدین کے ہیں۔ کون سا مسلمان یہ پسند کرے گا کہ اجتہاد کی آزادی دے کر اسلامی احکام کو لطائف وظرائف کا ایسا میگزین بنا دیا جائے کہ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے جانشینوں کو اپنی طرز نگارش کے لیے احکام ہی بہترین مواد ہوں، وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر صدیوں سے پوری امت کا اس پر اجماع ہے کہ اب اجتہاد کی کسی کو اجازت نہیں۔ سب پر، ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید لازم ہے۔

(۶) نہیں۔

(۷) اجتہاد کے سوا عرفی، منطقی فکر کے احیا کی ضرورت شدید ہی نہیں اشد ہے۔

(۸) مندرجہ ذیل امور ہماری فکر نو کی حدود سے باہر ہیں۔

الف: جو باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں۔

ب: جو باتیں احادیث سے ثابت ہیں۔

ج: جو باتیں اجماع امت سے ثابت ہیں۔

د: جو باتیں ائمہ اربعہ امام اعظم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل یا ان کے جانشینوں کے ارشادات سے ثابت ہیں۔

ان کو چھوڑ کر ہزاروں مسائل ہیں جن پر غور کرنا ہے، جنہیں حل کرنا ہے۔ سیاسیات، اقتصادیات، معاشیات وغیرہ متعدد راہیں ہیں، جو ہماری فکر نو کی منتظر ہیں۔

(۹) بہت لمبی داستان ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس راہ میں آپس میں اختلاف، اپنی خود غرضی، کچھ سستی، کچھ کاہلی، کچھ نا اہلی، کچھ اسباب کی عدم فراہمی، کچھ اغیار کا دباؤ وہ اسباب ہیں جو رکاوٹ ہیں۔ اگر ہمت کر کے آگے بڑھا جائے تو ضرور کچھ دشوار گزار مرحلے در پیش ہوں گے۔ لیکن ان کا دور کرنا محال نہیں ہوگا۔ اگر چہ سخت مشکل، مگر۔ ع:

مشکلے نیست کی آساں نہ شود



تقلید شخصی کی شرعی حیثیت

تقلید کا مادہ قلادہ ہے۔قلادہ کے معنی پٹے کے ہیں۔باب تفعیل میں جا کر اس کے معنی گلے میں پٹہ ڈالنے کے ہوگئے۔اصطلاح شرع میں تقلید کے معنی علما نے یہ لکھے:

تسلیم قول الغیر بلا دلیل.

ترجمہ: دوسرے کی بات بلا دلیل مان لینا۔

اسی کو علامہ سمہودی نے عقد الفرید میں یوں بیان فرمایا:

التقلید قبول القول بان یعتقد من غیر معرفة دلیل.

ترجمہ: کسی کی بات دلیل جانے بغیر اس طرح مان لینا کہ اس پر اعتقاد جم جائے۔

اگر دلیل کے ذریعہ کسی بات کے حق ہونے کا اعتقاد ہو تو یہ تقلید نہیں بلا دلیل محض قائل کے ساتھ حسن ظن کی بنا پر اس کی کہی ہوئی بات پر اعتقاد جم جائے کہ چوں کہ یہ شخص اعلیٰ درجے کا دین دار، صادق، امین اور علوم وفنون کا ماہر فائق ہے۔اس لیے جو بات کہتا ہے وہ حق ہے، یہی تقلید ہے۔

معمولات شرعیہ سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم روزمرہ کے حالات اور اپنی طرز زندگی پر نظر کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں تقلید کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔اس میں عوام وخواص شہری، دیہاتی ہر طبقہ کے لوگ مساوی حصہ دار ہیں۔

آپ غور کریں۔ایک بچہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے ماں باپ، اپنے مربی کی تقلید کے سہارے پروان چڑھتا ہے۔ایک بیمار اپنے معالج کی تقلید ہی کر کے شفایاب ہوتا ہے۔ایک مستغیث کسی قانون داں وکیل کی تقلید کر کے ہی اپنا حق پاتا ہے۔راستے سے نابلد ایک راہ رو کسی راستہ بتانے والے کی تقلید کر کے ہی منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ایک ناخواندہ اپنے معلم

کی تقلید ہی سے صاحب علم وفضل بنتا ہے۔ صنعت وحرفت سے عاری کسی ماہر فن استاذ کی تقلید کر کے ہی صنعت کار ہوتا ہے۔ یہ وہ روزہ مرہ کی باتیں ہیں کہ ان سے نہ تو انکار کی کوئی گنجائش ہے اور نہ بحث وتمحیص کی۔ ایک بنگالی کا بچہ اپنے ماں باپ کو دیکھتا ہے کہ وہ مچھلی بھات کھاتے ہیں تو وہ کوئی دلیل طلب کیے بغیر خود بھی مچھلی بھات کھانے لگتا ہے۔ دھوتی باندھنے لگتا ہے، بنگالی بولی سنتا ہے، تو خود بھی بنگالی بولنے لگتا ہے۔ یوں ہی پنجابی کا بچہ اپنے والدین کی عادت وخصلت دیکھ کر روٹی گوشت کھانے لگتا ہے۔ شلوار قمیص پہننے لگتا ہے۔ پگڑی باندھنے لگتا ہے۔ پنجابی بولنے لگتا ہے۔ یہی تقلید ہے۔

مکتب میں ایک بچہ گیا، معلم نے بچے کو ایک حرف پر انگلی رکھ کر بتایا کہ یہ ''الف'' ہے، بچے نے بلا دلیل مان لیا کہ یہ الف ہے۔ دوسرے حرف پر انگلی رکھ کر معلم نے بچے سے کہا: ''با'' بچے نے بلا بحث وتمحیص اسے مان لیا کہ یہ ''با'' ہے۔ کبھی کسی بچہ نے اپنے استاذ سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ کیوں پہلے والے حرف کو ''الف'' کہتے ہیں اور دوسرے کو ''با''۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر بچہ اس وقت کیوں اور کیوں کر کے چکر میں پھنسا تو اصل تعلیم سے بھی محروم رہ جائے گا۔

ایک مستغیث وکیل کے یہاں جاتا ہے، اپنا مدعا بیان کرتا ہے، وکیل اسے مشورہ دیتا ہے کہ وہ تعزیرات ہند کی فلاں دفعہ کے ماتحت دعویٰ کرے۔ مستغیث بلا چوں وچرا وہی کرتا ہے، اسی کا نام تقلید ہے۔

ایک مریض، معالج کے یہاں گیا، اس نے مرض کی تحقیق کر کے اس کے لیے ایک نسخہ لکھا۔ دنیا کا کوئی مریض، حکیم ڈاکٹر سے یہ بحث نہیں کرتا کہ میری بیماری کا نسخہ یہی کیوں ہے۔ یہ دوائیں کس طرح میرا مرض دور کریں گی، جو مریض اس بحث میں پڑا وہ اچھا ہو چکا؟

آپ ایک مسافت طے کر رہے ہیں۔ ایک چوراہے پر پہنچ کر حیرت زدہ ہو کر کھڑے ہو گئے کہ اب دائیں جائیں کہ بائیں یا سیدھے، آگے چلے چلیں۔ اچانک کوئی مقامی آدمی آ گیا۔ آپ اس سے سوال کرتے ہیں کہ فلاں جگہ کون سا راستہ جائے گا؟ وہ جدھر بتاتا ہے، آپ اس کی کورانہ تقلید کرتے ہوئے بلا دلیل اسی راستے پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔

اب آپ حضرات غور کریں ! اگر ہم تقلید کو اپنے تمدن سے نکال دیں، تو ہماری معیشت کی گاڑی ایک انچ آگے نہیں چل سکے گی ۔ ہم اپنی زندگی کے گوشہ گوشہ میں تقلید کے محتاج ہیں۔ اور یہ احتیاج قوم کے ہر فرد کو عام ہے ۔ جس طرح ایک جاہل بیماری میں ڈاکٹر کا، قانونی ضرورت میں وکیل کا، راستہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں رہنما کی تقلید کا محتاج ہے، اسی طرح ایک عالم بھی اور جس طرح ایک دیہاتی خورد ونوش، بول چال، تعلیم وتربیت میں اپنے ماں باپ، استاذ کا مقلد ہے، اسی طرح ایک شہری بھی ۔

اب اگر تقلید کو ہم اپنے تمدن سے نکال دیں تو ہماری زندگی مفلوج ہو کر رہ جائے گی ۔ غور کریں! اگر بیمار، معالج کے نسخہ کو استعمال کرنے سے پہلے نسخہ کے رموز سمجھنے کے لیے بحث شروع کر دے ۔ شرح اسباب وعلامات قرابادین ومعالجات نفیسی کے اسباق پڑھنے لگے تو وہ اچھا تو کیا ہوگا، البتہ جلد ہی دوسرے عالم کا سفر کر دے گا ۔ یوں ہی ایک مستغیث وکیل سے قانون کی لم سمجھے بغیر دعویٰ نہ کرے تو اس کا حق مل چکا ۔ جب تک وہ ایل ایل بی کے نصاب پڑھنے کے لائق ہوگا ۔ دعویٰ کی میعاد بھی ختم ہو جائے گی ۔ اسی لیے ہر متمدن انسان کا اس پر اجماع ہے کہ جس فن کا انسان ماہر نہ ہو ۔ اس میں کسی ماہر فن کی تقلید کرے ۔ اسی لیے ہر فرد بشر کسی نہ کسی دوسرے فرد بشر کی کسی نہ کسی معاملہ میں تقلید کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ تقلید ہماری زندگی کا جز ولاینفک ہے اور بغیر تقلید کے زندگی بسر کرنا ناممکن ہے، جس طرح ہم اپنی زندگی کے معمولات میں تقلید سے مستغنی نہیں ہو سکتے ۔ اسی طرح دینی معاملات میں بھی تقلید سے مفر نہیں ۔ اس لیے امت کا اس پر اجماع ہے کہ تقلید فرض ہے ۔ اس کی فرضیت اور وجوب ایسا قطعی ہے کہ منکرین تقلید کے پیشوائے اعظم، میاں نذیر حسین صاحب کو بھی معیار میں یہ لکھنا پڑا ۔

سو جو کوئی اہل ایسے ذکر کا ہوگا عموماً خواہ کوئی ہو اس کا اتباع وقت لاعلمی واجب ہوگا ۔

اس لیے کسی بھی دیندار یا مدعی دین داری کی یہ ہمت نہیں کہ وہ تقلید کی فرضیت سے انکار کر سکے معاملہ یہ ہے کہ اگر تقلید کو فرض قرار نہ دیں تو پھر دین پر عمل متعذر اور شدید متعذر ہو جائے گا ۔

اس کا بیان یہ ہے کہ ہم کو اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے ۔ اور اتباع واطاعت موقوف ہے ۔قرآن واحادیث کے حصول پر نہ صرف حصول بلکہ یہ بھی جاننے پر کہ ان میں کون ناسخ ہے،کون منسوخ ہے۔کون خاص ہے،کون عام ہے ۔کون ظاہر کون خفی،کون نص ہے،کون مشکل،کون مفسر ہے،کون مجمل،کون محکم ہے،کون متشابہ وغیرہ وغیرہ سیکڑوں باتیں ایسی ہیں کہ جب تک انسان ان سب پر کامل عبور حاصل کر کے قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط واستخراج پر کامل دست گاہ نہ رکھے ۔قرآن وحدیث پر عمل ناممکن ہے۔چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

سورۂ بقرہ کے تیسویں رکوع میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۝ (سورۂ بقرہ پ۲-رکوع۱۴-آیت ۲۳۴)

ترجمہ: اور تم میں جو مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں تو یہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رہیں۔

اس کے بعد اسی سورہ کے اکتیسویں رکوع میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۝ (سورۂ بقرہ پ۲-رکوع۱۵آیت۲٤۰)

ترجمہ: اور تم میں جو مریں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو ان کے لئے وصیت کر جائیں کہ ان کو سال بھر کا نان ونفقہ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالا جائے۔

ایک ہی سورۃ ایک ہی پارہ میں ایک ہی مسئلہ کے بارے میں دو مختلف احکام ایسے مذکور ہیں کہ ان دونوں کو پڑھ کر آدمی چکرا جائے کہ وہ عمل کس پر کرے۔پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ کی عدت چار مہینے دس دن ہے،اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ کی عدت ایک سال ہے۔عربی زبان کا ماہر سے ماہر پروفیسر،عربی زبان پر کتنا ہی عبور رکھتا ہو۔کس آیت پر عمل کرنا چاہیے،بتا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔اور آگے بڑھیے،ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بیوہ خواہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ اس کی عدت چار مہینے دس دن، یا ایک سال

ہے۔ مگر سورۂ طلاق میں حاملہ عورتوں کی عدت کے بارے میں فرمایا گیا:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۝ (سورۂ طلاق پ ۲۸۔ رکوع ۱۷)

اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل جن لیں۔۔

ایک نقطہ پر آ کر سورۂ بقرہ اور سورہ طلاق کی آیتوں میں شدید تعارض ہے۔ ایک شخص مرا، اس کی بیوی حاملہ ہے، تو اس کی عدت کیا ہوگی۔ چار مہینے دس دن یا ایک سال یا وضع حمل ۔اور سنتے چلیے، اسی سورۂ بقرہ کے بائیسویں رکوع میں ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (سورۂ بقرہ پ ۲۔ رکوع ۶ آیت ۱۸)

ترجمہ: تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے، اگر وہ کچھ مال چھوڑے تو وہ ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کے لیے وصیت کرے، پرہیزگاروں پر واجب ہے۔

لفظ اقربین عام ہے، اولاد بھائی، بہن، دادا دادی وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ شریعت نے کسی کا کوئی حصہ مقرر نہیں فرمایا ہے۔ یہ مورث کے صواب دید پر ہے، جس کے لیے جتنا چاہے وصیت کر جائے، اس کی وصیت کے مطابق رشتہ داروں حتی کہ ماں باپ کو بھی حصہ ملے گا، مگر سورۂ نساء کا دوسرا رکوع تلاوت کریں۔

اس میں ماں، باپ، میاں، بیوی، بیٹی، بیٹا، پوتی، پوتا وغیرہ کے شرعی سہام کی تعیین تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ عربی زبان کا کوئی کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، محض زبان دانی سے وہ اس گتھی کو ہرگز ہرگز نہیں سلجھا سکتا۔

یہ چند مثالیں میں نے قرآن مجید سے تقریب فہم کے لیے پیش کر دی ہیں۔ اگر استقصا کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ احادیث میں اس قسم کے اشکالات کی کوئی گنتی نہیں۔ اب اگر تقلید کو درمیان سے نکال دیا جائے تو فرض عین کہ ہر مسلمان ان تمام تفصیلات کو جانے جن سے اس قسم کے اشکالات حل ہو سکیں۔ اب اگر ہر مسلمان کو ان تمام تفصیلات کے جاننے کا مکلف کیا جائے تو۔

اولا: یہ ممکن نہیں کہ ہر شخص ان تمام علوم کو حاصل کر سکے جو مجتہدین کے لیے ضروری ولازم ہیں۔

ثانیاً: اگر بالفرض یہ تمام علوم حاصل بھی ہوجائیں تو تفقہ فی الدین جو خالص خدا داداور وہبی صلاحیت ہے، سب کو بلکہ اکثر کو کہاں نصیب؟

حضرت امام بخاری جیسے امام فن وماہر حدیث نے اسی وہبی فضل خداوندی، تفقہ فی الدین کی کمی کی وجہ سے ایسے عجیب وغریب فتوے دیئے کہ حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً مشہور ہے کہ امام بخاری نے یہ فتویٰ دیا کہ اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی کسی بکری کا دودھ مدت رضاعت میں پی لیں تو حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی۔

بخاری کو اٹھا کر دیکھئے! آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔ ایک جگہ ہے کہ پانی میں نجاست پڑنے سے اس وقت تک ناپاک نہیں ہوگا جب تک پانی کے تین اوصاف میں سے ایک وصف رنگ یا بو یا مزہ نہ بدل جائے۔

دوسری جگہ ہے کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو برتن ناپاک ہے۔ ایسا کہ اسے سات مرتبہ دھوؤ۔

اب آپ غور کریں! ایک برتن میں پانی ہے، اس میں کتے نے منھ ڈال دیا۔ پانی کا نہ رنگ بدلا، نہ بو، نہ مزہ۔ تو لازم کہ پانی پاک رہے اور برتن بہر حال ناپاک۔

امام بخاری کے حفظ واتقان، تقویٰ پرہیزگاری روایت حدیث میں احتیاط کے کمال سے انکار نہیں، مگر تفقہ فی الدین ایک الگ نعمت ہے، جو ہر حافظ کو نہیں ملتی۔ اسی لیے تو ایک جلیل القدر محدث نے فرمایا: **الا حادیث مضلة الا للفقهاء .**

اور حضرت امام اعمش قدس سرہ نے بڑی صفائی اور دیانت داری کے ساتھ حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تفقہ فی الدین کا اعتراف کرتے ہوئے خود حضرت امام صاحب سے فرمایا: " **نحن الصيادلة وانتم الاطباء** " ہم دوافروش ہیں اور تم لوگ طبیب ہو۔

ثالثاً: چلیے تفقہ فی الدین بھی حاصل ہوگیا، اور وہ تمام علوم وفنون جو لوازم اجتہاد ہیں، حاصل ہوجائیں تو دین داری اور للّٰہیت کا آج کتنا فقدان ہے۔ اسے کون نہیں جانتا۔ حال

یہ ہے کہ بہت سے حنیفہ دوراں اور نعمان زماں بننے والے جوش عداوت ووفور محبت وافراط عقیدت کی بنیاد پر اپنے نوک قلم سے کیا کیا گل کھلائے، اس کی تھوڑی سی سیر کرتے چلیں۔

(۱) سارے دیوبندیوں اور غیر مقلدین نے اسماعیل کی ''ایضاح الحق'' کی ایک عبارت پر اسے کافر گمراہ ہونے کا فتویٰ دیا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے طائفہ کے امام کی عبارت ہے تو سب کو سانپ سونگھ گیا۔

(۲) ابھی چند دن کی بات ہے کہ مفتی دیوبندی مولوی مہدی حسن نے جناب قاری طیب صاحب کی ایک عبارت پر فتویٰ دیا کہ اس میں الحاد ہے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے آقا کی عبارت ہے تو فتویٰ بدل گیا۔

(۳) قاسم نانوتوی صاحب کے اسی شعر:

جو چھو بھی دے سگ کوچہ ترا جو اس کی نعش
یقیں ہے خلد میں ابلیس کا بنائیں مزار

پر پوری برادری نے وہ وہ فتوے دیئے کہ مزہ آ گیا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ ہمارے پیر مغاں کا شعر ہے تو تاویل کے نام پر شاہنامہ کے ہفت خواں کا باب کھول دیا گیا۔

(۴) گنگوہی کو بکرے کے خصیے بہت پسند تھے اور ان کو بہت مفید بھی ہوئے۔ اس لیے فتویٰ دے رکھا تھا کہ یہ حلال ہیں۔ یہ فتویٰ ان کے مجموعہ فتاویٰ کے پہلے ایڈیشن میں موجود بھی ہے، مگر جب پوری دنیا نے تھو تھو کیا، دوسرے ایڈیشنوں سے ایسا غائب کیا کہ فتاویٰ رشیدیہ ہی کو خصی کر دیا۔

ایسی صورت میں امت کے عام افراد کو تقلید کیے بغیر چارہ نہیں اس لیے کہ اگر تقلید کو بدعت سیئہ وحرام قرار دے دیا جائے تو پھر قرآن وحدیث پر عمل کرنا سوائے معدودے چند حضرات کے امت کے اکثر افراد کو محال ہو جائے پھر لازم یہ کہ پوری امت کو قرآن وحدیث پر عمل کرنا وسعت سے زیادہ تکلیف دینا ہوا جو نص قرآنی "**لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا**" کے صریح منافی ہے۔ لاجرم امت کے دو گروہ ہوئے۔ ایک مجتہدین، دوسرے غیر مجتہدین۔ غیر مجتہدین کو حکم دیا گیا کہ وہ دینی معاملات میں مجتہدین کی طرف رجوع کریں اور

ان کا اتباع کریں۔

ارشاد ہے:

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (سورہ انبیاء: آیت ۷)

اہل علم سے پوچھو جب تمہیں علم نہیں۔

اس آیت کے مخاطب غیر اہل علم ہیں، اور اہل ذکر سے مراد اہل علم اور سوال سے مقصود اہل علم کے ارشاد پر اتباع کا لازم ہونا ہے۔ اس قدر پر کسی کو اختلاف نہیں بلکہ اب تو "بعد اللتیا و اللتی" یہ بھی طے ہوگیا کہ اہل ذکر سے خاص مجتہدین مراد ہیں۔

پس جب کہ یہ نص قرآنی سے ثابت ہے کہ غیر اہل ذکر پر اہل ذکر کا اتباع واجب ہے اور فریقین اس پر متفق ہیں کہ اہل ذکر سے مجتہدین مراد ہیں تو ثابت ہوگیا کہ غیر مجتہد پر مجتہد کی اتباع واجب ہے۔ یہی تقلید ہے۔

اس لیے کہ اگر مجتہد کی اتباع وضوح دلیل کے بعد ہوگی تو یہ مجتہد کی اتباع نہ ہوئی بلکہ اپنی تحقیق پر عمل ہوا۔ اس لیے مجتہد کی اتباع تقلید میں منحصر ہے۔ اس قدر پر اتفاق کے بعد وہ اصل اختلاف جس نے کروڑوں گھروں میں آگ لگا رکھی ہے، جس پر تمام امت کے ناجی یا ناری ہونے کا فیصلہ موقوف ہے وہ تقلید شخصی ہے۔

امت کا اس پر اجماع ہے کہ اب ہر شخص کو خواہ عالم ہو خواہ غیر عالم واجب ہے کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی جملہ امور فقہیہ میں تقلید کرے۔

صرف چند معدودے نفر جن کے دامن انبیائے کرام و اولیائے عظام کی اہانت سے بھی داغ دار ہیں، جس کی بنا پر وہ امت اجابت سے یقیناً خارج ہیں، تقلید شخصی کو حرام بدعت بلکہ شرک، حتی کہ " ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله" کا مصداق ٹھہراتے ہیں۔

علامہ سید احمد طحطاوی حاشیہ درمختار میں فرماتے ہیں:

فعليكم يا معشر المؤمنين باتباع الفرقة الناجية المسماة باهل السنة والجماعة فان نصرة الله تعالىٰ وحفظه وتوفيقه فى موافقتهم وخذلانه وسخطه ومقته فى مخالفتهم وهذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم فى المذاهب الاربعة

هم الحنفیون والمالکیون والشافعیون والحنبلیون ومن کان خارجا من هذه المذاهب الاربعة فهو من اهل البدعة والنار (طحطاوی علی الدر : کتاب الذبائح)

ترجمہ: اے مومنو! تم پر فرقہ ناجیہ اہل سنت وجماعت کی اتباع لازم ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور حفظ وتوفیق ان کی موافقت میں ہے، اور اس کی ناراضگی اور عذاب ان کی مخالفت میں ہے، اور فرقہ ناجیہ نے آج اس پر اجماع کرلیا ہے کہ وہ صرف مذاہب اربعہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی ہیں، اور جو ان چاروں سے خارج ہوگا، وہ بدعتی جہنمی ہے۔

منکرین تقلید کے امام الائمہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی عقد الجید میں لکھتے ہیں:

اعلم ان فی الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظیمة وفی الاعراض عنها کلها مفسدة کبیرة ونحن نبین ذلک بوجوه:

احدها ان الامة قد اجتمعت علی ان یعتمدوا علی السلف فی معرفة الشریعة فالتابعون اعتمدوا فی ذلک علی الصحابة وتبع التابعین اعتمدوا علی التابعین وهکذا فی کل طبقة اعتمد العلماء علی من قبلهم والعقل یدل علی حسن ذلک لان الشریعة لا یعرف الا بالنقل والاستنباط والنقل لا یستقیم الا بان یاخذ کل طبقة عمن قبلها بالاتصال ولا بد فی الاستنباط من ان یعرف مذاهب المتقدمین لئلا یخرج من اقوالهم فیخرق الاجماع ویبنی علیها ویستعین فی ذلک بمن سبق لان جمیع الصناعات کالصرف والطب والشعر والحدادة والتجارة والصیاغة لم یتیسر لاحد الا بملازمة اهلها وغیر ذلک نادر بعید لم یقع وان کان جائزا فی العقل واذا تعین الاعتماد علی اقاویل السلف فلا بد من ان یکون اقوالهم اللتی یعتمد علیها مرویة بالاسناد الصحیح او مدونة فی کتب مشهورة وان یکون مخدومة یتبین الراجح من المرجوح من محتملاتها وتخصیص عمومها فی بعض المواضع وبجمع المختلف منها وتبیین علل احکامها والا لم یصح الاعتماد علیها ولیس مذهب فی هذه

لا زمنة المتاخرة بهذه الصفة الا هذه المذاهب الاربعة.

ترجمہ: مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں عظیم مصلحت ہے اور ان سے اعراض کرنے میں بھاری فساد ہے ہم ان کو چند طریقے سے بیان کرتے ہیں:

اول: یہ کہ امت نے اجماع کرلیا ہے کہ شریعت کی معرفت میں سلف پر اعتماد کیا جائے، تابعین نے اس معاملہ میں صحابہ پر اعتماد کیا، اور تبع تابعین نے تابعین پر اسی طرح ہر طبقہ میں علما نے اپنے پہلے والوں پر اعتماد کیا، اس کی اچھائی پر عقل دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ شریعت نقل اور استنباط کے بغیر نہیں پہچانی جاسکتی، اور نقل نہیں درست ہوگی مگر اسی طرح کہ ہر طقہ اپنے پہلے والے سے متصلا حاصل کرے اور استنباط کے لیے یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب کو جانا جائے تاکہ ان اقوال سے باہر نہ جائیں کہ خرق اجماع ہوجائے اور تاکہ انہیں اقوال کو بنیاد بنایا جائے اور اگلوں سے اس میں مدد لی جائے اس لیے کہ تمام صنعتیں مثلا سناری اور طب اور شعر اور لوہاری اور تجارت اور رنگ ریزی کسی کو بھی میسر نہیں ہوئی مگر اس کے ماہرین کے ساتھ کام کرنے سے اور بغیر اس کے بہت نادر غیر واقع ہے، اگر چہ عقلا جائز ہے اور جب یہ متعین ہوگیا کہ (شریعت کی معرفت) میں سلف کے اقوال ہی پر اعتماد ہے تو ضروری ہے کہ ان کے وہ اقوال جن پر اعتماد ہو، اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہوں، یا مشہور کتابوں میں مدون ہوں، اور یہ کہ منقح ہوں کہ ان محتملات میں راجح، مرجوح سے ظاہر ہو اور عام کی تخصیص مذکور ہو، متضاد اقوال میں تطبیق ہو، احکام کی علتیں بیان کی گئی ہوں۔ ورنہ ان پر اعتماد صحیح نہیں، اور اس پچھلے زمانہ میں کوئی مذہب اس صفت کے ساتھ موصوف نہیں، سوائے ان چار مذاہب کے۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے۔

۱۔ فرقہ ناجیہ صرف اہل سنت و جماعت ہے، ان کے علاوہ دوسرے تمام فرقے خواہ وہ اپنا نام کچھ رکھیں، جہنمی اور بدعتی ہیں۔

۲۔ اس پر اجماع ہے کہ تقلید شخصی واجب ہے۔

۳۔ تقلید شخصی میں عظیم مصلحت ہے، اور اس کے ترک میں فساد کبیر ہے۔

۴۔ شریعت کی معرفت نقل اور استنباط پر موقوف ہے، اور یہ دونوں سلف کے اقوال جاننے پر موقوف ہے۔

۵۔ سلف میں صرف ائمہ اربعہ کے اقوال اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہیں، اور صرف انہیں کے مذاہب منقح ہیں۔

۶۔ سلف میں سے ائمہ اربعہ کے علاوہ دوسرے مجتہدین کے اقوال نہ تو اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہیں، نہ کتب مشہورہ میں جامعیت کے ساتھ مدون ہیں کہ ان پر اعتماد صحیح ہو اور نہ منقح ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مجتہدین میں سے صرف ائمہ اربعہ ہی کے مذاہب لائق اعتماد وقابل عمل ہیں، اور یہی علت ہے، ان میں سے کسی ایک پر عمل کے وجوب پر اجماع ہونے کی اور اجماع خواہ کسی عصر کا ہو حجت شرعی ہے، اس لیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لاتجتمع امتی علی الضلالۃ" میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔

نیز قرآن میں فرمایا گیا:

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۝ (نساء: ع:۱۴ آیت:۱۱۵)

ترجمہ: اور جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خلاف کرے، اس کے بعد کہ حق کا راستہ اس پر ظاہر ہو چکا اور مسلمانوں کے راستے سے الگ راستہ چلے ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے، اور یہ کیا ہی بری جگہ پلٹنے کی ہے۔

لہذا اس میں شک وشبہہ نہ رہا کہ اس عصر میں واجب ہے کہ ائمہ اربعہ میں کسی ایک امام کی تقلید کی جائے۔ ان کے علاوہ دوسرے ائمہ کی تقلید ممنوع ہے۔ اس لیے کہ ان کے مذاہب اتنی احتیاط اور جامعیت کے ساتھ آج موجود نہیں کہ ان کا اتباع کیا جاسکے۔ رہ گئی ایک صورت یہ کہ ائمہ اربعہ میں کسی معین کی تقلید نہ کی جائے بلکہ بعض مسائل میں ایک کی بعض میں دوسرے کی۔ اس میں کیا حرج ہے؟

پہلا حرج یہی ہے کہ یہ خرق اجماع ہے۔ اجماع اس پر ہے کہ جو جس امام کا مقلد ہو جملہ امور میں اس کی تقلید کرے۔ بعض مسائل میں ایک کی بعض مسائل میں دوسرے کی یہ ناجائز اور گناہ ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ حقیقت میں امام کی تقلید نہ ہوئی، اپنے نفس کی تقلید ہوئی۔ اس لیے کہ دوسرے امام کی تقلید ایک امام سے عدول کر کے دوسرے امام کی طرف رجوع کی بنیاد کیا ہوگی؟ اپنی پسند کے کچھ مسائل میں امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اجتہاد پسند آیا تو اسے اختیار کیا، اور بعض دوسرے مسائل میں دوسرے امام کا اجتہاد پسند آیا تو اسے اختیار کرلیا، یہی تو ہوائے نفس کی پیروی ہے۔ اگر یہ اعراض ورجوع دلیل کی قوت وضعف کی بنا پر ہے تو یہ تسلیم قول بلا دلیل نہ ہوا با دلیل ہوا۔ پھر تقلید نہ رہی اور کلام تقلید میں ہے۔

تیسرا حرج یہ ہے کہ یہ نص قرآنی سے حرام ہے کہ کبھی ایک طریقہ اختیار کیا جائے کبھی اس کے برعکس دوسرا۔ ہم کو حکم ملا ہے کہ ہم ایک ہی راستے کو اختیار کریں، اور اس کی پیروی کریں۔ چند راستے کا اتباع نہ کریں، فرمایا گیا:

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۞ (الانعام: پ۸،ع۴، آیت ۱۵۴)

ترجمہ: چند راستوں پر مت چلو ورنہ اس کے راستے سے ہٹ جاؤ گے۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اگر کہیں چند راستے گئے ہوں تو منزل پر وہی پہنچے گا جو ان میں کسی ایک کو اختیار کرے اور جو کبھی ایک راستے پر، کبھی دوسرے پر، پھر تیسرے پر، پھر چوتھے پر، پھر پہلے پر، اور پھر دوسرے پر، علی ہذا القیاس چلتا رہے گا۔ وہ راستہ ناپتا ہی رہ جائے گا۔ منزل تک ہرگز نہیں پہنچے گا۔

اس لیے آج واجب ہے کہ جو حنفی ہے، وہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی اور جو شافعی ہے، وہ حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اور جو مالکی ہے، وہ حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور جو حنبلی ہے وہ حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جملہ فقہی مسائل میں تقلید کرے۔ امت کے کسی فرد کو ان کے علاوہ کسی مجتہد کی تقلید جائز نہیں۔ اور تلفیق یعنی کچھ مسائل میں ایک کی تقلید اور کچھ مسائل میں دوسرے کی، یہ بھی حرام وگناہ

ہے۔ یہ اتباع شریعت نہیں، اتباع ہوائے نفس ہے۔

علمائے احناف کی تقلید پر ایک بہت مشہور و معروف اعتراض امرتسری آنجہانی صاحب کا یہ ہے کہ تقلید کی تعریف ہے: تسلیم قول الغیر بلا دلیل، اور علمائے احناف چوں کہ ہر مسئلہ کی دلیل جانتے ہیں، اس لیے یہ مقلد نہ ہوئے، مجتہد ہوئے۔ عرصہ ہوا مئو میں یہ سوال اٹھا تھا، اسی وقت اس خادم نے یہ جواب دیا تھا کہ تقلید کی تعریف میں بلا دلیل کا تعلق تسلیم سے ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ کسی کی بات کا ماننا بلا دلیل ہو یعنی ماننے کی بنیاد دلیل نہ ہوں کہ چوں کہ اس قول کی دلیل بہت قوی ہے۔ لہذا مان لیا ہے۔ بلکہ ماننے میں دلیل کو قطعا کوئی دخل نہ ہو۔ جیسے بچے،، ماں باپ کی بات مانتے جاتے ہیں۔ طالب علم استاذ کی بات مانتے جاتے ہیں۔ اور مریض طبیب کی بات مانتا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی بات کو مانا تو بلا دلیل ہے، مگر اس کی دلیل بھی جانتا ہو یا بعد میں جاننے لگے۔ دلیل جاننا تقلید کے منافی نہیں جب کہ وہ علت تسلیم نہ ہو۔ دلیل کا جاننا اس وقت منافی ہے جب کہ تسلیم کی علت اور سبب دلیل ہو۔ مثلا یہ کہ چوں کہ اس بات کی دلیل بہت قوی ہے۔ لہذا یہ مان لیا اور فلاں کی دلیل بہت کمزور ہے لہذا اسے ترک کر دیا۔

اس طرح کا ماننا دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہ تسلیم القول بلا دلیل نہیں، بدلیل ہے۔ لیکن اگر ہم ایک بات کو مان رہے ہیں مگر ماننے میں دلیل کو دخل نہ ہو، یا ماننا بلا دلیل ہو تو یہ تقلید ہے خواہ اس کی دلیل جانتے ہوں خواہ نہ جانتے ہوں۔ علمائے احناف کا حال یہی دوسرا ہے کہ وہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقوال اور ان کے مذہب مہذب کو بلا دلیل مانتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابتدائے شعور ہی سے ہم وضو، غسل، طہارت، نماز، روزہ وغیرہ سب مذہب امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق کرتے ہیں، اور اس کی تفاصیل کو حق مانتے ہیں۔ جب شرح وقایہ اور ہدایہ وغیرہ پڑھتے ہیں تو دلیل سے واقف ہوتے ہیں، اس لیے یہ ماننا بلا دلیل ہوا یہ دوسری بات ہوئی کہ مان لینے کے بعد دلیل بھی جان گئے۔

رویت ہلال اور توقیت

ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ بابت ماہ مئی ۱۹۸۸ء میں اس کے ایڈیٹر صاحب نے مسلمانوں خصوصاً علما پر اپنی سخت برہمی کا اظہار کیا ہے کہ نماز کے اوقات بلکہ خود روزے کے افطار وسحری میں علم توقیت وہیئت کا اعتبار کرتے ہیں۔ مگر عید کے سلسلے میں اعتبار نہیں کرتے۔ جس کے نتیجے میں ایک ہی شہر میں دو دن عید ہوتی ہے۔

رسالہ کے اس حصہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ایک صاحب نے یہاں دار الافتا میں بھیجی۔ اور قلم برداشتہ اس کا جواب لکھ دیا گیا۔ ایک دین دار مسلمان کے لیے وہی کافی ہے۔ مزید کچھ لکھنے کی حاجت نہیں تھی مگر اس میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ چاند کی رویت کے لیے ایسا کوئی قاعدہ نہیں معلوم کیا جا سکا ہے جو قطعی ہو، اس کے لیے جو بھی قواعد بنائے گئے، ان سب میں تجربے سے تخلف ثابت ہو چکا ہے۔ اس لیے رویت ہلال کے سلسلے میں علم توقیت کا اعتبار نہیں۔

اس کے بعد بعض حضرات نے بتایا کہ قدیمی قواعد میں جو خامیاں تھیں، ان کو بار بار تجربہ کر کے دور کر دی گئی ہیں، اور اب ان میں ایسی پختگی آگئی ہے کہ ان میں تخلف نہیں ہوتا۔ ان قواعد کی صحت کا بار بار تجربہ بھی کر لیا گیا ہے، جس سے اس میں قطعیت آگئی ہے، اور حساب کا قطعی ہونا مسلم ہے۔ تو جیسے اوقات طلوع وغروب اور نماز میں علم توقیت پر اعتماد کی وجہ یہی تھی کہ حساب قطعی اور بار بار کے تجربے نے ان قواعد کو قطعی کر دیا ہے۔ رویت ہلال کے ان جدید قواعد پر بھی اعتماد کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ خصوصا جب کہ ''گرنج'' وغیرہ کی اعلیٰ رصدگاہوں میں سارا حساب کمپیوٹر کے ذریعہ ہوتا ہے، جس میں اس کا بھی احتمال نہیں کہ حساب میں کوئی غلطی ہوگئی، یا بہت مختصر کسروں کو چھوڑنے کی وجہ سے کوئی کمی یا زیادتی ہوگئی ہو۔ تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر صاحب کا بھی مقصد غالباً یہی ہے۔

اس پر گزارش یہ ہے کہ نئی تعلیم وتحقیق کے ماہرین میں جو سب سے بڑا نقص ہے وہ

یہ ہے کہ اپنی ہمہ دانی کے نشے میں اپنی عقل سے شرعی احکام میں بھی دخل دینے لگتے ہیں بلکہ مجتہد سے بھی آگے بڑھ کر قرآن وحدیث کے صریح ارشادات کے خلاف فتویٰ دینے کی بھی جسارت کرنے لگتے ہیں۔ مجتہدین بھی اس کے پابند تھے کہ ہر قضیے کا حکم پہلے قرآن مجید میں تلاش کریں، اس میں نہ ملے تو احادیث میں، ان میں بھی نہ ملے تو اجماع امت دیکھیں، اب اگر اس قضیے میں اجماعت امت نہیں یا سرے سے کوئی حکم صحابہ وتابعین سے منقول نہیں تو قیاس سے کام لیں۔ وہ بھی انہیں اصول کی پابندی کے ساتھ جو قرآن واحادیث سے مستنبط ہیں۔

اور ان حضرات کا حال یہ ہے کہ نیوٹن، کیپلر، اسٹائن کے اصول وفروع کے حافظ ہوتے ہوئے قرآن وحدیث اور اصول اجتہاد سے قطعی نابلد ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی رائے عموماً نصوص شرعیہ کے معارض ہوتی ہے، جب کہ قرآن وحدیث مذہب اسلام کے غیر متبدل دستور اساسی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن واحادیث کے معارض بڑے سے بڑے ہمہ دان محقق مدقق کی ذاتی رائے کے مذہبی حکم کی جگہ دینی مذہب اسلام سے انحراف اور نئے مذہب کی بنیاد رکھنے کے مرادف ہے۔

بعینہ یہی قصہ یہاں بھی ہے کہ رویت ہلال کے سلسلے میں جو لوگ رصد گاہوں کی تحقیق پر اعتماد کی وکالت کر رہے ہیں، ان لوگوں کا یہی حال ہے کہ وہ لوگ کیپلر اور نیوٹن اسٹائن کی کدو کاوش اور نکتہ آفرینیوں کو اتنا یقینی وقطعی جانتے ہیں کہ اس کے مقابل قرآن و احادیث کے ارشادات کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس سلسلے میں ہم دین دار، دین پسند مسلمانوں کی توجہ اس پر مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ روزہ، نماز، عیدین، صدقہ فطر، قربانی، حج خالص عبادات ہیں، اور جس طرح ان عبادات کے ارکان اور ہیئت کی تعین میں عقل انسانی کو کوئی دخل نہیں بلکہ یہ اسی وقت صحیح اور معتبر ہوں گے جب انہیں ارکان اور ہیئت کے ساتھ ادا کیے جائیں جو منجانب شارع مقرر ہیں۔ اسی طرح ان عبادات کے اوقات بھی وہی معتبر ہوں گے جو شارع نے بتائے ہیں۔ اپنے جی سے نئے اوقات مقرر کر کے ادا کیے جائیں گے تو وہ صحیح نہ ہوں گے۔ بعینہ اسی طرح ان اوقات کے معلوم کرنے کا اگر شارع نے کوئی خاص طریقہ بیان فرمادیا ہے تو خاص اسی طریقہ سے

دریافت کیے ہوئے اوقات ہی حقیقت میں ان کے اوقات ہوں گے۔اسی طریقہ سے ہٹ کر ہم اور آپ اگر کوئی نیا طریقہ ایجاد کریں تو اس طریقہ سے معلوم کیے ہوئے اوقات ان عبادات کے اوقات نہیں ہو سکتے اور ان میں ادائیگی حقیقت میں از روے شرع ادائیگی نہ ہوگی۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ عبادات کے ارکان ہیئت اوقات کی طرح اگر اوقات کے جاننے کا کوئی طریقہ شارع نے مقرر کر دیا ہے تو اسی طریقہ سے دریافت کیا ہوا وقت اس عبادت کا وقت ہے، اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے دریافت شدہ وقت اس عبادت کا وقت نہ ہوگا۔خصوصا ایسے طریقے جسے شارع نے مسترد کر دیا ہو۔ہاں !اگر اوقات معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا ہے تو پھر اپنی صواب دید سے دریافت کردہ اوقات میں عبادت کی ادائیگی صحیح ہوگی۔

اتنی بات ذہن نشین کرنے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ کسی بھی مہینے کی ابتدا اور انتہا جاننے کا کوئی طریقہ شریعت نے مقرر فرمایا ہے یا نہیں، اور نجوم و ہیئت کو اس خصوص میں لغو اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے یا نہیں۔آیئے آگے بڑھیے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

یسئلونک عن الاهلة قل هي مواقيت للناس و الحج.

(بقرہ: پ ۲ . ع ۸ . آیت ۱۸۹)

ترجمہ: تم سے لوگ چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں۔فرمادو یہ لوگوں کے (اپنے) کاروبار اور حج کے اوقات جاننے کا ذریعہ ہے۔

سوال اصل میں یہ تھا کہ چاند گھٹتا بڑھتا کیوں ہے۔پہلی شب کو باریک نظر آتا ہے پھر بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پورا ہو جاتا ہے، پھر پتلا ہونا شروع ہوتا ہے، یہاں تک کہ غروب ہو جاتا ہے۔اس کا سبب نہ بتا کر اس کا فائدہ بتایا گیا۔اس میں بہت خوش اسلوبی سے لوگوں کو چاند کے طلوع و غروب ہلال و بدر میں تبدیلی کی علت اور سبب جاننے کی کوشش سے روکا گیا ہے اور اس کے روکنے میں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ اس کا سبب دریافت کرنا عبث اور بے فائدہ ہے۔اس سے کوئی دینی فائدہ وابستہ نہیں، اس سے اقتضاء ثابت ہوا کہ ہیئت و نجوم کے اصول چاند کے سلسلے میں غیر معتبر ہیں۔

اس کے بعد آیئے احادیث کا مطالعہ کریں:

احادیث:

امام احمد نے اپنی مسند میں، امام مالک نے اپنے موطا میں، امام بخاری و امام مسلم نے اپنی صحیحین میں، امام ابو داؤد نے اپنے سنن میں، امام ترمذی نے اپنے جامع میں، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی نے اپنی سنن میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الشهر تسعة و عشرون ليلة فلا تصوموا حتىٰ تروه فان غم فاكملوا العدة ثلاثين.

ترجمہ: مہینہ انتیس رات کا ہے، جب تک چاند نہ دیکھ لو، روزہ نہ رکھو اور اگر ابر ہو تو تیس کی گنتی پوری کرو۔

بعض روایتوں میں فاکملوا کی جگہ فاقدروا آیا ہے۔ بخاری میں فاقدروا له ہے، اور ابو داؤد وغیرہ میں فاقدروا له ثلاثين ہے۔ یعنی اس کے لیے تیس کی مقدار پوری کر لو۔ اس کا بھی حاصل وہی ہوا کہ تیس دن پورے کر لو۔

امام احمد نے اپنی مسند میں امام بخاری، امام مسلم نے اپنی صحیحین میں، امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابو داؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی نے اپنی اپنی سنن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

صوموا الرؤيته وافطروا الرؤيته فان غم عليكم فاكملوا اعدة شعبان ثلاثين.

ترجمہ: چاند دیکھ کر روزہ رکھو۔ چاند دیکھ کر روزہ چھوڑو۔ اور اگر ابر ہو تو شعبان کی تیس کی گنتی پوری کرو۔

امام بخاری، امام مسلم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے راوی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تصوموا حتىٰ تروا الهلال ولا تفطروا حتىٰ تروه فان غم عليكم فاقدروا له.

ترجمہ: جب تک چاند دیکھ نہ لو، روزہ نہ رکھو، اور جب تک چاند دیکھ نہ لو روزے نہ

چھوڑ دو، اور اگر ابر ہو تو مقدار پوری کرو۔

ابوداؤد میں فاقدروالہ ثلاثین ہے۔ یعنی تیس دن کی مقدار پوری کرو۔ اس مضمون کی احادیث متعدد حضرات صحابہ سے مروی ہیں۔ جیسے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو حذیفہ، حضرت عبداللہ بن عباس، اور عبدالرحمٰن بن زید بن خطاب، حارث بن حاطب، ربعی بن خراش رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ الفاظ میں کچھ رد و بدل ضرور ہے مگر مفہوم سب کا ایک ہے۔ یہ احادیث اس پر نص ہیں کہ مدار رویت ہلال پر ہے۔ اگر انتیس شعبان کو چاند دیکھائی دے تو شعبان ختم اور رمضان شروع اگر انتیس کو دیکھائی نہ دے تو شعبان باقی اور اس کے بعد والا دن فرض روزے کا دن نہیں۔ اسی طرح رمضان میں بھی ہے کہ اگر انتیس رمضان کو چاند نظر آیا تو رمضان ختم اور دوسرا دن شوال کا ہے۔ اور اگر انتیس کو چاند نظر نہ آیا تو اس کے بعد والا دن رمضان ہی ہے۔ اس دن روزہ چھوڑنا فرض کا چھوڑنا اور گناہ اور نماز عید پڑھنی درست نہیں کیوں کہ ابھی اس کا وقت ہی نہیں ہوا ہے۔ جب شارع علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرض روزے کے ایام جاننے کا طریقہ صرف رویت ہلال رکھا ہے تو دوسرے طریقے شرعاً لغو اور غیر معتبر۔ اس لیے کسی بھی طریقے سے اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ چاند افق سے اتنی بلندی پر ہے کہ اگر مطلع صاف ہوتا تو ضرور دکھائی دیتا مگر دکھائی نہیں دیا تو یہ ناکافی ہے بلکہ غیر معتبر اور لغو ہے۔ اتنے ہی سے بات مکمل تھی کہ جب بنیاد رویت ہے، اگر رویت نہ ہوئی تو ایک مہینے کے ختم ہونے اور دوسرے کے شروع ہونے کا حکم شرعاً درست نہیں۔

اس بارے میں حساب غیر معتبر ہے:

(۱) اسی سے ثابت ہو گیا کہ اس خصوص میں دوسرے ذرائع شرعاً کالعدم ہیں، مگر شارع علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فان غم علیکم فرمایا۔ اس ارشاد نے براہ راست دوسرے ذرائع معلومات کے کالعدم ہونے پر مہر فرمادی۔ اس لیے کہ "غم" کے معنی ڈھانک لینے کے ہیں۔ غم کو غم اسی لیے کہتے ہیں وہ دل ڈھانک لیتا ہے۔ اور اسی مناسبت سے بادل کو غمامہ کہتے ہیں کہ وہ آسمان کو ڈھانک لیتا ہے۔ اب غم علیکم کا ترجمہ یہ ہوا کہ چاند تم سے ڈھانک اور چھپا لیا جائے، اور چھپائی وہی چیز جاتی ہے جو موجود ہو۔ تو حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہوا کہ

چاند افق سے اوپر ہو اور وہ کسی چیز سے ڈھنک جائے چھپ جائے۔ مثلاً کہرا، گرد و غبار وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آئے۔ اور اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو نظر آتا۔ مگر ان چیزوں میں سے کسی کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا ہے، تو حدیث میں قطعی حکم موجود ہے کہ ایسی صورت میں تیس کی گنتی پوری کرو۔ ان حسابات سے یہی نہ معلوم ہوگا کہ چاند افق سے اتنا اونچا ہو گیا کہ اگر کوئی چیز حائل نہ ہوتی تو ضرور نظر آتا، مگر جب نظر نہیں آیا تو شارع علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا کہ مہینہ ختم نہ ہوا باقی ہے۔ ایک دن اور پورا کرو۔

اس سے واضح اور غیر مبہم یہ حدیث ہے:

(۲) امام احمد اپنی مسند میں امام بخاری اپنی جامع میں امام مسلم اپنی صحیح میں، امام ابو داؤد اور امام نسائی اپنی اپنی سنن میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور اقدس نے فرمایا' اللفظ للمسلم:

انا امة امية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا و هكذا و عقد الابهام في الثلالثة و الشهر هكذا و هكذا يعني تمام ثلاثين.

ترجمہ: ہم امی قوم ہیں، حساب و کتاب نہیں کرتے۔ مہینہ اتنا ہے اور اتنا ہے اور اتنا ہے۔ تیسری مرتبہ انگوٹھے کو باندھ لیا، اور مہینے اتنا ہے اور اتنا ہے اور اتنا ہے یعنی پورے تیس دن۔ یعنی حضور اقدس ﷺ نے دونوں ہاتھوں کی دسوں انگلیوں کو پھیلا کر اوپر سے نیچے لا کر تین بار فرمایا کہ مہینہ اتنا ہے اتنا ہے اتنا ہے اور تیسری بار ایک انگوٹھے کو دبا لیا۔ یعنی انتیس دن، پھر تین بار اسی طرح اشارہ کر کے فرمایا کہ اتنا اتنا اتنا ہے۔ اب کی بار انگوٹھے کو کھلا رکھا۔ یعنی تیس دن۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ مہینہ انتیس (۲۹) ورنہ تیس (۳۰) کا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود پہلے نکتب ولا نحسب ارشاد فرمایا۔ پھر انتہائی واضح غیر مبہم طور پر بیان فرمایا کہ مہینہ انتیس دن یا تیس دن کا ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ ہلال کے بارے میں اہل نجوم اور اہل ہیئت کے حساب کا اعتبار نہیں۔ وہ اس بارے میں قطعاً غیر معتبر ہے۔ اعتبار، رویت کا ہے۔ اگر انتیس کو چاند دکھائی دے فبہا ورنہ تیس کا مہینہ ہوگا۔ جب شارع نے اہل نجوم اور

ہیئت کے حساب کو لغو اور غیر معتبر قرار دے دیا تو شارع کے مقابل ہمیں یہ کب اختیار ہے کہ ہم اسے معتبر مان کر اس پر مہینوں کے ابتدا اور انتہا کی بنیاد رکھیں، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نجوم اور ہیئت کے حساب پر عمل نہیں فرماتے تھے۔

ابوداؤد میں ہے:

و کان ابن عمر یفطر مع الناس ولا یاخذ بھذا الحساب.

یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما لوگوں کے ساتھ روزہ چھوڑتے تھے، اور اس حساب کو نہیں لیتے تھے۔

ایڈیٹر صاحب کے شبہے کا جواب:

اڈیٹر صاحب کو یہ شکایت کہ نماز کے اوقات نیز سحری اور افطار میں اس حساب کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ پھر مہینے کی ابتداء اور انتہاء کے سلسلے میں کیوں نہ اعتبار کیا جائے۔

اس پر گزارش ہے کہ نماز اور سحری اور افطار میں شریعت نے رویت پر مدار نہیں رکھا ہے، بلکہ سورج کے طلوع وغروب وزوال۔ اور اس کے دو مثل سایہ ہونے اور صبح صادق کے طلوع اور شفق کے غروب پر رکھا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جب یہ دیکھ لو کہ صبح صادق طلوع کر آئی ہے، تو روزہ دار کھانا پینا چھوڑ دے، اور نماز فجر کا وقت ہو گیا۔ اور جب یہ دیکھ لے کہ سورج غروب ہو گیا تو روزہ توڑ دے، اور مغرب کا وقت ہو گیا بلکہ یہ فرمایا کہ صبح صادق کے طلوع سے روزہ دار کھانا پینا چھوڑ دے، اور نماز فجر کا وقت ہو گیا اور غروب آفتاب پر روزہ افطار کر لے اور مغرب کا وقت ہو گیا، علی ہذا القیاس اگر دیکھے بغیر بھی صبح صادق کے طلوع اور آفتاب کے غروب کا علم ہو جائے تو ان سے جو احکام وابستہ ہیں وہ ثابت ہوں گے۔ اس کو یوں کہیے کہ ان اوقات کے معلوم کرنے کا کوئی خاص طریقہ شریعت نے مقرر نہیں فرمایا ہے مثلاً یہی کہ رویت ہو تو ہم کسی طریقے سے بھی ان اوقات کو جان لیں گے، کافی ہے مگر مہینے کی ابتداء اور انتہا معلوم کرنے کے لیے طریقہ متعین فرما دیا کہ وہ عینی رویت ہی ہو اور دوسرے طریقوں کو غیر معتبر قرار دے دیا ہے اس لیے یہاں رویت کے علاوہ دوسرے طریقے کالعدم ہوں گے۔

ریڈیو وغیرہ کی خبر پر

عید منانے کے نقصانات

ہر سال عید کے موقع پر ریڈیو کے ذریعہ چاند کے اعلان پر پورے ملک میں ہنگامے کھڑے ہو جاتے ہیں اور امسال خصوصیت سے بہت زیادہ شورش مچی، جس کے نتیجے میں دار الافتاء میں اس سلسلے میں سوالات کی بھر مار ہوگئی۔ اس لیے میں نے ضروری جانا کہ اس موضوع پر ایک مفصل مدلل مضمون شائع کر دیا جائے۔ اسی جذبے کے تحت مندرجہ ذیل سطور سپرد قلم کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جو دین دار انصاف پسند ان سطور کو پڑھے گا وہ پورے طور سے مطمئن ہو جائے گا۔

(۱) روزہ نماز عید تراویح خالص عبادات ہیں۔ شریعت نے ان کے لیے اوقات مقرر فرمائے ہیں۔ نہ وقت سے پہلے ادا ہوں گے، نہ وقت کے بعد۔ روزے اور تراویح کے لیے رمضان کا مہینہ مقرر فرمایا، اور صدقہ فطر نماز عید کے وجوب کے لیے پہلی شوال۔

(۲) اوقات مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ اوقات جاننے کا طریقہ بھی مقرر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

صوموا الرویته وافطروا الرویته فان غم علیکم فاکملوا (بخاری ومسلم)

ترجمہ: چاند دیکھ کر روزہ رکھو چاند دیکھ کر روزہ چھوڑو۔ اگر انتیس کو چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرو۔

دوسری حدیث میں فرمایا:

إنا امة امية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا هكذا يعني مرة تسعا و عشرين ومرة ثلاثين. (بخاری و غیرہ)

ترجمہ: ہم حساب و کتاب نہیں کرتے، مہینہ ایسے ایسے ہے، اپنے دست مبارک کی

دسوں انگلیوں کو کھول کر دست مبارک اوپر اٹھائے اور نیچے کیا تیسری بار ایک انگوٹھا دبا لیا، یعنی کبھی انتیس کبھی تیس کا۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اسلامی مہینوں کی ابتدا و انتہا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے یا تیس دن پورے ہونے پر۔ یہی شارع علیہ السلام نے متعین فرمایا ہے۔ اہل ہیئت و توقیت و نجوم و جیوتش کے حساب و کتاب کا قطعاً اعتبار نہیں۔

(۳) یہ بھی ظاہر ہے کہ ان احادیث کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک ہر شخص چاند دیکھ نہ لے نہ روزہ رکھے، نہ چھوڑے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب چاند کا دیکھنا بطریق شرعی ثابت ہو جائے تو جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے وہ بھی اس کے مطابق عمل کریں۔

(۴) چاند کے ثبوت کے آٹھ طریقے ہیں، جن سب کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے رسالہ مبارکہ "طرق اثبات ہلال" میں جمع فرما دیا ہے۔ اس وقت ان سب طریقوں کو بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ دوسرے شہر کے رویت کی خبر بذریعہ ریڈیو یا ٹیلیفون آئے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ دوسری جگہ کی خبر کیسے معتبر ہوگی۔ اس سلسلے میں ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، طحاوی میں ایک حدیث ہے، پہلے اسے ذہن نشیں کر لیں:

اغمی علینا هلال شوال فاصبحنا صیاما فجاء رکب من آخر النهار فشهدوا عند النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم انهم رأوا الهلال بالأمس فامرهم رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ان یفطروا وان یخرجوا الیٰ عیدهم من الغد .

ترجمہ: ایک دفعہ شوال کا چاند ۲۹ر کو دکھائی نہیں دیا۔ تو ہم نے دوسرے دن روزہ رکھا۔ دن کے آخر حصہ میں کچھ سوار آئے، پھر انہوں نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور گواہی دی کہ ہم لوگوں نے چاند کل دیکھا ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ روزہ توڑ دیں اور کل عید کے لیے نکلیں گے۔

اب یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ آنے والے صحابہ کرام تھے۔ جن کا جھوٹ بولنا وہ بھی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور شرعاً ممکن نہیں، وہ بھی صرف ایک صاحب

نہیں تھے، پوری جماعت تھی۔ اس لیے کہ رکب دس سے زائد سوار کو کہا جاتا ہے تو اتنا متعین ہو گیا کہ کم از کم دس صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خبر دے رہے ہیں کہ ہم نے کل چاند دیکھا ہے۔ مگر ان کی یہ خبر شہادت کے بعد ہی شوال کے چاند کے بارے میں قبول ہوئی۔ تو پھر آج کل کے بادشاہ کی خبر بغیر شہادت عید کے چاند کے سلسلے میں کب قابل اعتبار ہوگی۔ ریڈیو، ٹیلیفون، ٹی وی کی خبر کا کیا ٹھکانہ۔

(۵) جب دوسری جگہ کی رویت کے معتبر ہونے کے لیے شہادت بحکم حدیث شرط ہوئی تو شہادت اور گواہی کے تمام لوازم ضروری ہو گئے مثلاً عینی شاہد ہونا، یعنی گواہ نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہو، اب اگر گواہ نے خود چاند نہیں دیکھا ہے۔ یہ گواہی دیتا ہے کہ فلاں جگہ کے فلاں فلاں یا سب لوگوں نے چاند دیکھا ہے تو معتبر نہیں اس لیے کہ یہ شہادت نہ ہوئی، حکایت اور واقعہ بیان کرنا ہوا۔

درمختار میں فرمایا:

لا لو شهدوا برؤية غيرهم لانه حكاية .

اگر دوسرے لوگوں کے چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو معتبر نہیں اس لیے کہ یہ حکایت ہے۔

اور یہی عالم گیری وغیرہ میں بھی ہے، اور یہ بات خود دنیوی کچہریوں میں بھی ہے۔ کسی معاملے میں گواہ اگر یہ گواہی دے کہ جو لوگ واقعے کے چشم دید گواہ ہیں انہوں نے مجھے بتایا تو یہ گواہی رد کر دی جائے گی۔ پھر عبادات وہ بھی فرائض و واجبات میں اتنی ڈھیل کیسے ہو سکتی ہے کہ محض حکایت کافی ہو۔ خصوصاً جب کہ حدیث سے ثابت کہ اس میں شہادت شرط ہے۔ یوں ہی گواہوں کا عادل ہونا اور بقدر نصاب ہونا لازم ہے۔ ارشاد ہے:

وَأَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ۝ (طلاق، پ۲۷۔ع ۱۷۔آیت ۲)

تم میں کے چند عادل گواہی دیں۔

اور فرمایا:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ (بقرہ، پ۲۸۔ع۷۔آیت ۲۸۲)

اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بناؤ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بناؤ، اپنے گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو۔

ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ کسی بھی معاملے میں گواہی اس وقت معتبر ہوگی جب گواہ کم از کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، جو سب کے سب مسلمان عادل ثقہ متدین ہوں نیز یہ بھی شرط ہے کہ عینی شاہد خود قاضی مفتی کے پاس حاضر ہو کر گواہی دے۔ دور دراز شہروں سے اپنے گھر بیٹھے گواہی کیا معتبر ہوگی۔ مجلس قضا میں پردے کی اوٹ سے گواہی معتبر نہیں۔

(۶) ان تفصیلات سے ظاہر ہو گیا کہ ریڈیو، ٹی وی کی خبر رویت ہلال کے سلسلے میں بالکلیہ ساقط الاعتبار ہے۔ اولا: یہ صرف ایک خبر ہے شہادت نہیں۔ ثانیا: صرف ایک شخص کی خبر ہے۔ ثالثا: ریڈیو پر اعلان کرنے والے عموما غیر مسلم ورنہ فاسق ضرور ہوتے ہیں۔ رابعا: یہ خود چاند نہیں دیکھتا۔ یہ اعلان کرتا ہے کہ فلاں جگہ چاند دیکھا گیا، فلاں امام یا مولوی نے یہ اعلان کرایا۔ خامسا: قاضی یا مفتی کے پاس موجود نہیں، میلوں کی دوری سے بول رہا ہے۔

(۷) ٹیلیفون کا بھی یہی حال ہے کہ وہ صرف ایک خبر ہوتی ہے اور اگر کوئی عادل ثقہ ٹیلیفون پر گواہی بھی دے تو بھی غیر معتبر کہ اولا: یہ صرف ایک شخص ہے۔ ثانیا: روبرو حاضر نہیں، پس پردہ دوری سے بول رہا ہے۔

(۸) اب بات بالکل واضح ہو گئی کہ اگر ۲۹؍ رمضان کو ریڈیو سے یہ خبر نشر ہو یا ٹیلیفون سے کوئی یہ کہے کہ فلاں جگہ چاند ہو گیا۔ فلاں امام یا مولانا نے تسلیم کر لیا، اور انہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ کل یکم شوال ہے، تو یہ خبر شرعی اعتبار سے قطعا ساقط و نا قابل اعتبار ہے۔ اس پر اعتماد کر کے دوسرے دن روزہ نہ رکھنا اور نماز عید پڑھنی ناجائز و گناہ، نہ صرف ایک گناہ بلکہ اکٹھے چار گناہوں کا ارتکاب ہے۔ اول: یہ کہ غیر شرعی طریقے کو شرعی طریقہ جان کر اس پر اعتماد کیا۔ دوم: دوسرے دن تیس رمضان تھی۔ اس لیے اس دن روزہ رکھنا فرض تھا۔ روزہ نہ رکھا یا رکھ کر توڑ دیا تو فرض کو چھوڑ دیا۔ سوم: نماز عید کے نام سے جو نماز پڑھی وہ وقت نہ ہونے کی وجہ سے نماز عید نہ ہوئی، نفل ہوئی۔ نماز عید جس خاص ہیئت کے ساتھ پڑھی جاتی

ہے، یعنی زائد تکبیروں کے ساتھ ویسی کوئی نفل نماز مشروع نہیں تو یہ بنام نماز ایک لایعنی فعل میں مشغولیت ہوئی۔ درمختار میں ہے:

لانہ اشتغال بما لا یصح

چہارم: اس گمان پر کہ نماز عید پڑھ چکے ہیں۔ یکم شوال کو نہیں پڑھی اور نماز عید واجب ہے جسے چھوڑ دیا۔ پھر تیس رمضان کی تراویح سے محرومی اور تداعی کے ساتھ نفل کی ادائیگی مزید برآں۔

(۹) ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبر پر روزہ سے روکنے والے روزہ توڑنے والے بڑے زور وشور سے یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اس پر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب کہ بہ طریق شرعی یہ ثابت ہو جائے کہ یہ عید کا دن ہے تو اس دن روزہ رکھنا ضرور مکروہ تحریمی ہے، حرام قطعی نہیں۔ اگر چہ کبھی کبھی فقہا مکروہ تحریمی پر بھی حرام کا اطلاق کر دیتے ہیں۔

درمختار میں ہے:

والمکروہ تحریما کالعیدین.

لیکن جب ۲۹؍رمضان کے چاند کا ثبوت بہ طریق شرعی نہ ہو تو دوسرے دن بلاشبہ تیس رمضان ہے۔

حدیث گزر چکی۔

فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلاثین.

جب نظر نہ آئے یا اس کا شرعی ثبوت نہ ملے، تو تیس کی گنتی پوری کرو۔

اور آپ نے دیکھا کہ اس دن روزہ چھوڑنے یا توڑنے اور نماز عید پڑھنے میں اکٹھے چار گناہوں کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ تو یہ کون سی عقل مندی اور دین داری ہے کہ اس تو ہم پر کہ یہ عید کا دن ہے۔ کراہت سے بچنے کے لیے چار چار گناہوں کا ارتکاب کیا جائے۔

(۱۰) کچھ لوگ یہ دھوکا دیتے ہیں کہ نجی معاملات میں ریڈیو ٹیلیفون کی خبر پر سب اعتماد کرتے ہیں۔ پھر چاند کے معاملے میں کیوں معتبر نہیں۔ اس کے جواب کی طرف ہم نے

ابتدا ہی میں اشارہ کردیا ہے۔ روزہ اور نماز عید خالص عبادات ہیں۔ اوران کے اوقات کی تعیین اورشناخت کا طریقہ خودشارع علیہ السلام نے مقرر فرمادیا ہے۔ اس میں ترمیم اورتبدیل کا ہمیں یا کسی کوکوئی حق نہیں۔شارع علیہ السلام نے جیسے بتایا ہے اسی کے مطابق عمل واجب ہے۔ حدیث گزرچکی کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دوسری جگہ سے آئی ہوئی خبر پر شہادت کے بعد اعتماد فرمایا۔ حالانکہ دوسرے نجی معاملات میں ایک شخص کی خبر پر اعتماد فرمالیتے تھے۔ مثلاً کسی کی بیماری موت وغیرہ میں۔ پھر کیا وجہ تھی کہ رویت ہلال کی خبر پر بغیر شہادت کے اعتماد نہیں فرمایا۔ ہم اس کے مکلف ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کریں گے۔ کیوں ایسا حکم ہے اس کے جاننے کے ہم مکلف نہیں۔

علما نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی نے چاند دیکھا مگر کسی وجہ سے اس کی گواہی قاضی نے رد کردی تو اسے جائز نہیں کہ دوسرے دن روزہ چھوڑے اور نماز عید پڑھے، واجب ہے کہ روزہ رکھے۔

عالمگیری میں ہے:

رجل رأی هلال الفطرة ولم تقبل شهادته كان عليه ان يصوم فان افطر كان عليه القضاء دون الكفارة كذا في فتاویٰ قاضی خان.

ایک شخص نے عیدالفطر کا چاند دیکھا اور گواہی دی اور اس کی گواہی قبول نہ ہوئی تو اس پر واجب ہے کہ روزہ رکھے۔ اگر روزہ نہیں رکھا، تو اس پر قضا واجب ہے، البتہ کفارہ نہیں۔

بلکہ اگر گواہی نہ دی تو بھی اس پر دوسرے دن روزہ رکھنا واجب ہے۔ اسی میں اس کے پہلے ہے:

فمن راه وحده لا يفطر اخذا بالاحتياط في العبادة فان افطر قضاه ولا كفارة عليه .

ترجمہ: جس نے عیدالفطر کا چاند تنہا دیکھا تو دوسرے دن روزہ نہ چھوڑے عبادت میں احتیاط کرتے ہوئے۔ اگر روزہ نہیں رکھا تو اس کی قضا کرے۔ البتہ اس پر کفارہ نہیں۔

للہ انصاف: اس نے خود چاند دیکھا۔ اسے یقین ہے کہ کل یکم شوال ہے، روزِ عید

ہے۔ مگر علما فرماتے ہیں عبادت کے معاملے میں احتیاط لازم ہے۔ اس لیے وہ روزہ رکھے۔ یہ نہیں فرماتے کہ عید کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ اس لیے روزہ نہ رکھے بلکہ روزہ رکھنے کو واجب فرماتے ہیں۔ حتیٰ کہ نہ رکھنے پر قضا کا حکم دیتے ہیں۔ اپنی آنکھ سے چاند دیکھنے میں جو قوت ہے، وہ ریڈیو ٹیلیفون کی خبر میں کبھی نہیں۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ تو یہاں بدرجہ اولیٰ روزہ رکھنا واجب ہوگا۔

پھر اپنی آنکھ سے دیکھی ہوئی بات پر ہر شخص عمل کرتا ہے۔ مگر روزے اور عید کے معاملے میں قاضی کا قبول کرنا، اور اس کا حکم دینا ضروری قرار دیا گیا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ یہ خالص عبادت کا معاملہ ہے۔ اس میں شارع علیہ السلام کی اتباع ضروری ہے۔ صحابہ کرام نے ان سواروں سے سن کر روزہ نہیں توڑا جب تک گواہی لے کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم نہیں فرمایا۔

اس طرح مسلمانوں پر لازم ہے کہ کوئی خبر سن کر خود روزہ نہ توڑیں، عید نہ کریں۔ جب تک کہ شہر کا قاضی یا مفتی اعلان نہ کرے۔ اور قاضی مفتی اس کا پابند ہے کہ دوسری جگہ کی آئی ہوئی خبر بغیر شہادت شرعیہ کے نہ قبول کرے۔ جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان صحابہ کرام کی خبر شہادت کے بعد قبول فرمائی۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوْا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۝
(سورہ نساء پ ۵۔ ع ۵۔ آیت ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی، اور اپنے میں سے امر والے کی۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر با ونہ رسیدی تمام بولہبی ست

ہمیں کرنی ہے شاہنشاہ بطحا کی رضا جوئی د
وہ اپنے ہوگئے تو رحمت پروردگار اپنی

☆☆☆

ہلال عید اور ریڈیو

عوام بہت سی جگہ دہلی وغیرہ کے ریڈیو پر کچھ صاحبان کے اعلان پر ۲۹ر ہی کو عید کر لیتے ہیں۔ان لوگوں کو خصوصیت سے اس پر توجہ دینا چاہئے کہ روزہ رکھنا اور نہ رکھنا، رکھ کر توڑ دینا، نماز عید پڑھنا خالص دینی احکام ہیں۔ان کو روز مرہ کے معمولات اور نجی کاروبار پر قیاس کرنا غلط ہے۔اس میں اللہ عزوجل اور رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو طریقہ بتایا ہے، اس کی پابندی ضروری ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک بار ۲۹ر رمضان کو عہد نبوی میں شوال کا چاند نظر نہیں آیا۔ تو صحابہ کرام نے دوسرے دن روزہ رکھا، پھر دوپہر بعد کچھ سوار خدمت اقدس میں آئے اور انہوں نے یہ بتایا کہ ہم نے کل چاند دیکھا ہے۔اور اس کی گواہی دی کہ ہم نے کل چاند دیکھا ہے۔تب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس دن روزہ توڑنے کا حکم دیا۔

(طحاوی: صفحہ ۱۸۸، جلد ا۔مشکوۃ صفحہ ۱۲۸ جلد ا بحوالہ ابوداؤد ونسائی)

صحابہ کرام سے زیادہ سچا اس دور میں کون ہے۔مگر عید کے چاند کے سلسلے میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی بات بھی بغیر گواہی کے قبول نہیں فرمائی۔تو آج کسی کی بھی صرف خبر کیسے قابل قبول ہوگی۔جب تک کہ وہ گواہی نہ دے، پھر محض ریڈیو پر کسی مولوی کا اعلان کیسے قابل قبول ہوگا۔

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے شاگرد کریب شعبان میں دمشق گئے تھے۔رمضان میں واپس آئے، اور حضرت ابن عباس کو یہ بتایا کہ دمشق میں ۲۹ر شعبان جمعہ کو لوگوں نے چاند دیکھا ہے، اور اسی حساب سے وہاں کے لوگوں نے اور خود حضرت معاویہ نے روزہ رکھنا شروع کیا ہے۔حضرت ابن عباس نے کریب سے پوچھا: تم نے چاند دیکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں اور لوگوں نے دیکھا ہے۔اس پر

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہم نے اس کو (۳۰؍شعبان) سنیچر کو دیکھا ہے۔ اسی حساب سے روزہ رکھیں گے۔ یہاں تک کہ تیس کی گنتی پوری کرلیں۔ یا ۲۹؍کو چاند دیکھ لیں۔ اس پر کریب نے کہا کہ کیا آپ کو حضرت معاویہ کا دیکھنا اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ (ترمذی، صفحہ:۸۷ جلد ۱)

مسلمان غور کریں! کریب جلیل القدر تابعی ہیں، وہ خبر دے رہے ہیں کہ دمشق میں چاند ہوگیا ہے۔ رویت عام ہوئی، صحابہ رسول سلطان وقت حضرت معاویہ نے بھی چاند دیکھا ہے، اور اسی حساب سے وہ روزہ رکھ رہے ہیں، مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اسے قبول نہیں فرماتے ہیں۔ تو پھر آج کل کے کسی مولوی یا امام کا دور دراز شہروں سے ریڈیو پر یہ اعلان کرنا کہ فلاں جگہ چاند ہوگیا ہے، دوسری جگہوں میں کیسے قابل قبول ہوسکتا ہے۔

اسی بنا پر فقہا نے فرمایا:

لا لو شهدوا برؤية غيرهم لانه حكاية (درمختار صفحہ:۹۴ جلد ۲)

اگر کچھ لوگ دوسروں کے چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو معتبر نہیں، اس لیے کہ یہ حکایت ہے۔

غور کیجئے! عادل متدین اشخاص سامنے موجود ہوتے ہوئے یہ گواہی دے رہے ہیں کہ فلاں جگہ کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے۔ مگر یہ معتبر نہیں تو دور دراز شہر سے کسی ایک شخص کا اعلان کیسے معتبر ہوگا۔ ریڈیو، ٹیلیفون کی خبروں پر جو لوگ ۲۹؍کا چاند مان کر دوسرے دن روزہ نہ رکھیں گے، یا روزہ رکھ کر توڑ دیں گے، اور نماز عید پڑھ لیں گے وہ ایک نہیں چار گناہ کے مرتکب ہوں گے۔

اول: غیر شرعی طریقہ کو شرعی طریقہ جان کر اعتماد کیا۔

دوم: دوسرے دن تیس رمضان کو روزہ فرض تھا، اسے چھوڑا، یا روزہ رکھ کر توڑا۔

سوم: اس دن نماز عید کے نام سے جو نماز پڑھی، وہ وقت نہ ہونے کی وجہ سے نماز عید نہ ہوئی، اور جس خاص ترکیب کے ساتھ جو نماز پڑھی ویسی کوئی نفل نماز مشروع نہیں تو

ایک غیر صحیح فعل کو عبادت سمجھ کر ادا کیا۔
چہارم: اس گمان پر کہ ہم نماز عید پڑھ چکے ہیں۔ پہلی شوال کو نماز عید نہ پڑھی جو واجب تھی۔
اس طرح واجب کو ترک کیا، تیسویں شب کو تراویح نہیں پڑھی، تو اس سے محرومی اور تداعی کے ساتھ نفل نماز پڑھی، یہ مزید برآں۔
مذکورہ بالا باتوں کو بغور پڑھیے اور حکم شرعی میں اپنی سمجھ سے مداخلت کر کے ان گناہوں سے بچیے۔ اس موقع پر کچھ لوگ یہ پروپیگنڈہ کر کے روزہ توڑ ڈالتے ہیں کہ عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عید کے دن روزہ رکھنا مکروہِ تحریمی ناجائز و گناہ ہے۔ لیکن پہلے یہ ثابت تو ہولے کہ یہ دن عید کا ہے، جب یہ ثابت ہی نہیں کہ یہ دن عید کا ہے تو روزہ کی ممانعت کا پروپیگنڈہ ہی غلط ہے۔ مزید اطمینان کے لیے گزارش ہے کہ ایک جگہ والوں کو دوسری جگہ والوں کی رویت پر اعتماد کر کے روزہ چھوڑنا یا توڑنا نماز عید پڑھنی اسی وقت جائز ہے۔ جب شریعت کے مقرر کردہ قواعد کے مطابق ثبوت ملے، اور اس ثبوت کے صرف پانچ طریقے ہیں:
عینی شاہدوں کی شہادت، شہادت علی الشہادۃ، شہادت علی القضا، کتاب القاضی الی القاضی، استفاضہ۔
شامی جلد ۲ صفحہ: ۹۶ میں ہے:

کان یتحمل اثنان الشهادة او یشهدوا علی حکم القاضی او استفاض الخبر بخلاف ما اذا اخبر ان اهل بلدة کذا راوه لانه حکایة .

یعنی دو شخص گواہی دیں یا دو شخص قاضی کے فیصلے کی گواہی دیں یا استفاضہ خبر ہو جائے۔ بخلاف اس کے دو شخصوں نے یہ خبر دی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے، اس کا اعتبار نہیں، اس لیے کہ یہ حکایت ہے۔
ریڈیو میں صرف یہی ہوتا ہے کہ کوئی ایک شخص خبر دیتا ہے کہ فلاں جگہ چاند ہوا نہ اس میں خبر دینے والا سامنے موجود ہوتا ہے، اور نہ دو ہوتے ہیں، اور نہ گواہی دیتے ہیں، پھر اس

کے معتبر ہونے کا سوال نہیں۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ گاؤں کے بے پڑھے لکھے، سرمایہ دار، ذی اثر حتی کہ بعض مسجدوں کے عہدیداران امام کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ تیس رمضان کو نماز عید پڑھائے ورنہ امامت سے الگ کر دیا جائے گا۔ ملازمت کی لالچ میں بہت سے خدا نا ترس اماموں نے روزہ رکھ کر نماز عید پڑھائی ہے۔ عوام کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس صورت میں نماز عید قطعا نہیں ہوئی۔ ان کی ضد اور ہٹ تو پوری ہوئی، مگر سب لوگ نماز عید سے محروم رہے، ائمہ مساجد پر فرض ہے کہ وہ خدا کا خوف کریں۔ رزاق، مسجد کے ممبران نہیں اللہ عزوجل ہے۔ ایسے موقع پر استقامت اختیار کریں۔ اور ریڈیو کی خبر پر ہرگز ہرگز نماز نہ پڑھائیں۔ انشاء اللہ! اللہ کی مدد ان کے شامل حال ہوگی۔ واللہ اعلم

(ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور اپریل ۱۹۸۸ء صفحہ: ۷تا۹)



ایک پیغام

ریڈیو سے چاند کا اعلان کرنے والوں کے نام

حضرت فقیہ عصر شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمۃ والرضوان نے رویت ہلال کے سلسلہ میں عوامی بے احتیاطیوں اور دیابنہ و وہابیہ کی ریشہ دوانیوں پر تحریری طور سے عامۂ مسلمین کو متعدد بار متنبہ فرمایا اور حکم شرعی سے آگاہ کیا۔ آپ کی یہ قابل قدر تحریری کوششیں اپنے اپنے موقع سے منظر عام پر آتی رہیں۔ اب انہیں سن اشاعت کی ترتیب سے یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس میں بعض مباحث مکرر بھی ملیں گے۔ لیکن ان میں چوں کہ ایک خاص ترتیب اور اپنے محل کی مخصوص افادیت تھی، اس لیے انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ اب یہ چار مقالے نذر قارئین ہیں۔ کاش مسلمان احکام شرع پر کاربند ہو جائیں۔ (مرتب)

یہ حقیقت ہے کہ عید کے چاند کا مسئلہ اب بہت سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ ریڈیو سنتے ہی عوام بے قابو ہو جاتے ہیں، اور مسجدوں اور مدرسوں میں ایسے لوگوں کی یلغار شروع ہو جاتی ہے، جنہیں نماز و روزہ سے کوئی مطلب نہیں وہ ہڑتال کرانے والے سیاسی ورکروں کی طرح زبردستی عید کی نماز پڑھوانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ عید کی نماز اور چاند کا مسئلہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں جسے عوامی دباؤ کی بنیاد پر طے کیا جائے۔ یہ مسئلہ شریعت کے ضابطوں کی روشنی میں صرف علما کے طے کرنے کا ہے۔ لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خالص مذہبی مسئلہ سوسائٹی کے ہنگامہ پسند اور غیر ذمہ دار لوگوں کی ہلڑ بازی کا نشانہ بنتا جا رہا ہے۔ لوگوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ یہاں حکومت کی طرف سے چاند کے اعلانات کا کوئی بندوبست نہیں ہے، جو شریعت کے مقرر کردہ ضابطوں کی پابندی کرتا ہو، لہذا مقامی علما اور ائمہ مساجد کو جب تک اپنے طور پر چاند کے شرعی ثبوت کا

اطمینان نہ ہو جائے وہ صرف عوام کے دباؤ پر لاکھوں مسلمانوں کے روزے توڑ ڈالنے کی ذمہ داری کیوں کر قبول کر سکتے ہیں؟

کچھ لوگ اپنی بات منوانے کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ پہلے شرعی طور پر وہ عید کا دن بھی تو ثابت ہو۔ اس مقام پر یہ نکتہ نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ آنے والے دن کا رمضان ہونا یقین کی منزل میں ہے کہ رمضان کا سلسلہ پہلے ہی سے قائم ہے اور شرعی اصول کے مطابق یقین شک سے زائل نہیں ہوتا۔ لہذا جب تک عید کے چاند کی شہادت شرعی یقین کے اجالے میں نہیں آجاتی، فرض روزے کا توڑنا کیسے جائز ہوگا۔

اس بحران کا حل تلاش کرنے کے لیے ۱۱، ۱۲، جولائی ۱۹۸۶ء کو علمائے اہل سنت کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں طے کیا گیا کہ چاند کے مسئلے کو عوام کی بے جا مداخلت سے کیوں کر بچایا جائے۔ اس اہم مقصد کے لیے دوسرے ان علما سے بھی رابطہ قائم کیا گیا جو بالعموم اس معاملے میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ تاکہ اس مسئلے کا کوئی بہتر حل سامنے آسکے۔ ذیل میں ان کے نام پیش کیے جا رہے ہیں، جن کے نام آل انڈیا شرعی بورڈ کے معتمد فقیہ عصر حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی نے یکے بعد دیگرے دو خطوط روانہ کیے۔

۱۔ مولانا عبد اللہ بخاری امام جامع مسجد، دہلی

۲۔ مولانا مفتی مکرم احمد امام جامع مسجد فتح پوری، دہلی

۳۔ مولانا منت اللہ رحمانی، مونگیر

۴۔ مولانا حبیب الحلیم فرنگی محلی، لکھنؤ

۵۔ مولانا عون احمد، پھلواری شریف

۶۔ مولانا ضیاء الدین بخاری، ممبئی

۷۔ حافظ محمد صابر امام ناخدا مسجد، کلکتہ

اب خطوط کی نقل ملاحظہ ہو جن کے جوابات کا انتظار ہے۔

پہلا خط

باسمہ تعالیٰ

۳۱؍جولائی ۱۹۸۶ء مکرمی زید کرمہ...............بعد ماہو المسنون!

سب سے پہلے آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ نئے حوادث اور اہم مسائل میں شرعی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے ۱۹۸۵ء میں ملک کے مشاہیر علمائے اہل سنت کے نمائندہ اجتماع میں "کل ہند شرعی بورڈ" کے نام سے ایک مجلس کی تشکیل عمل میں لائی گئی، جس کا مرکزی دفتر ملک کی شہرۂ آفاق درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ میں قائم کیا گیا۔

اس تعارفی تمہید کے بعد گزارش ہے کہ آپ حالات کی اس سنگینی سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ ہلالِ عید کے مسئلے میں ہر سال مسلمانانِ ہند بحران کا شکار ہوتے ہیں، عید منانے اور نہ منانے کے سلسلے میں عوام کے درمیان اتنی سخت قسم کی ہنگامہ آرائی ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ عوامی بے چینیوں کا یہ سارا مظاہرہ ریڈیو کے اعلان کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

انہیں حالات کے پیش نظر متفقہ طور پر عید منانے کے لیے کل ہند شرعی بورڈ کی ایک میٹنگ ۱۲؍جولائی ۱۹۸۶ء کو مبارک پور منعقد ہوئی، جس میں طے کیا گیا کہ ملک کے وہ چند مذہبی مشاہیر جو اپنے شہر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے چاند کا اعلان نشر کراتے ہیں ان سے رابطہ قائم کر کے شرعی ضابطوں کی روشنی میں ان سے اس مسئلے میں صحیح معلومات حاصل کی جائے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ عوام کو ہلال عید کے مسئلے میں انتشار سے بچانے کے لیے افہام وتفہیم کا موقع نکالنا از بس ضروری ہے۔ آپ کا جواب موصول ہونے کے بعد ہم ان نکات کی فہرست آپ کو ارسال کریں گے جن پر تبادلۂ خیال کی ضرورت ہم محسوس کرتے ہیں۔

ازراہِ کرم پہلی فرصت میں امید افزا جواب سے مندرجہ ذیل پتے پر ممنون فرمائیں۔

محمد شریف الحق امجدی

معتمد: کل ہند شرعی بورڈ۔ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور اعظم گڈھ (یوپی)

دوسرا خط

۱۵/اگست ۱۹۸۶ء

مکرمی..........

بعد ماھوالمسنون!

۳۱/جولائی ۱۹۸۶ء کے مکتوب میں اعلان رویت ہلال عید کے سلسلے میں جن نکات پر آپ سے معلومات حاصل کرنے کا ہم نے ذکر کیا تھا۔ آج وہ نکات آپ کو ارسال کر رہا ہوں، از راہِ کرم شرعی اصولوں کی روشنی میں ہر نکتے کا اطمینان بخش جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

وضاحت طلب نکات

۱) ریڈیو کے ذریعہ آپ اپنے فیصلے کا اعلان پورے ملک کے لیے کرتے ہیں، یا صرف اسی خطہ کے لیے جہاں سے اعلان نشر ہوتا ہے۔ اگر آپ کا اعلان پورے ملک کے لیے ہوتا ہے تو از راہِ کرم کوئی ایسی شرعی دلیل پیش کیجیے جس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہو کہ رویت ہلال کے سلسلے میں کسی قاضی کا فیصلہ بیک وقت پورے ملک میں نافذ ہو سکتا ہے۔

۲) آپ اپنے فیصلے کا اعلان اپنی ذاتی حیثیت میں کراتے ہیں یا قاضی کی حیثیت سے۔ اگر ذاتی حیثیت میں کراتے ہیں تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر قاضی کی حیثیت سے اعلان کراتے ہیں تو اپنی حدود قضا متعین فرمایئے۔ اور یہ بھی بتایئے کہ سلطان اسلام کی غیر موجودگی میں کسی ملک کے یا کسی خطے کے لیے قاضی مقرر کرنے کا شرعی ضابطہ کیا ہے؟ نیز اگر آپ کی حدودِ قضا میں پورا ملک شامل ہے تو اس بات کی وضاحت فرمایئے کہ آپ کو پورے ملک کے لیے قاضی کن لوگوں نے نامزد کیا۔

۳) رویت کا شرعی ثبوت مل جانے کے بعد آپ اپنے فیصلے کا اعلان کس طرح کرتے ہیں، ریڈیو پر خود جا کر بولتے ہیں یا ریڈیو کے اناؤنسر کو اعلان لکھ کر دے دیتے ہیں۔

اگر اناؤنسر کے ذریعہ اعلان کرتے ہیں تو اعلان کے الفاظ سے مطلع فرمایئے۔

۴) کسی غیر مسلم اناؤنسر کے ذریعہ ہلال عید کا اعلان کیا شرعاً قابل اعتماد ہوسکتا ہے؟ اگر ہوسکتا ہے تو اس کے ثبوت میں کوئی شرعی دلیل پیش فرمایئے۔

۵) یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہلالِ عید سے متعلق آپ اپنے فیصلے کا اعلان ریڈیو کے ذریعہ اسی لیے نشر کراتے ہیں کہ باہر کے لوگ آپ کے اعلان پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا روزہ توڑ دیں، اور عید منائیں۔ لیکن تجربات شاہد ہیں کہ ریڈیو والے غلط اعلان بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ آج سے چند سال پیشتر آنجہانی جے پرکاش نارائن کی موت کی خبر ریڈیو والوں نے غلط نشر کردی تھی، جس کی بعد میں انہیں تصحیح کرنی پڑی، اور یہ واقعہ بالکل تازہ ہے کہ ریڈیو والوں نے ۴ر جولائی ۱۹۸۶ء کو آنجہانی جگ جیون رام کی موت کی خبر بھی غلط نشر کردی تھی، جیسا کہ یہ مسئلہ پارلیمنٹ میں بھی زیر بحث آچکا ہے، اور اس کی انکوائری ہورہی ہے کہ غلط خبر کیسے نشر ہوگئی۔ جب ملک اور حکومت کی مرکزی شخصیتوں کے معاملے میں ریڈیو والے اتنی فاش غلطیاں کرتے ہیں تو مسلمانوں کے معاملے میں بالخصوص مذہبی امور میں ان کی خبروں پر کیوں کر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

ان حالات میں ریڈیو کے ذریعہ اپنے اعلان کو قابل اعتماد بنانے کے لیے آپ نے سرکاری سطح پر کیا انتظام کیا ہے؟ اس کی تفصیلات سے مطلع فرمایئے۔ نیز فتوے کی زبان میں اس کی بھی وضاحت فرمایئے کہ ان حالات میں جب کہ ریڈیو کا سارا محکمہ اہل کفر وفسق کے ہاتھوں میں ہے، ان کے اعلانات پر اعتماد کرکے روزہ توڑنا اور عید منانا از روئے شرع کہاں تک درست ہے؟

۶) کیا رویت ہلال کی شہادت آپ ٹیلیفون کے ذریعہ بھی قبول فرماتے ہیں، اگر قبول کرتے ہیں تو اس بات کی کوئی شرعی دلیل پیش کیجئے کہ غائب کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے۔

۷) کیا ٹیلیفون کے ذریعے بھی آپ فیصلے کی خبر اپنی حدودِ قضا سے باہر کے علاقوں تک پہنچاتے ہیں، اگر پہنچاتے ہیں تو اس بات کے لیے شرعی دلیل پیش کیجئے کہ اپنی حدودِ قضا

سے باہر بھی کسی قاضی کا فیصلہ نافذ ہوسکتا ہے؟

۸) اگر کسی دوسرے شہر کا قاضی ٹیلیفون کے ذریعہ اپنے فیصلے کی خبر آپ کو دے تو آپ اپنے شہر میں اس خبر پر عمل کرنا جائز سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اگر جائز سمجھتے ہیں تو اس پر کوئی دلیل قائم فرمائیں۔

۹) آپ کے نزدیک اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟ اگر اعتبار نہیں ہے تو سعودی عرب، پاکستان، اور بنگلہ دیش اور دوسرے ممالک اسلامیہ کے قاضی کے اعلان پر ہندوستان کے مسلمانوں کو از روئے شرع روزہ توڑنا اور عید منانا جائز ہے یا نہیں؟

محمد شریف الحق امجدی
معتمد: کل ہند شرعی بورڈ
الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

(ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، ستمبر ۱۹۸۶ء صفحہ: ۲۸ تا ۳۱)

اس تحریر کے وضاحت کا طلب نکات ماہنامہ ''سنی دنیا'' بریلی شریف ستمبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں بھی ''کل ہند شرعی بورڈ کی معروضات'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔



شرعی عید اور عرفی عید

(امسال ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۹) بھی عید کے معاملے میں اختلات ہو گیا اور وہ بھی ایک اہم خط فاصل کے ساتھ دیوبندی مذہب کے افراد نے ۲۹ر کا چاند مان کر ۱۹ر جنوری منگل کو عید کی۔ حتی کہ افریقہ وغیرہ میں بھی یہی ہوا، اور اقل قلیل اہل سنت نے بھی رو میں آ کر ایسا ہی کیا۔ لیکن اہل سنت و جماعت کی اکثریت نے پورے ملک میں بلکہ پوری دنیا میں ۲۰ر جنوری بدھ کو ۳۰ کے حساب سے عید کی۔ ہمارے یوپی کے کچھ بڑے بڑے شہروں میں بھی ۲۹ کے حساب ہی سے عید ہوئی لیکن سب کا مدار لکھنؤ یا دلی کے ریڈیو کی خبر پر تھا۔ امسال ایک خاص بات یہ رہی کہ یوپی میں کچھ جگہوں پر مطلع بالکل صاف تھا مگر اکثر جگہوں پر چاند نظر آیا، یا وہاں چند دیکھنے کی خبر مشہور ہوئی تو دیکھنے والے اکثر دیوبندی ہی تھے البتہ ہمارے ضلع میں دو ایک دیوبندی نے اپنی روحانی قوت سے تہ بہ تہ بادلوں کے پیچھے سے بھی چاند دیکھ لیا۔ جس پر پورے ضلع کے دیوبندیوں نے عید کر لی۔ بہر حال! ہمیں دیوبندی مذہب سے غرض نہیں ہمارا مذہب الگ، ان کا مذہب الگ۔ وہ جب چاہیں جیسے چاہیں عید کر لیں۔ ہمارا مقصود اس میں مضمون سے اہل سنت و جماعت کے افراد کو یہ بتانا ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آخر ہم لوگ شاہی امام دہلی جیسے شہرت یافتہ شاہی امام کا فیصلہ کیوں نہیں مانتے۔ ہمارے گریجوئت طبقہ اسکولوں کالجوں یونیورسٹی کے ماسٹران، پروفیسران، بیرسٹران، ڈاکٹران اس سلسلے میں علما پر سخت تنقیدیں کرتے ہیں کہ کہ موت وزیست آمد ورفت وغیرہ ہر معاملے میں ریڈیو ٹیلی فون کی خبر معتبر ہے پھر چاند کے معاملے میں کیوں معتبر نہیں۔ ان کے لہجے میں اس کا جواب یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کو ناتھورام گوڈسے نے قتل کیا اور اس وقت ملک کی سب سے بڑی شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم نے ریڈیو اسٹیشن سے اعلان کیا کہ ہمارے باپو کو ناتھورام گوڈ سے نے قتل کر دیا لیکن حیرت ہے کہ صرف ان کے علان پر گوڈسے کو سزا نہیں دی گئی جب تک کہ وزیر اعظم سے بہت کمتر درجے کے جج کی کچہری میں قانونی طور پر گواہوں نے آکر چشم دید گواہی نہیں دی۔ آخر بات کیا ہے؟ اس پر نہایت ہی طنز آمیز لہجے میں گریجویٹ حضرات

فرماتے ہیں کہ قتل کے کیس اور چاند کے ہونے نہ ہونے میں کیا علاقہ؟۔

ہمیں افسوس ہے کہ ایسی بات وہ لوگ کہتے ہیں جو اپنے آپ کو معزز مسلمان سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک روزہ و نماز آلو ٹماٹر کے برابر ہے کہ فون پر بھاؤ آگیا تسلیم کر لیا گیا۔کاش!وہ لوگ مذہب کی روح سمجھتے ،نماز روزے کی اہمیت جانتے ،تو نماز وزے کو آلو ٹماٹر کے برابر نہیں جانتے ۔اب آیئے ہم سے سنیے۔شوال کے چاند کا معاملہ بہت اہم ہے۔ایک طرف یہ ہے کہ عید کے دن روزہ رکھنا گناہ ہے مگر یہ ایک گناہ ہے دوسری طرف یہ ہے کہ اگر ۲۹ر کا چاند ثابت نہیں اور کسی نے دوسرے دن روزہ نہیں رکھا اور عید کر لی تو چار چار گناہ کا مرتکب ہوا۔

(۱) غیر شرعی طریقہ کو معتبر مان کر اس پر عمل کیا یہ ایک گناہ ہوا۔

(۲) دوسرے دن روزہ فرض تھا،اسے چھوڑا یہ دوسرا گناہ ہوا۔

(۳) اس دن ۳۰ ر رمضان تھی اور نماز عید پڑھ لی ،جس کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا تو یہ نماز عید نہ ہوئی نفل ہوئی،اور جس طرح نماز عید پڑھی جاتی ہے اس طرح کوئی نفل نماز مشروع نہیں تو جو چیز حقیقت میں صحیح نہیں اسے عبادت سمجھ کر کیا یہ تیسرا گناہ ہوا۔

(۴) یکم شوال کو نماز عید واجب تھی اسے پڑھا نہیں ،یہ چوتھا گناہ ہوا۔

دیو بندی مذہب کے افراد اپنے مذہب کے مطابق چاند کی اعلان کر کے یہ چلاتے چلاتے گلا پھاڑ لیتے ہیں کہ آج عید ہے،عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔اہل سنت کو چاہیے کہ ان کے جواب میں یہ بھی اعلان کریں کی کہ آج ۳۰ ر رمضان ہے۔آج روزہ رکھنا فرض ہے۔آج کے دن روزہ چھوڑنا نماز عید پڑھنا،چار چار گناہوں کا مجموعہ ہے۔

آگے بڑھیے اہل سنت بغور ملاحظہ فرمائیں!نماز و روزہ آلو ٹماٹر کے مثل نہیں۔یہ دونوں عبادت ہیں اور ان دونوں کے لیے من جانب اللہ وقت مقرر ہے،اور اس وقت کے جاننے کا طریقہ بھی شریعت نے چاند کے ثبوت کے لیے جب کہ مطلع صاف ہو یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اتنی بڑی جماعت چاند دیکھے جن کی خبر پر یقین حاصل ہو جائے کہ واقعی چاند ہوا ہے،اکھٹے اتنی آدمی جھوٹ نہیں بول سکتے ۔دو چار آمیوں کے کہنے سے کہ ہم نے چاند

دیکھا ہے ثبوت نہیں ہوگا۔ جیسا کہ امسال بہت سی جگہوں پر ہوا ہے اگر مطلع نا صاف ہو تو رمضان کے علاوہ ۱۱ مہینے کے چاند کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں قاضی کے پاس آکر گواہی دیں کہ ہم نے اس سال فلاں وقت فلاں دن فلاں مہینے کا چاند دیکھا ہے۔ مثلا اس سال کے بارے میں یہ کہے میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھ سے اس سال کے شوال کا چاند کل، یا آج مغرب سے قبل یا مغرب کے بعد دیکھا ہے۔ وہ بھی قاضی کے سامنے آکر اس میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ اول: خاص یہ لفظ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں اور اگر خاص یہ لفظ نہ کہے اور اس کی جگہ کچھ اور کہے میں قسم کھاتا ہوں، میں حلف اٹھاتا ہوں میں حلفیہ بیان دیتا ہوں معتبر نہیں۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ بیان حلفی الگ چیز ہے اور گواہی الگ چیز۔ دوسرے یہ کہ ایسا لفظ ضرور کہے جس سے متعین ہو جائے کہ جس مہینے کے چاند کے بارے میں نزاع ہے اسی کے بارے میں یہ گواہی دے رہا ہے۔ مثلا اگر کہا کہ میں نے شوال کا چاند دیکھا ہے تو بے کار۔ جب تک تعیین نہ کرے الفاظ کے ذریعہ سے کہ اس سال کے شوال کے متنازع چاند کی گواہی دے رہا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جب تک وہ بات معین نہ ہو جس کے بارے میں گواہی دی جا رہی ہے گواہی بے کار ہے۔ گواہی میں قیاس اور غلبہ ظن سے استخراج مفید نہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ اس صورت خاص میں گواہی کی ضرورت ہے، ایسا کیوں ہے، اس خصوص میں فقہائے کرام کے عقلی استدلالات سے قطع نظر کرتے ہوئے حدیث پیش کرتا ہوں:

امام ابو داؤد اور امام ابو عبد اللہ یزید بن ماجہ قزوینی نے اپنے سنن میں اور امام ابو جعفر طحاوی نے شرح معانی الآثار میں یہ حدیث روایت کی، واللفظ للطحاوی:

ان الھلال خفی علی الناس فی آخر شھر من رمضان فی زمن النبی ﷺ فاصبحوا صیاما فشھدوا عند النبی ﷺ بعد زوال الشمس انھم رأو الھلال اللیلۃ الماضیۃ فامر رسول اللہ ﷺ الناس بالفطر وافطروا تلک الساعۃ و خرج بھم من الغد صلاۃ العید. (جلد اول: ص ۱۸۸)

رمضان کے مہینے کے اخیر دن چاند لوگوں سے چھپ گیا دوسرے دن سب لوگوں نے روزہ رکھا اس کے بعد کچھ لوگوں نے زوال کے بعد نبی ﷺ کی خدمت میں گواہی دی کہ ان لوگوں نے گزشتہ رات چاند دیکھا ہے اس پر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ روزہ توڑ دیں، سب لوگوں نے اسی وقت روزہ توڑ دیا، دوسرے دن صبح کو عید کی نماز پڑھائی۔ ابوداؤد میں ہے جاء رکب کچھ سوار آئے۔ جو یہ گواہی دے رہے تھے ابن ماجہ میں بعد زوال الشمس کے بعد ہے آخر النہار۔ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔

اب یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ یہ چاند کی خبر لانے والے صحابہ کرام تھے اور وہ بھی ایک نہیں کم از کم تین مگر حضور اقدس ﷺ نے صرف ان کی خبر پر اکتفا نہیں فرمایا۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ صحابہ کرام جھوٹ بولیں گے وہ بھی حضور ﷺ کے سامنے جب کہ صحابہ کا عالم یہ تھا کہ عہد رسالت میں کھل کر اپنی عورتوں سے بات چیت نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے صرف خبر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب ان لوگوں نے گواہی دی تو قبول فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عید کے چاند کی رویت کے ثبوت کے لیے جب مطلع نا صاف ہو بقدر نصاب چاند دیکھنے والوں کی گواہی ضروری ہے، اور اسی کے حکم میں دوسرے مہینے بھی ہیں۔ البتہ رمضان کا چاند مستثنیٰ ہے جب کہ مطلع نا صاف ہو تو صرف ایک مسلمان کی خبر کافی ہے، جب کہ یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ فاسق ہے جیسا کہ دوسری حدیث سے ثابت ہے۔

جب عید کے چاند کے ثبوت کے لیے شہادت شرط ہوئی تو محض خبر کا اعتبار ساقط، خواہ وہ خبر دینے والے کوئی بھی ہو، خواہ وہ خبر کسی شخص کی ہو، حتیٰ کہ اگر دو چار آدمی کسی شہر سے آکر یہ خبر دیں بلکہ یہ شہادت بھی دیں کہ فلاں جگہ کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے بلکہ تعین بھی کردیں فلاں فلاں لوگوں نے چاند دیکھا ہے تو معتبر نہیں۔

ردالمحتار میں حموی سے ہے:

بخلاف ماإذا اخبر ان اهل بلدة كذا رأوه لانه حكاية.

اگر دو شخصوں نے یہ خبر دی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے دیکھا تو معتبر نہیں اس لیے کہ یہ حکایت ہے۔ (شہادت نہیں۔)

درمختار میں ہے:

لالو شهدوا برؤية غيره لانه حكاية.

دوسرے لوگوں کے چاند دیکھنے کی بہت سے لوگوں نے گواہی دی تو معتبر نہیں اس لئے کہ یہ حکایت ہے۔(شہادت نہیں)

تو جب کہ دو چار ثقہ متدین افراد کی یہ شہادت وہ بھی قاضی کے سامنے حاضر ہو کر معتبر نہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ فلاں فلاں لوگوں نے ۲۹ر کا چاند دیکھا ہے تو ریڈیو ٹیلی فون کی خبر کیا معتبر ہوگی؟ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ریڈیو سے غلط خبر شائع ہوگئی۔ایک سال ریڈیو سے خبر نشر ہوئی کہ ممبئی میں ۲۹ر کا چاند ہو گیا ہے، اور یہاں کل عید ہے لیکن واقع میں اس سال ممبئی میں ۳۰ر کے اعتبار سے عید ہوئی۔

چند سال پہلے کی بات ہے آل انڈیا ریڈیو سے ۲۸ر رمضان گزار کر رات میں یہ خبر نشر ہوئی کہ امام شاہی مسجد دہلی نے اعلان کر دیا ہے کہ آج شوال کا چاند ہو گیا ہے کل عید ہے اور ان کے ماننے والوں نے عید کر ڈالی۔ جب کہ اس تاریخ کو چاند کی رویت ممکن ہی نہیں۔اور عید بالکل ہی غلط۔ باطل اور حرام ہوئی۔مگر جہالت اور روزہ گھٹانے کے شوق کا کیا علاج؟ بہر حال! یہ تو عارضی باتیں ہیں بنیادی بات وہی ہے جو میں نے پہلے تحریر کی کہ اس بارے میں محض خبر بنص حدیث معتبر نہیں۔اگر چہ خبر دینے والے ثقہ متدین ہوں یا ریڈیو یا ٹیلی فون سے کوئی بہت بھاری بھرکم شخصیت اعلان کرے، اور یہی فقہائے کرام کی تصریحات سے ثابت ہے اس لیے جن لوگوں نے ریڈیو ٹیلی فون کی خبر سے امسال ۱۹ر فروری منگل کے دن روزہ نہیں رکھا یا رکھ کر توڑ دیا اور اسی دن نماز عید پڑھ لی وہ ایک نہیں چار، چار گناہ کے مرتکب ہوئے۔ مطلع صاف ہونے یا رویت سے کوئی مانع ہونے کی صورت میں دوسری جگہ کے چاند

کے معتبر ہونے کے لیے پانچ طریقے ہیں:۔

اول: جن لوگوں نے چاند دیکھا ہے وہ خود قاضی کے سامنے حاضر ہو کر گواہی دیں اور سب کے سب لائق قبول شہادت ہوں اور کم از کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔

دوم: شہادت علی القضا: دو شخص قاضی کے اجلاس میں موجود تھے، ان کے سامنے بقدر نصاب گواہوں نے آکر قاضی کے سامنے گواہی دی کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے اس کے مطابق قاضی نے حکم دے دیا پھر یہ دونوں شخص دوسرے شہر کے قاضی کے پاس آئیں اور قاضی کے اجلاس میں گواہی دیں کہ فلاں شہر کے قاضی کے یہاں ہماری موجودگی میں گواہان بقدر نصاب نے یہ گواہی دی کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے اور قاضی نے ان کی گواہی قبول کر کے اس کے مطابق حکم دے دیا ہے۔

سوم: شہادت علی الشہادت: کسی شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ان دیکھنے والوں میں سے کم از کم مثلا دو مردوں نے، دو مردوں کو اپنی شہادت کا شاہد بنایا۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ ان دو مردوں کے سامنے چاند دیکھنے والوں میں سے ہر ایک یوں کہے میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے امسال کے شوال کا چاند کل یا فلاں روز دیکھا ہے، اور میں تم دونوں کو اپنی اس گواہی پر گواہ بناتا ہوں۔ پھر دوسرے شاہد دوسرے شہر میں آکر قاضی کے اجلاس میں یوں گواہی دیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں بن فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں بن فلاں ساکن فلاں محلہ فلاں نے ہمارے سامنے یہ گواہی دی کہ امسال شوال کا چاند میں نے کل یا فلاں تاریخ کو دیکھا ہے۔ میں تم دونوں کو اپنی اس گواہی پر گواہ بناتا ہوں۔ اس کے معتبر ہونے کی لیے چند شرطیں ہیں:

(۱) اصل گواہ اتنی دور ہوں کہ اس شہر میں آکر گواہی دے کر شام تک گھر نہ پہنچ سکیں اور اس میں اعتبار اوسط چال سے پیدل چلنے کا ہے۔ علما نے میلوں سے اس کی کوئی مقدار نہیں معین کی ہے۔ آج کے پرفتن دور میں یہ ضروری ہے کہ اس کی تعیین میلوں سے کر دی جائے۔ میرا اپنا استنباط یہ ہے کہ یہ فاصلہ ۱۵ رکلومیٹر ۳۳۳ ۱/۳ میٹر ہونا چاہئے۔ یہ استنباط اس پر مبنی ہے کہ مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے جد الممتار میں دلائل قاطعہ سے ثابت فرمایا ہے کہ

مدت مسافت ساڑھے ستاون میل ہے جو موجودہ اعشاریہ میل سے ۹۲ رکلومیٹر ہوتا ہے تو یہ ایک دن کی مسافت ۳۰ رکلومیٹر ۶۶۶ ۲/۳ میٹر ہوئی ۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایک آدمی ایک دن میں پیدل اوسط رفتار سے اتنا چل سکتا ہے جس سے نہ تھک کر چور ہوگا نہ اس کی صحت پر اثر پڑے گا ،اورشریعت میں اس کا اعتبار ہے تو اصل گواہ کو کم از کم اتنی دور رہنا چاہئے کہ آمدو رفت مل کر ۳۰ رکلومیٹر ۶۶۶ میٹر سے کچھ زائد ہو۔

(۲) گواہان فرع یہ ضرور کہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں۔

(۳) اصل گواہوں کے والد اور ان کے دادا کا بھی نام لیں۔ جائے سکونت وتعیین محلہ بھی بیان کریں ۔یعنی ان کا نام اس طرح لیں کہ وہ بالکل معین مشخص ہو جائیں جس میں کوئی شک وشبہ یا التباس نہ رہے۔

چہارم: کتاب القاضی: یعنی قاضی شرع کے سامنے شرعی گواہی گزری اس نے دوسرے شہر کے قاضی کے نام خط لکھا کہ میرے سامنے اس مضمون پر شہادت شرعیہ قائم ہوئی، اوراس خط میں اپنا اور مکتوب الیہ کا نام ونشان پورا لکھا جس سے کافی امتیاز واقع ہواور وہ خط دوگواہان عادل کے سپرد کیا کہ میرا خط فلاں شہر کے قاضی کے نام ہے ۔آپ لوگ اسے باحتیاط بعینہ ان تک پہنچادیں اس کے بعدوہ گواہان باحتیاط اس خط کو مکتوب الیہ کے پاس لائیں اوران الفاظ میں شہادت دیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ خط آپ کے نام فلاں شہر کے قاضی نے ہم کودیا اور ہم کو گواہ کیا کہ یہ خط اس کا ہے تو دوسرے شہر کے قاضی کو اس کی اجازت ہے کہ اس خط کے مطابق فیصلہ کردیں اور بہتر یہ ہے کہ پہلا قاضی خط لکھ کر ان گواہوں کو سنادے اورخط بند کر کے ان کے سامنے سر بمہر کردے اور اولیٰ یہ کہ اس کا مضمون ایک کھلے ہوئے پرچے پر الگ لکھ کر بھی اس کو دے دے کہ اسے یاد کرتے رہیں اور دوسرے قاضی کے سامنے گواہی دیں کہ اس خط میں یہ مضمون ہے۔

فتاویٰ خیریہ میں ہے کہ یہ ضروری ہے کہ قاضی اول گواہوں کے سامنے خط لکھے۔

پنجم: کسی شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور سب بیک زبان اپنے علم سے خبر دیں کہ وہاں فلاں دن چاند دیکھ کر روزہ شروع ہوا یا عید کی گئی ۔محض بازاری افواہ کی خبر اڑ گئی

اور قائل کا پتا نہیں پوچھیے تو یہی جواب ملتا ہے کہ سنا ہے یا لوگ کہتے ہیں، یا بڑی کوشش کی گئی تو کسی نا معلوم مجہول کا پتا بتایا گیا محض بازاری افواہ نامعتبر۔ علما نے اس کے لیے جماعت متعددہ کا لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ اس لیے دو چار آدمیوں کا کہنا معتبر نہیں۔ باری باری ایک ایک دو دو آدمیوں کا کہنا بھی معتبر نہیں۔ جماعت کم از کم تین افراد سے پوری ہوگی اور متعدد اس وقت ہوگی جب کہ کم از کم تین جماعتیں ہوں اس کا حاصل یہ نکلا کہ کم از کم تین تین آدمیوں کی تین جماعتیں آکر یہ خبر دیں کہ ہم فلاں شہر سے آرہے ہیں وہاں کے لوگوں نے ۲۹ر کا چاند دیکھ کر فلاں دن سے روزہ رکھنا شروع کیا ہے، یا فلاں دن عید کی ہے۔

استفاضہ میں جب یہ شرط ہے کہ اس شہر سے متعدد جماعتیں آکر خبر دیں تو معلوم ہوا کہ ٹیلی فون کی خبریں غیر معتبر اور اسی طرح ریڈیو کی بھی۔

پھر اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ جس شہر سے یہ جماعتیں خبر لائیں وہاں کوئی ایسا قاضی و مفتی مرجع خلائق موجود ہو جس کے حکم سے لوگ روزہ رکھتے ہوں اور عید کرتے ہوں وہ خود پابند شرع خدا ترس صاحب استقامت ہو جو دنیا دار روسا کے دباؤ میں نہ آئے ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرے۔ اور لوگ روزہ و عید کے عمل میں اس کے احکام کے پابند ہوں۔

مذکورہ بالا طریقوں کو مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے فتاویٰ رضویہ جلد چہارم میں مطبوع رسالہ مبارکہ "طرق اثبات ہلال" میں بیان فرمایا ہے، اور ہر مسئلے کو کتب فقہ کے حوالے سے مدلل فرمایا ہے، اگر کسی صاحب کو اس پر اطمینان نہ ہو تو کتب فقہ کے رویت ہلال کا باب اور کتاب الشہادۃ کا مطالعہ کر لیں۔ ہم نے ان مضامین کو بالاختصار اپنے ماہنامے میں اس لیے دیا ہے کہ ہر سال شوال کے مہینے میں پوری دنیا سے اس سلسلے میں بے شمار استفتے آتے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد انتہائی افسوس ہوتا ہے۔

ناظرین کی تسکین کے لیے میں صرف ایک مفتی صاحب کی کارکردگی اور قضا کا حال تحریر کر دیتا ہوں۔

امسال ہمارے اطراف ضلع مئو اور اعظم گڈھ کے مطلع پر بہت گہرا بادل تھا،

دیوبندیوں نے تو ۲۹ر کے اعتبار سے عید کرلی کیوں کہ ہمارے دیار کے دیوبندیوں نے اپنے مذہب کا جز بنالیا ہے کہ ہم ۲۹ر ہی کی عید کریں گے۔ اس لیے سارے دیوبندیوں نے ۲۹ر کی عید کرلی۔ اور ایک کوردہ برآمد پور مضافات محمد آباد گوہنہ سے چاند برآمد کرلیا۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے دفتر میں اطلاع ملی کہ غازی پور میں چاند دیکھا گیا ہے جانشین حافظ ملت حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب مدظلہ سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور نے دو افراد کو غازی پور مدرسہ چشمہ رحمت میں بھیجا وہاں کے مفتی صاحب نے جو تحریر ان لوگوں کو دی اس کی نقل لفظ بہ لفظ یہ ہے:

میں تصدیق کرتا ہوں کہ غازی پور میں کئی افراد نے جو متشرع اور دین دار ہیں عینی شہادت دی ہے کہ ہم لوگوں نے شوال کا چاند دیکھا ہے لہذا ان معتبر حضرات کی گواہی سے یہاں رویت کا اعلان کرادیا گیا ہے میں اپنی تحریر مولانا محبوب صاحب اور ماسٹر فیاض صاحب کو پانچ افراد کے سامنے دے رہا ہوں۔ یہاں میرے گھر پر مہر نہ ہونے کے سبب مہر نہیں لگایا ہے۔ دو بجے رات میں تحریر کررہا ہوں۔

الفقیر

جمیل احمد غفرلہ

خادم دار الافتاء مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور

۱۸ر جنوری ۱۹۹۹ء مطابق ۲۹ر رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

اب ناظرین اس تحریر کے عجائبات کو ملاحظہ کریں۔

اول: اس تحریر کو اگر رویت ہلال کے شرعی طریقوں میں سے کسی میں داخل کیا جاسکتا ہے تو وہ کتاب القاضی الی القاضی ہے۔ کتاب القاضی الی القاضی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ قاضی اپنے نام اور پتے کے ساتھ مکتوب الیہ کا نام اور پتا لکھے اور اس عجوبہ روز گار تحریر مین کسی مکتوب الیہ کا نام نہیں۔

دوم: قاضی صاحب نے یہ نہیں ظاہر کیا کہ مطلع صاف تھا یا ناصاف۔ مطلع اگر صاف تھا تو اتنی بڑی جماعت کا دیکھنا ثبوت کے لیے ضروری تھا جن کی خبر پر غلبہ ظن ملحق بہ

یقین حاصل ہوجائے۔کئی افراد کا صدق دو تین پر بھی ہوسکتا ہے جب مطلع صاف ہوتو دو تین پانچ دس کی بھی گواہی نامعتبر۔ میں نے بعد میں پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ غازی پور میں مطلع صاف تھا اس لیے کئی افراد کی گواہی مسترد۔

سوم: گواہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے شوال کا چاند دیکھا ہے۔ کس دن، کس تاریخ میں دیکھا ہے غائب۔

چہارم: کس سن کے شوال کا چاند دیکھا ہے غائب۔

پنجم: آگے قاضی صاحب لکھتے ہیں: یہاں رویت کا اعلان کردیا گیا۔ کس وقت کی رویت کا اعلان ہے غائب۔

ششم: کس مہینے کی رویت کا اعلان کردیا گیا ہے غائب۔

ہفتم: عجب العجاب تحریر لکھنے کا وقت لکھا ہے۔ دو بجے رات۔ تاریخ لکھی ہے ۱۸/جنوری ۱۹۹۹ء مطابق ۲۹/رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ۔

ناظرین نوٹ کرلیں انگریزی تاریخ ۱۲/ بجے شب سے بدل جاتی ہے اور ہماری تاریخ سورج ڈوبنے کے بعد بدلتی ہے تو قبلہ مفتی صاحب نے عیسوی اور ہجری جو تاریخیں لکھی ہیں اس کے حساب سے لازم آتا ہے کہ انہوں نے یہ تحریر اتوار کا دن گزار کر دوشنبہ کی رات میں دو بجے رات کو لکھی ہے تو لازم آیا کہ ان کی تحریر کے مطابق ان کے سامنے اتوار کا دن گزر کر شام کو جب کہ ۲۸/رمضان المبارک تھی، مغرب سے پہلے یا مغرب کے بعد غازی پور میں چاند ہوا ہے۔ لیکن قبلہ مفتی صاحب نے یہ تحریر دوشنبہ ۱۸/جنوری کا دن گزار کر رات میں ۲/ بجے لکھی ہے۔ جب کہ ۱۹/جنوری شروع ہوچکی تھی۔ اگر واقعی ان کے یہاں اس وقت سے پہلے گزشتہ شام میں چاند ہونے کی شہادت شرعیہ گزری ہوتی تو یہ رات ۲۹/رمضان المبارک کی نہیں ہوتی بلکہ یکم شوال کی ہوتی۔ اور اگر گزشتہ شام کو چاند نظر نہیں آیا تھا تو اس رات کو ۳۰/رمضان المبارک ہوتی نہ کہ ۲۹/رمضان المبارک۔ ہوش وحواس کا یہ عالم اور بیٹھے ہوئے ہیں غازی پور کے منصب افتا وقضا پر۔ اسی کو حدیث میں فرمایا:

واتخذ الناس رؤسا جهالا فافتوا بغير علم فضلوا واضلوا

لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے جو بغیر علم کے فتویٰ دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اسی کو حافظ سعدی شیرازی نے فرمایا:

طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

اس قسم کی ایک اور تحریر دارالافتاء میں آئی ہے۔ طوالت کے خوف سے اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ عوام بھائیوں سے گزارش ہے کہ میں نے ان کو ایک نمونہ دکھایا، اسی قسم کی تحریروں اور خبروں پر آپ علما کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ روزہ توڑنے اور عید منانے کا اعلان کریں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ ۲۹؍روزہ گراں نہیں ہوا اور ایک روزہ چھوڑنے کے شوق میں لوگ خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور علما کو بھی پریشان کرتے ہیں اور بلا ضرورت ٹیلی فون اور پٹرول پھونک کر پیسے برباد کرتے ہیں۔ امسال جامعہ اشرفیہ کے دفتر میں اتنے ٹیلی فون آئے جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ مغرب بعد سے لے کر صبح ۶؍بجے تک ایک منٹ کے لیے فون بند نہیں ہوا، اور یہی حال گھوسی مدرسہ شمس العلوم کے دفتر کا تھا خود میرے نجی ٹیلی فون پر سیکڑوں فون آئے۔ سیدھا سادہ حکم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہے:

صوموا لرويته وافطروا لرويته فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين

چاند دیکھ کر روزہ رکھو چاند دیکھ کر روزہ چھوڑو۔ اگر ۲۹؍کو چاند نظر نہ آئے تو تیس کی گنتی پوری کرو۔

ہمارے سنی بھائی یہ نوٹ کرلیں۔ دیوبندی مذہب ہم سے الگ دوسرا مذہب ہے، ان کے عقائد الگ، ان کے اعمال الگ، جیسے رافضیوں اور قادیانیوں کا مذہب ہے۔ ان کے مذہب کی پیروی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اب دیوبندی مذہب نے طے کر رکھا ہے کہ ۲۹؍ہی کو ہمیشہ عید کیا کریں گے۔ تیس کی کبھی نہیں کریں گے۔ لہٰذا ان کی نہ سنو جن کا تم کلمہ پڑھتے ہو ان کی سنو، مانو اور عمل کرو، ہر مہینہ کی طرح شوال کا چاند بھی کبھی ۲۹؍کو نظر آئے گا، کبھی تیس کو۔ ۲۹؍کو چاند نظر آجائے یا شرعی ثبوت مل جائے فبہا۔ ورنہ تیس کی گنتی پوری کیا کرو۔

لاؤڈ اسپیکر پر اقتدا

جب حضرت شارح بخاری دام ظلہ جامعہ عربیہ انوار القرآن بلرامپور میں تھے تو لاؤڈ اسپیکر کے مسئلہ پر یہ جامع تحریر پیش فرمائی تھی جو ماہنامہ پاسبان مئی ۷۳ء ۱۹ کے شمارے میں شائع ہوئی۔ پھر ۷۸ء ۱۹ میں ایک جامع حکم شرعی تحریر فرمایا جو ماہنامہ اشرفیہ اکتوبر ۷۸ء ۱۹ کے شمارے میں شائع ہوا۔ دونوں تحریریں یکجا کر کے شائع کی جارہی ہیں۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا کرنے والوں کی نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟ یہاں پر ایک صاحب امام ہو کر آئے ہیں، انہوں نے کہا کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز بلا کسی کراہت کے درست ہے۔ یہ بھی کہا کہ بریلی شریف میں اس مسئلہ کے تصفیہ کے واسطے ایک بار علما کی کانفرنس ہوئی جس میں شریک علما میں سے کوئی بھی لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے فاسد ہونے کا ثبوت نہ دے سکے۔ حتی کہ مفتی اعظم ہند نے یہ کہا کہ مجھ بڈھے کی بات بلا دلیل مان لو۔ مع ثبوت اس مسئلہ کا جواب لکھیں اور یہ کہ اس شخص کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں؟ کیا بریلی شریف میں ایسی کوئی کانفرنس ہوئی ہے، اور کیا آپ کے علم و دانش میں حضور مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسیہ نے یہ فرمایا ہے۔ بینوا توجروا

الجواب:۔ نماز جمعہ و عیدین ہو یا پنج گانہ، کوئی بھی نماز ہو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سنی ہوئی آواز پر صحیح نہیں کہ یہ تلقن من الخارج ہے جو بالاتفاق مفسد نماز ہے۔ اور یہ باستثنا دو ایک تمام علمائے اہل سنت کا متفقہ فتویٰ ہے، اس لیے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز کے بارے میں اب تک تین نظریے سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ متکلم کی اصل آواز کے مماثل مشینوں سے پیدا شدہ دوسری آواز ہے، مگر چوں کہ متکلم کی آواز کی لہروں سے مشینوں پر پڑنے ہی سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے وہ متکلم کی آواز کے بالکل مشابہ ہوتی ہے اور سننے والا مختلف بولنے والوں کی آواز میں امتیاز کر لیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ صدا یعنی آواز بازگشت ہے اور یہی ان دو

ایک علما کی بھی تحقیق ہے جو لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا کو جائز کہتے ہیں ۔ تیسرے یہ کہ یہ بعینہ آواز متکلم ہے مگر لاؤڈ اسپیکر کی مشیری اس پر اثر انداز ہوکر اسے کافی حد تک زوردار اور بلند کردیتی ہے، ان تینوں نظریے میں سے جو بھی صحیح ہو، بہر صورت لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا کرنی تلقن من الخارج ہے جو بالاتفاق مفسد نماز ہے۔

ہندیہ میں ہے:

لو سمعه المؤتم ممن ليس في الصلوٰة ففتحه على امامه يجب ان تبطل صلوٰة الكل لان التلقن من خارج كذا في البحر الرائق ناقلا عن القنية .

شامی میں ہے:

لان المؤتم لما تلقن من خارج بطلت صلوته .

لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا تلقن من الخارج کیسے ہے ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے نظریہ کی بنا پر جب کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو متکلم کی آواز کے مماثل دوسری آواز مانا جائے تو تلقن من الخارج ہونا ظاہر ہے، اس لیے اس صورت میں مقتدی امام کی اقتدا نہیں کررہا ہے بلکہ لاؤڈ اسپیکر کی کررہا ہے جو نہ امام ہے نہ امام کا مقتدی بلکہ ایک بے جان مشین ہے، دوسری صورت میں جب کہ اسے صدا یعنی آواز بازگشت مانیں تو تلقن من الخارج اس لیے ہے کہ صدا کو فقہا چڑیوں کی آواز کے ساتھ لاحق کرتے ہوئے تصریح کرتے ہیں کہ صدا سے آیت سجدہ سننے والے پر سجدہ تلاوت نہیں اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ قراءت نہیں محاکات ہے۔

عالمگیری میں ہے:

وان سمعها من الصدىٰ لا يجب عليه كذا في الخلاصة.

درمختار میں ہے:

لا تجب بسماعه من الصدىٰ والطير .

مراقی الفلاح میں ہے:

ولا تجب بسماعها من الصدىٰ .

غنیہ میں ہے:

ولو سمعها من الطائر والصدیٰ لا تجب لأنه کمحاکاة ولیس بقراءة.

طحطاوی علی المراقی میں ہے:

لا اجابة فی الصدیٰ وانما هو محاکات.

ان سب عبارتوں کا ماحصل یہ ہے کہ اگر کسی نے چڑیا یا صدا سے آیت سجدہ سنی تو سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔ اس لیے کہ یہ محاکات ہے قراءت نہیں، تو جب کہ ان معتمد فقہائے کرام نے یہ تصریح کر دی کہ صدائے محاکات ہے قراءت نہیں، اور مجوزین لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو صدا مان رہے ہیں تو انہیں کے تسلیم پر لازم کہ لاؤڈ اسپیکر پر اقتدا یقیناً تلقن من الخارج ہوا اور بلاشبہ لاؤڈ اسپیکر پر اقتدا کرنے والوں کی نماز فاسد ہے۔ یہاں یہ شبہہ نہ کیا جائے کہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے ''الکشف شافیا'' میں صدا کو عین آواز متکلم مانا ہے۔ اس لیے لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو جب صدیٰ مانیں گے تو اس کی اقتدا عین امام کی اقتدا ہے، تلقن من الخارج نہیں، اس لیے کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اگرچہ تصریح کی ہے کہ صدا عین آواز متکلم ہے مگر پھر بھی فقہا کے اس حکم سے اتفاق فرمایا ہے کہ صدا سے مسموع آیت سجدہ پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔ کیا اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے یہاں تضاد بیانی کی ہے۔ اس کی جراءت وہی بے ادب کر سکتا ہے جس نے اعلم علمائے وقت، حبر امت حضرت مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسیہ کو جب کوئی دلیل نہیں ملی تو یہ فرمادیا کہ مجھ بڈھے کی بات بلا دلیل مان لو۔ یا وہ جاہل کہہ سکتا ہے تفقہ جس کے دماغ سے ایسا ہی غائب رہا جیسے گدھے کے سر سے سینگ، تفقہ خاص نعمت خداوندی ہے، یہ اس کو ملتی ہے جو باادب ہو۔ ع

بے ادب محروم شد از فضل رب

اس گتھی کو سلجھانے کے لئے یہ چند امور ذہن میں رکھیں۔ صدا سے سجدۂ تلاوت واجب نہ ہونے کی گفتگو اس صورت میں ہے کہ دیگر موانع مرتفع ہوں ورنہ صدا کی کیا خصوصیت، قاری کی آواز ہی کوئی سن رہا ہو اور دیگر موانع ہوں تو سجدۂ تلاوت واجب نہ ہوگا۔ جب سجدۂ تلاوت واجب ہونے کے تمام عوائق مرتفع ہیں اور یہ عین واجب نہیں مانتے، اس کا

صاف وصریح مطلب یہ ہے کہ بلا توسط صدا قاری کی آواز میں اور بتوسط صدا قاری کی آواز میں باعتبار حکم کے فرق ہے، صدا حکماً عین آواز قاری نہیں بلکہ حکماً محاکات ہے۔ اور اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے اس ارشاد میں کہ عین آواز متکلم ہے کوئی منافات نہیں۔ اور خود اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے ارشاد پر وارد شدہ شبہہ دفع ہوجاتا ہے۔ اس میں سر یہ ہے کہ خود اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے یہ تصریح کی ہے کہ صدیٰ اگر چہ عین آواز متکلم ہے مگر پہاڑ وغیرہ کے ٹکرانے کی وجہ سے بر بنائے اختلاف مذہب، آواز کی لہروں کا پہلا سلسلہ ٹوٹ کر دوسرا سلسلہ پیدا ہوتا ہے یا وہی سلسلہ قدرے توقف کے بعد واپس آتا ہے، درمیان میں صوتی لہروں کا انقطاع وہ علت ہے جو اسے عین آواز متکلم کے حکم سے نکال کر محاکات کے مرتبے میں پہنچادیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے بھی صدا کو عین آواز کے حکم میں نہیں مانا ورنہ ضرور یہ فتویٰ دیتے کہ اس سے سجدۂ تلاوت واجب ہے، اس کا استماع واجب ہے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے صدا کے ذریعہ مسموع آیت سجدہ پر سجدہ تلاوت واجب نہ ہونے اور اس کا استماع واجب نہ ہونے کا فتویٰ ارشاد فرما کر نص کردی کہ صدا حکما محاکات ہی ہے، قراءت نہیں، اور جب صدیٰ حکما محاکات ہے، قراءت نہیں تو اس کی اقتدا کرنی یقیناً تلقن من الخارج اور مفسد نماز ہے، لاؤڈ اسپیکر کی آواز کا صدیٰ ہونا آپ کو بھی تسلیم، اب خود آنجناب کی تسلیم پر ہی لاؤڈاسپیکر کی آواز پر اقتدا کا مفسد نماز ہونا لازم۔ لطف کی بات یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی اقتدا میں نماز صحیح کہنے والے بھی صدا پر سجدۂ تلاوت نہیں مانتے اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کیوں؟ تو آج تک اس کا جواب نہ دے سکے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر اصل وجہ بتادیں تو لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے جواز کا سارا تار و پود بکھر جائے گا۔

رہ گئی تیسری صورت کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا نہیں عین آواز متکلم ہے جسے لاؤڈ اسپیکر کی مشینری طاقت ور اور بلند کر کے پھینکتی ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریے کی بنا پر لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا صحیح ہونا چاہئے۔ اس لیے کہ جب یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ بعینہ متکلم کی آواز ہے تو اس کی اقتدا امام ہی کی اقتدا ہے، تلقن من الخارج نہیں، اس لیے نماز فاسد ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ہر نکتہ رس ذہن رکھنے والا اول نظر میں یہ

جان لے گا کہ اس صورت میں بھی تلقن من الخارج موجود ہے اور نماز کا فساد اپنی جگہ، اس لیے کہ مقتدی تک اگرچہ امام ہی کی آواز پہنچ رہی ہے مگر اس آواز کو پہنچانے مشین نہ امام ہے نہ امام کے مقتدی، بلکہ خارجی چیز ہے۔ اس لیے لاؤڈ اسپیکر پر اقتدا تلقن من الخارج سے خارج نہیں۔ اس لیے اس کی اقتدا سے نماز کے فاسد ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔

ان نظریات کے اختلاف سے قطع نظر کرتے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کی مسافت اور اس کے آلات کی آواز کی اثر اندازی پر جو بھی غور کرے گا اسے ماننا پڑے گا کہ اگر صدا قرأت نہیں محاکات ہے تو لاؤڈ اسپیکر کی آواز بدرجہ اولیٰ قرأت نہیں محاکات کے حکم میں ہے۔ اس لیے کہ صدا کی بہ نسبت لاؤڈ اسپیکر میں آواز پر خارج کا اثر زیادہ ہے کیوں کہ صدا میں تو صرف خارج کا اثر اتنا ہے کہ متکلم کے منھ سے نکل کر مثلاً کسی پہاڑ سے ٹکرائی، اور قوت تصادم کی وجہ سے پلٹ پڑی، اور یہاں تو متکلم کے منھ سے نکل کر مائک میں گئی، مائک سے بجلی کے تار میں پہنچی، بجلی کے تار سے ایمپلی فائر میں پہنچی، ایمپلی فائر نے اپنے آلات کی قید میں لے کر اس پر اپنا پوری طرح اثر ڈالا، ایمپلی فائر سے پھر بجلی کے تار میں گئی، وہاں سے ہارن میں پہنچی، ہارن نے اسے بقوت ہوا میں پھینکا تو کہیں جا کر سامعین کے کان میں آئی۔ صدا میں صرف مثلاً پہاڑ کا تصادم حائل ہو گیا تو اس کی آواز قرأت نہ رہی حکماً محاکات ہو گی، تو لاؤڈ اسپیکر میں ایک نہیں پانچ پانچ خارجی اشیا کے پورے حائل ہونے اور ان سب کے آواز کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لینے اور اس پر اپنی پوری قوت اثر انداز کر لینے کے بعد اس کی آواز ہرگز ہرگز قرأت نہیں رہ سکتی اور ضرور ضرور حکماً محاکات ہو جائے گی۔ اور اس کی اقتدا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتی، اور نماز یقیناً فاسد اور کالعدم ہو گی۔ معلوم نہیں کون کذاب اشر آپ کے یہاں پہنچ گیا ہے جو جھوٹ اور افترا کے پھنکے اڑا رہا ہے اور اعلم علماے وقت حبر امت حضرت مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسیہ کی ارفع واعلیٰ شان میں اتنی دریدہ ذہنی کر رہا ہے۔

بریلی شریف میں اس مسئلے کے لیے کوئی کانفرنس نہیں ہوئی۔ جب ایک مرتبہ دارالعلوم منظر اسلام کے دو مدرسین نے اس مسئلہ پر بہت آفت مچائی اور رسالہ ''نوری کرن'' کے ذریعہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے جواز کا بہت پروپیگنڈا کیا تو عرس رضوی کے موقع پر

چند علمائے کرام نے جن میں مجاہد ملت، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ مدظلہ العالی بھی تھے، یہ تجویز رکھی کہ ان لوگوں کو حضرت مفتی اعظم ہند کی خدمت میں پیش کر کے ان کے شبہات کا ازالہ کر دیا جائے تا کہ ان لوگوں کی خود رائی ختم ہو جائے۔

اختتام عرس کے بعد یہ مجلس ہوئی۔ یہ دونوں استاد و شاگرد آئے۔ حضرت مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسیہ نے ان دونوں کے شبہات کا پوری تحقیق کے ساتھ ازالہ فرمایا، جواز کے دلائل کی دھجیاں بکھیر دیں، لاؤڈ اسپیکر پر عدم جواز کو آفتاب کی طرح روشن فرما دیا۔ کچھ دیر تو یہ لوگ بولتے رہے مگر پھر ایسا چپ ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ منھ میں زبان نہیں۔ سارے علماء کو یقین ہو گیا کہ اب ان لوگوں کی سمجھ میں آ گیا اور یہ اختلاف پسندی کی بنا پر سارے علمائے اہل سنت کے خلاف ہی کہتے رہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز جائز ہے۔

لیکن ایک کے کہنے سے کیا ہوتا ہے جب کہ باستثنا ان کے تمام علمائے اہل سنت متفقہ طور پر فتویٰ دے چکے، اور دے رہے ہیں کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز جائز نہیں۔ تو عوام اہل سنت کو اسی پر عمل کرنا لازم ہے۔

الغرض! دلائل شرعیہ کی روشنی میں یہی محقق ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز قرأت نہیں، بلکہ محاکات کے حکم میں ہے، اس کی اقتدا بلا کسی ادنی شبہہ کے تلقن من الخارج ہے جو باتفاق مفسد نماز ہے۔ یہی فتویٰ حضرت صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی، حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی صاحب قبلہ مصنف بہار شریعت، حضرت محدث اعظم ہند مولانا سید محمد صاحب کچھوچھوی، حضرت تاج العلما مولانا سید محمد میاں صاحب مارہروی، حضرت شیر بیشۂ اہل سنت مولانا حشمت علی خان صاحب لکھنوی، محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد صاحب قبلہ، حضرت مولانا اجمل صاحب سنبھلی، مولانا محمد محبوب علی صاحب لکھنوی رحمہم اللہ کا ہے اور علمائے موجودین میں سے سوائے دو ایک سب کا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (ماہنامہ پاسبان الہ آباد مئی ۱۹۷۳ء صفحہ ۲۳ تا ۲۵)

ادھر چند دنوں سے کچھ گمنام خطوط بصورت سوالات ممبئی سے آ رہے ہیں۔ بعض پر کچھ نام لکھے ہوتے ہیں مگر پتہ غائب ہوتا ہے۔ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ سوالات کے

جوابات دینا میں مناسب نہیں جانتا تھا، لیکن اخیر میں ایک خط ایسا آیا جس کے پیش نظر یہ ضروری ہوا کہ مسئلے کی توضیح کردی جائے۔ اللہ جسے چاہے ہدایت دے۔

ان سارے خطوط میں ایک ہی بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر جب تقریر جائز، نکاح خوانی جائز، خطبہ جائز، تو پھر نماز کیوں صحیح نہیں۔ اخیر میں ایک صاحب نے قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بزعم خویش سائنس کے اسپیشلسٹ (خصوصی ماہر) بنتے ہوئے مجھے یہ سبق پڑھایا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ جو آواز سنائی دیتی ہے، وہ متکلم ہی کی آواز ہے سارے دعوے کے باوجود اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنا پتہ لکھتے۔ اگر انہوں نے اپنا پتہ لکھا ہوتا تو ان سے چند سوالات کرتا تاکہ یہ ان پر واضح ہوجاتا کہ حق کیا ہے۔

مسئلے کی توضیح:

(۱) کسی قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے سے آیت سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔ (۲) اس کے باوجود سارے فقہا یہ لکھتے ہیں کہ صدائے بازگشت سے اگر کوئی آیت سجدہ سنے تو سجدہ تلاوت واجب نہیں۔ فقہ کی ساری کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس کی علت یہ بتاتے ہیں کہ یہ محاکات ہے قرأت نہیں جیسا کہ غنیہ میں اس کی تصریح ہے۔

(۳) آواز کے ماہرین نے تحقیق کی ہے کہ صدائے بازگشت متکلم ہی کی آواز ہے جو کسی چیز سے ٹکرا کر دوبارہ سنائی دیتی ہے۔

(۴) اب یہاں غور طلب یہ بات ہے کہ جب ان فقہا کی بھی تسلیم ہے کہ تلاوت کرنے والے سے آیت سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت واجب، اور صدائے بازگشت بھی تالی ہی کی آواز ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر صدائے بازگشت سے سنی ہوئی آیت سجدہ پر سجدۂ تلاوت کیوں نہیں واجب۔ اس کا سبب سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ صدائے بازگشت میں اور تالی کی اصلی آواز میں تھوڑا سا سکون، ٹھہراؤ پیدا ہوگیا، اور خارج کے اثر سے وہ متاثر ہوئی، متکلم کی اصل آواز کسی پہاڑ یا اونچی دیوار سے ٹکرائی، ٹکرا کر واپس ہوئی، چوں کہ ہر دو حرکت کے مابین سکون لازم ہے۔ مثلاً کوئی چیز پچھم جارہی تھی، اب وہ پورب اسی وقت لوٹے گی، جب کہ پورب اور پچھم والی حرکتوں کے مابین قدرے سکون اور ٹھہراؤ ہو۔ نیز صدائے

بازگشت اسی وقت ہوگی جب پہاڑ یا دیوار سے ٹکرانے کے بعد ٹکر کی وجہ سے پیچھے پلٹے جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ تیزی سے چلنے والا کوئی انسان جب کسی چیز سے ٹکراتا ہے تو پیچھے گر پڑتا ہے۔اسی طرح آواز جب پہاڑ یا دیوار سے ٹکرائی تو ٹکر کھانے کے بعد تیزی سے پیچھے پلٹی ،یہی صدائے بازگشت ہے۔اب غور طلب بات یہ ہے کہ اصل آواز متکلم اور بازگشت کے درمیان تھوڑا سا سکون پیدا ہو گیا،اور ٹکر کی وجہ سے اس میں تالی کے علاوہ دوسری چیز اثر انداز ہو گئی تو فقہا نے فرمایا کہ یہ محاکات ہے۔قرأت نہیں اس پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔

(۵) اب لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر غور کیجئے۔اس پر کسی کو انکار نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر متکلم کی اصل آواز پر پورے طور سے اثر انداز ہوتا ہے۔اگر چہ وہ اسی حد تک کہ متکلم کی آواز کو بہت زیادہ بلند کر دیتا ہے۔غور کیجئے کہ متکلم کے منہ سے نکلی ہوئی آواز مائک پر پڑی ،مائک کے مقناطیسی اجزا نے اسے پورے طور سے جذب کیا،اور جذب کر کے برقی قوت میں تبدیل کر دیا یہ برقی قوت ایمپلی فائر تک پہنچی،ایمپلی فائر نے اس کو بہت قوی اور بلند کیا،پھر اسے بجلی کے حوالے کیا اور بجلی نے ہارن تک پہنچایا،ہارن نے یہ قوت اس کو ڈھکیلا،اب وہ سنائی دے رہی ہے۔امپلی فائر سے ہارن تک جتنے زمانے تک آواز جتنی مسافت طے کرتی رہی اس لائق نہیں تھی کہ کوئی سن سکے وہ بالکل محبوس اور بند تھی جب ہارن سے باہر نکلی تو سنائی دی۔

اسی لیے اگر کوئی ایسی جگہ کھڑا ہو کہ متکلم کی اصل آواز بھی سن رہا ہو اور ہارن کی آواز بھی سن رہا ہو اور وہ بغور سنے تو اسے دو آوازیں سنائی دیں گی۔اگر چہ دونوں میں فرق سب کا کام نہیں۔لیکن میں نے خود اس کا بارہا تجربہ کیا کہ مقرر اخیر لفظ جب بولتا ہے وہ دوبارہ سنائی دیتا ہے چونکہ بجلی کی رفتار آواز سے کئی گنا زیادہ ہے اس لیے بہت تیزی سے آواز ہارن تک پہنچ کر فضا میں آجاتی ہے۔اس لیے صرف اخیر کا حصہ جب سنائی دیتا ہے تو دو آوازیں محسوس ہوتی ہیں۔یہ ایک الگ بات تھی۔مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ متکلم کی آواز پر لاؤڈ اسپیکر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔صدائے بازگشت میں صرف پہاڑ یا دیوار کی ٹکر اثر انداز تھی،اور لاؤڈ اسپیکر میں مائک پھر امپلی فائر پھر ہارن تینوں کے تینوں اپنی اپنی قوت بھر پورے طور سے اثر انداز ہیں۔تو جب کہ صدائے بازگشت میں صرف ایک خارجی اثر نے اسے محاکات اور لا

قراءت بنادیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر کے اتنے بڑے اثر کے باوجود لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سنی ہوئی آواز محاکات اور لاقراءت نہ ہو۔ اسی طرح تکبیر لاتکبیر نہ ہو۔ معمولی سی عقل والا بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ جب صدائے بازگشت میں پہاڑ یا دیوار کی ٹکر نے اس کی آواز کو محاکات اور اس کی قراءت کو لاقراءت بنادیا، تو لاؤڈ اسپیکر کے آلات نے جب آواز پر تین بار تین قسم کا اثر ڈالا تو ضرور لاؤڈ اسپیکر کی آواز محاکات ہوگئی۔ اور اس کے ذریعہ سنی ہوئی قراءت لاقراءت، تکبیر لاتکبیر۔

(۶) جب نماز با جماعت پڑھی جائے تو ہمیں امام کی اقتدا کا حکم ہے، اور ہمیں حکم ہے کہ امام کی تکبیر پر تکبیر کہیں، رکوع سجدہ کریں امام کے علاوہ نماز سے جو چیز بھی خارج ہو اس کی اقتدا سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ فقہاے کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ تلقن من الخارج نماز کو فاسد کر دیتی ہے۔

(۷) جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ لاؤڈ اسپکیر سے سنی ہوئی تکبیر تکبیر نہیں تو جو شخص لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع و سجدہ کرے گا وہ یقیناً تلقن من الخارج کر رہا ہے۔ اس لیے اس کی نماز ضرور فاسد ہوگی۔

اسی بنا پر ہمارے سارے اکابر حضرت صدرالشریعہ، حضرت مفتی اعظم ہند، حضرت محدث اعظم ہند، حافظ ملت مجاہد ملت، شیر بیشۂ اہل سنت، برہان ملت، غازی ملت، رحمہم اللہ تعالیٰ نے نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو منع فرمایا۔ اور یہ حکم دیا کہ جو لوگ لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع و سجدہ کریں گے ان کی نماز فاسد ہوگی، جو شخص ممبئ کا حال جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ ممبئ کی مساجد میں نماز کے لیے جو لاؤڈ اسپیکر استعمال ہو رہے ہیں وہ علما کی رضامندی سے نہیں بلکہ علما کے علی الرغم ان کی ممانعت کے باوجود اپنی برتری اور اختیار جتانے کے لیے لگائے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ مدن پورہ کی بڑی سنی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر لگوانے کے لیے لوگوں نے ہنگامے تک کیے۔ ایسی صورت میں ممبئ کی مساجد میں لاؤڈ اسپیکر لگ جانا جواز کی دلیل نہیں بن سکتا۔

رہ گئے ائمہ مساجد تو امام کی ہر نماز بہر حال ہو جاتی ہے۔ اگر چہ لاؤڈ اسپیکر لگا ہو، بشرطیکہ وہ بالقصد مائک میں آواز ڈالنے کی نیت نہ کرے۔ وہ اپنے طور پر نماز پڑھ رہا



ہے۔مائک لگا ہوا ہے وہ آواز کھینچ رہا ہے۔اس لیے ائمہ پر کوئی اعتراض نہیں۔یہ مسئلہ ممبئی میں اتنا عام ہے کہ کم از کم تمام نمازی ضرور جانتے ہیں اس کے باوجود وہ نمازیں پڑھتے ہیں تو علما پر کیا الزام؟...

اذان ،خطبہ تقریر،نکاح سے معارضہ کرنا نماز کی حقیقت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے ہے۔تقریر،نکاح،خطبہ،اذان میں سامعین مقتدی نہیں ہوتے۔صرف سامع ہوتے ہیں،اور نماز میں نمازی امام کا مقتدی ہوتا ہے۔اگر کوئی شخص اذان نہ سنے،تقریر نہ سنے،خطبہ نہ سنے تو بھی کوئی حرج نہیں اس کی نماز بہر حال ہو جائے گی اور نماز باجماعت کا معاملہ ہے کہ اگر مقتدی نے کسی ایسی شخص کی یاد دہانی یا تعلیم قبول کرلی جو نماز سے باہر ہو تو فاسد ہو جائے گی۔اس لیے نکاح واذان وغیرہ سے معارضہ کرنا درست نہیں۔

ایک صاحب نے ایک بہت ہی دل خراش بات لکھی ہے کہ ہمارے علما صرف اس لیے لاؤڈ اسپیکر پر نماز کی اجازت نہیں دیتے کہ اکابر نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے۔دوسرے صاحب نے لکھا ہے کہ دیوبندیوں کی ضد کی وجہ سے ایسا فتویٰ دیتے ہیں۔کسی کی زبان نہیں بند کی جاسکتی اور نہ کسی کے سوچنے پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔اگر دیوبندیوں کی ضد کی بنا پر ایسا ہوتا تو جب کہ دیوبندیوں کے وہ مولوی جو موجودہ دیوبندیوں کے استاذ و پیر تھے انہوں نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز تو نماز خطبہ بھی جائز نہیں۔اس وقت ہمارے علما جواز کو فتویٰ دیتے۔

بات اصلی یہ ہے کہ دیوبندی جماعت کا یہ حال ہے کہ عوام خصوصا پونجی پتی اور حکومت کی خوشنودی کی خاطر اپنے فتوے بدلتے رہتے ہیں۔کیا آپ لوگوں کو نہیں معلوم کہ قاری طیب صاحب آنجہانی اندرا گاندھی کے دور میں دیوبند کے مفتیوں نے یہ فتویٰ دیا کہ نس بندی ناجائز ہے۔لیکن ایمر جنسی کے زمانے میں قاری طیب صاحب نے خود یہ بیان دیا کہ اب تک ہمارے علما نے نس بندی کے منفی پہلو پر غور کیا انہیں چاہیے کہ اس کے مثبت پہلو (یعنی جائز ہونے) پر بھی غور کریں۔

یہی قصہ اس مسئلے میں بھی ہوا۔مولوی اشرف علی تھانوی ،مولوی حسین احمد

ٹانڈوی، اور خود دیوبند کے مفتیوں نے پہلے یہ فتویٰ دیا کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز صحیح نہیں بلکہ خطبہ بھی درست نہیں، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کے مطبوعہ فتاویٰ میں موجود ہے۔ مگر جب دیکھا کہ عوام کو شوق ہے کہ وہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھیں اور ان کے مالدار لوگوں نے اپنی مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر لگا دیا ہے تو ان کی رضا جوئی کے لیے فتویٰ بدل دیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے اکابر نے جن نکات پر عدم جواز کا فتویٰ دیا تھا وہ نکات موجودہ دور کے علماے دیوبند نہ سمجھ پائے ہوں۔

علماے اہل سنت بحمدہ تبارک وتعالیٰ جب تک مسئلے کی پوری تحقیق نہیں کر لیتے اس وقت تک کوئی فتویٰ نہیں دیتے۔ اور بحمدہ تبارک وتعالیٰ اکابر اہل سنت کے تلامذہ ان کی باتوں کو سمجھتے ہیں، اور انہیں بنیادوں پر ان کا فتویٰ جوں کا توں برقرار ہے۔ یہاں نہ ضد کا سوال ہے، اور نہ عوام کے دباؤ کا۔ فقہاے کرام کے ارشادات کی روشنی میں جو بات حق ہے، اس پر قائم ہیں اب خواہ عوام خوش ہوں یا ناخوش۔ ہمارے علما کو اس کی پروا نہیں۔

ایک شبہہ کا ازالہ:

ہم نے ابتدا میں لکھا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز متکلم ہی کی آواز ہے پھر بعد میں ہم نے اسے محاکات قرار دے کر احکام متفرع کیے۔ اس کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ جیسے صداے بازگشت بھی اصل میں متکلم ہی کی آواز ہے، مگر فقہا نے اسے محاکات اور عدم قرأت قرار دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صداے بازگشت اپنی اصل میں اپنی ماہیت کے اعتبار سے متکلم ہی کی آواز ہے، مگر خارج سے متاثر ہونے کی وجہ سے حکم میں محاکات اور عدم قرأت کے ہے۔ اسی طرح لاؤڈ اسپیکر کی آواز بھی اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے متکلم ہی کی آواز ہے مگر لاؤڈ اسپیکر سے طرح بہ طرح متاثر ہونے کی وجہ سے محاکات اور عدم قرأت کے حکم میں ہے اور اس کی صدہا نظیریں موجود ہیں کہ ادنی تغیر کے بعد کسی شئی کا حکم بدل جاتا ہے۔

محمد شریف الحق امجدی

(ماہنامہ اشرفیہ: اکتوبر ۱۹۷۸ء صفحہ ۴۳ تا ۴۶)

مسائل حج وزیارت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لولیہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ حبیبہ وعلیٰ آلہ وصحبہ

سفر کے لیے لباس پہننے کے بعد گھر میں جاکر چار رکعت نماز پڑھے، جس میں سورۂ فاتحہ کے بعد چاروں قل پڑھے۔ یہ نماز اس کی واپسی تک اس کے اہل وعیال اور مال کی نگہبانی کرے گی۔

دروازے سے باہر نکلتے وقت یہ دعا پڑھے:

بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ وَتَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنْ اَنْ نَزِلَّ اَوْ نُزَلَّ اَوْ نَضِلَّ اَوْ نُضَلَّ اَوْ نَظْلِمَ اَوْ نُظْلَمَ اَوْ نَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیْنَا اَحَدٌ۔

اللہ کے نام سے اور اس کی مدد سے سفر شروع کرتا ہوں۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کیا، گناہوں سے بچنا اور نیکیوں کی طاقت اللہ کی توفیق ہی سے ہے۔ اے اللہ! ہم تیری پناہ چاہتے ہیں، اس سے کہ ہم خود لغزش کریں یا کوئی اور ہمیں لغزش دے، یا ہم خود بہکیں یا کوئی دوسرا ہمیں بہکائے، یا ہم کسی پر ظلم کریں یا کوئی ہم پر ظلم کرے، یا ہم خود جہالت کریں یا ہمارے ساتھ کوئی دوسرا جہالت کرے۔

سب سے رخصت ہو کر اپنی مسجد کو رخصت کرے، اگر وقت مکروہ نہ ہو تو دو رکعت نفل پڑھے۔ چلتے وقت یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَکَاٰبَۃِ الْمُنْقَلِبِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِی الْمَالِ وَالْاَھْلِ وَالْوَلَدِ۔

ترجمہ: اے اللہ! ہم تیری پناہ مانگتے ہیں، سفر کی مشقت اور واپسی کی برائی سے اور

اہل وعیال اور مال میں کوئی بری صورت نظر آنے سے۔

نیز سورۂ تبت یدا کو چھوڑ قل یا ایھا الکفرون سے لے کر قل اعوذ برب الناس تک، ہر سورہ مع بسم اللہ ایک بار پڑھے، اخیر میں بھی بسم اللہ پڑھے۔ اور یہ بھی پڑھے:

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْآنَ لَرَادُّکَ اِلٰی مَعَادٍ مِّنْہُ۔

ترجمہ: وہ جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا، وہ ضرور تجھے واپسی کی جگہ لائے گا۔

ریل یا کسی سواری پر سوار ہو تو پہلے بسم اللہ پڑھے، اس کے بعد اللہ اکبر اور الحمد للہ اور سبحان اللہ تین بار، لا الہ الا اللہ ایک بار کہے پھر "سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ" ایک بار۔

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات! جس نے ہمارے لیے اسے مسخر فرمایا، اور ہم اسے تابع نہیں بنا سکتے تھے، اور ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

جب کسی دریا کی سواری پر چڑھے تو یہ پڑھے:

بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرِیْھَا وَمُرْسٰھَا اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِہٖ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔

ترجمہ: اللہ کے نام سے اس کا چلنا، اور ٹھہرنا ہے۔ بے شک میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے، اور انہوں نے جیسی چاہئے اللہ کی قدر نہ کی، اور قیامت کے دن پوری زمین اس کے قبضے میں ہے، اور آسمان اس کے ہاتھوں میں لپٹے ہوئے ہیں، وہ پاک ہے، اور اس سے برتر ہے جسے اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اِحرام

میقات اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے بغیر احرام باندھے آگے بڑھنا منع ہے۔

ہندوستانیوں کی میقات کوہِ یلملم کی محاذات ہے۔ یعنی جب جہاز سمندر میں اس جگہ کو پہنچ جائے جو یلملم کے برابر ہے، تو احرام باندھ لینا چاہئے۔ یہ جگہ کامران کے بعد جدہ سے پہلے ہے۔

پہلے احرام کا سامان ٹھیک رکھیں، احرام سے پہلے خط اور حجامت بنوالیں۔ خوب مل دھل کر نہالیں، نہا کر خوشبو لگالیں، یا کم از کم وضو کرلیں۔

جب وہ جگہ آجائے دو رکعت بہ نیت احرام پڑھیں پہلی میں سورۂ فاتحہ کے بعد قل یا ایہا الکفرون اور دوسری میں قل ھو اللہ احد پڑھیں۔ عام طور پر ہندوستان کے لوگ تمتع کرتے ہیں، یعنی پہلے عمرہ بعد میں حج، ایسے لوگ احرام کی نماز کے بعد یہ دعا پڑھیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْعُمْرَۃَ فَیَسِّرْھَا لِیْ وَتَقَبَّلْھَا مِنِّیْ نَوَیْتُ الْعُمْرَۃَ مُخْلِصًا لِلّٰہِ تَعَالٰی۔

اور اگر کوئی صرف حج کرنا چاہتا ہو، تو یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْحَجَّ فَیَسِّرْہُ لِیْ وَتَقَبَّلْہُ مِنِّیْ نَوَیْتُ الْحَجَّ مُخْلِصًا لِلّٰہِ تَعَالٰی اسے افراد کہتے ہیں۔

اور اگر حج قران کرے تو یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ فَیَسِّرْھُمَا لِیْ وَتَقَبَّلْھُمَا مِنِّیْ نَوَیْتُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ تَعَالٰی ۔ یہ سب سے افضل ہے۔

اور تینوں صورتوں میں اس نیت کے بعد بآواز بلند لبیک کہے، لبیک یہ ہے:

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ط لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَبَّیْکَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ۔

جب مدعیٰ پر پہنچے، جہاں سے کعبہ شریف نظر آتا ہے تو یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا بَیْتُکَ وَاَنَا عَبْدُکَ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ۔

ترجمہ: اے اللہ! یہ تیرا گھر ہے، اور میں تیرا بندہ ہوں، میں تجھ سے معافی اور عافیت کا سوال کرتا ہوں۔

مسجد حرام کی دومنزلہ عمارت بن جانے کی وجہ سے مدعیٰ سے کعبہ نظر نہیں آتا۔ مکہ معظمہ میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ وَاَنَا عَبْدُکَ وَالْبَلَدُ بَلَدُکَ جِئْتُکَ ھَارِبًا مِنْکَ

اِلَیکَ لِاُؤَدِّیَ فَرَائِضَکَ اَطْلُبُ رَحْمَتَکَ وَاَلْتَمِسُ رِضْوَانَکَ اَسْئَلُکَ مَسْئَلَةَ الْمُضْطَرِّیْنَ اِلَیکَ الْخَائِفِیْنَ عُقُوْبَتَکَ اَسْئَلُکَ اَنْ تَقْبَلَنِیَ الْیَوْمَ بِعَفْوِکَ وَتُدْخِلَنِیْ فِیْ رَحْمَتِکَ وَتَتَجَاوَزَ عَنِّیْ بِمَغْفِرَتِکَ وَتُعِیْنَنِیْ عَلٰی اَدَاءِ فَرَائِضِکَ اَللّٰھُمَّ نَجِّنِیْ مِنْ عَذَابِکَ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ وَاَدْخِلْنِیْ فِیْھَا وَاَعِذْنِیْ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ۔

ترجمہ: اے اللہ! تو میرا پروردگار ہے، اور میں تیرا بندہ ہوں، اور یہ شہر تیرا شہر ہے۔ میں تیرے پاس تیرے عذاب سے بھاگ کر حاضر ہوا ہوں تا کہ تیرے فرائض کو ادا کروں، اور تیری رحمت کو طلب کروں اور تیری رضا کو تلاش کروں۔ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں جیسے مضطر اور تیرے عذاب سے ڈرنے والے کرتے ہیں میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اپنے عفو کے ساتھ مجھ کو قبول فرما۔ اور اپنی رحمت میں داخل فرما کر اپنی مغفرت کے ساتھ مجھ سے درگزر فرما، اور فرائض کے ادا کرنے پر میری مدد فرما۔ اے اللہ! مجھ کو اپنے عذاب سے نجات دے، اور میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے، اور ان میں مجھے داخل کر، اور مردود شیطان سے مجھے پناہ میں رکھ۔

جب مکہ معظمہ پہنچ جائے تو کوشش یہ کرے کہ سب سے پہلے مسجد حرام شریف میں حاضر ہو لیکن اگر کوئی عذر ہو مجبوری ہو تو جاتے وقت اللہ عزوجل اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر کرتا رہے، اپنے لیے اور اپنے اہل وعیال و متعلقین کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے فلاح دارین کی دعا کرتا ہوا لبیک کہتا رہے، اور جب مسجد حرام کی دہلیز پر پہنچے تو چوکھٹ کو بوسہ دے، اور یہ دعا پڑھتے ہوئے داہنا قدم پہلے اندر رکھے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ بِوَجْھِہِ الْکَرِیْمِ وَسُلْطَانِہِ الْقَدِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ ۔

یہ دعا خوب اچھی طرح یاد کرلے، جب بھی کبھی مسجد الحرام شریف یا کسی اور مسجد میں داخل ہو یہ دعا پڑھ لیا کرے۔

جب مسجد حرام سے باہر آئے یا کسی بھی مسجد سے باہر نکلے تو پہلے بایاں پاؤں نکالے اور پہلی والی دعا پڑھے البتہ رحمتک کی جگہ فضلک بدل دے اور اتنا بڑھا دے۔ وَسَهِّلْ لِيْ اَبْوَابَ رِزْقِكَ.

جب کعبہ معظمہ پر نظر پڑے تین بار کہے: لا الہ الا اللہ واللہ اکبر، درود شریف پڑھے اور یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ زِدْ بَيْتَكَ هٰذَا تَعْظِيْمًا وَتَشْرِيْفًا وَتَكْرِيْمًا وَبِرًّا وَّمَهَابَةً اَللّٰهُمَّ اَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ بِلَاحِسَابٍ . اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ اَنْ تَغْفِرَلِيْ وَتَرْحَمَنِيْ وَتَقِلَّ عِثْرَتِيْ وَتَضَعَ وِزْرِيْ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ عَبْدُكَ وَزَائِرُكَ وَعَلٰى كُلِّ مَزُوْرٍ حَقٌّ وَاَنْتَ خَيْرُ مَزُوْرٍ فَاَسْئَلُكَ اَنْ تَرْحَمَنِيْ وَتَفِكَّ رَقَبَتِيْ مِنَ النَّارِ .

ترجمہ: اے اللہ! تو اپنے اس گھر کی عظمت وشرافت، بزرگی خوبی ہیبت زیادہ کر۔ اے اللہ! ہم کو جنت میں بلا حساب داخل فرما۔ اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے، مجھ پر رحم کر، میری غلطی معاف کر، اپنی رحمت سے میرے گناہ دور فرما۔ اے سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان۔ اے اللہ! میں تیرا بندہ اور تیرا زائر ہوں، جس کی زیارت کی جائے اس پر حق ہوتا ہے، تو سب سے بہتر زیارت کیا ہوا ہے۔ میں یہ سوال کرتا ہوں کہ مجھ پر رحم کر، اور میری گردن جہنم سے آزاد کر۔

جس طواف کے بعد سعی ہے، اس میں مرد اضطباع کرے، یعنی چادر داہنی بغل کے نیچے سے نکالے کہ داہنا مونڈھا کھلا رہے، اور دونوں کنارے بائیں مونڈھے پہ ڈال دے۔

طواف کی ابتدا یوں کرے رکن یمانی یعنی کعبے کے دکھن جا کر کعبہ کی جانب منہ کر کے اور جتنا ہو سکے کعبے سے قریب ہو کر حجر اسود کے قریب اس طرح کھڑا ہو کہ پورا حجر اسود اس کی داہنے طرف رہے۔ پھر طواف کی نیت کر کے یہ پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُرِيْدُ طَوَافَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ فَيَسِّرْهُ لِيْ وَتَقَبَّلْهُ مِنِّيْ .

مسجد حرام میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے طواف کرے۔ ہاں! اگر

جماعت قائم ہو یا فرض یا وتر یا سنت مؤکدہ فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے انہیں ادا کرے۔ پھر طواف کرے، طواف کے لیے جب حجر اسود کے قریب پہنچے تو یہ دعا پڑھے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ.

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اور اپنے بندے کی مدد کی۔ اس نے اکیلے کفار کی جماعتوں کو شکست دی۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کے لیے ملک ہے، اور اسی کے لیے حمد ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

طواف کی نیت کرنے کے بعد کعبہ کی طرف منہ کیے ہوئے اپنی داہنی طرف چلے۔ جب سنگ اسود کے مقابل ہو جائے تو کانوں تک ہاتھ اس طرح اٹھائے کہ ہتھیلیاں حجر اسود کی طرف رہیں، اور یہ پڑھے:

بِسْمِ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ.

اگر بغیر کسی کو ایذا دیئے ہوئے اور خود کسی خطرے میں پڑے ہوئے بغیر میسر ہو تو حجر اسود پر اپنی دونوں ہتھیلیاں اور ان کے بیچ میں منہ رکھ کر یوں بوسہ دو کہ آواز نہ پیدا ہو، تین بار ایسا ہی کرے۔ اور اگر ہجوم کی وجہ سے یہ میسر نہ ہو سکے تو ہاتھ سے چھو کر ہاتھ چوم لو، اور اگر ہاتھ بھی نہ پہنچ سکے، تو لکڑی سے چھو کر چوم لو یہ بھی نہ ہو سکے، تو ہاتھوں سے اس کی طرف اشارہ کر کے چوم لے (اسے استلام کہتے ہیں) استلام کے وقت یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَطَهِّرْ لِيْ قَلْبِيْ وَاشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَهٗ.

ترجمہ: اے اللہ! تو میرے گناہ بخش دے اور میرے دل کو پاک کر دے اور میرے سینے کو کھول دے اور میرے کام کو آسان کر دے، جن کو تو نے عافیت دی ان لوگوں میں مجھے عافیت دے۔

یہ دعا پڑھتے وقت کعبہ کے دروازے کی طرف بڑھو۔

اَللّٰھُمَّ اِیْمَانًا بِکِتَابِکَ وَتَصْدِیْقًا بِکَ وَوَفَاءً بِعَھْدِکَ وَاتِّبَاعًا لِسُنَّةِ نَبِیِّکَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ آمَنْتُ بِاللّٰہِ وَکَفَرْتُ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ.

ترجمہ: اے اللہ! تجھ پر ایمان لاتے ہوئے اور تیری کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے اور تیرے عہد کو پورا کرتے ہوئے اور تیرے نبی محمد ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو اکیلا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں اللہ پر ایمان لایا، بت اور شیطان سے انکار کیا۔

جب تک حجر اسود کے سامنے رہو منہ اس کی طرف رہے، جب اس سے گزر جاؤ خانہ کعبہ کو اپنے بائیں ہاتھ پر لے کر یوں چلو کہ کسی کو ایذا نہ ہو۔

جس طواف کے بعد سعی ہے، اس کے تین پھیروں میں مرد رمل کرے۔ یعنی جلد جلد قریب قدم رکھتا شانے ہلاتا چلے۔ البتہ نہ کودے نہ دوڑے، جہاں ہجوم زیادہ ہو جائے اپنے یا کسی دوسرے کو ایذا کا اندیشہ ہو اتنی دیر رمل چھوڑ دے مگر رکے نہیں، بلکہ طواف کرتا رہے پھر جب موقع مل جائے تو جتنی دیر تک موقع ملے رمل کرے۔

رمل اور اضطباع صرف اسی طواف میں ہے جس کے بعد سعی ہے۔ اور رمل پہلے کے تین پھیروں میں ہے، بعد کے پھیروں میں نہیں۔ البتہ اضطباع پورے طواف میں ہے۔ طواف کے بعد اضطباع ختم کر دے۔

جب ملتزم کے سامنے آئے، یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا الْبَیْتُ وَالْحَرَمُ حَرَمُکَ وَالْاَمْنُ اَمْنُکَ وَھٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِکَ مِنَ النَّارِ فَاَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ. اَللّٰھُمَّ اَقْنِعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَ لِیْ وَ بَارِکْ لِیْ فِیْہِ وَاخْلُفْ عَلٰی کُلِّ غَائِبٍ بِخَیْرٍ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ.

ترجمہ: اے اللہ! یہ گھر تیرا گھر ہے اور یہ حرم تیرا حرم ہے، اور امن تیرا ہی امن ہے اور یہ جہنم سے تیری پناہ مانگنے کی جگہ ہے، تو مجھ کو جہنم سے بچا، اے اللہ! جو تو نے مجھ کو دیا اس پر مجھے قناعت بخش اور میرے لیے اِس میں برکت دے، اور ہر غائب پر خیر کے ساتھ تو خلیفہ ہو جا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا ملک ہے، اسی کے لیے حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جب رکن عراقی کے سامنے آئے تو یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الشَّکِّ وَالشِّرْکِ وَالشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَ سُوْءِ الْاَخْلَاقِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِی الْمَالِ وَالْاَھْلِ وَالْوَلَدِ.

ترجمہ: اے اللہ! میں شک اور شرک اور اختلاف اور نفاق، برے اخلاق اور مال ، اہل واولاد میں واپس ہو کر بری بات دیکھنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

جب میزاب رحمت کے سامنے آئے تو یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اَظِلَّنِیْ تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِکَ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلُّکَ وَلَا بَاقِیَ اِلَّا وَجْھُکَ وَاسْقِنِیْ مِنْ حَوْضِ نَبِیِّکَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ ﷺ شَرَابًا ھَنِیْئًا لَا اَظْمَأُ بَعْدَہٗ اَبَدًا.

ترجمہ: اے اللہ! مجھے اپنے عرش کے نیچے سایہ عطا فرما، جس دن تیرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، اور تیری ذات کے سوا کچھ باقی نہیں۔ اور مجھے اپنے نبی محمد ﷺ کے حوض سے اتنا پلا کہ اس کے بعد پھر کبھی میں پیاسا نہ ہوں۔

رکن شامی کے سامنے جب آئے تو یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَّسَعْیًا مَّشْکُوْرًا وَ ذَنْبًا مَّغْفُوْرًا وَّتِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ یَا عَالِمَ مَا فِی الصُّدُوْرِ اَخْرِجْنِیْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ.

اے اللہ! اس حج کو مقبول کر اور سعی مشکور کر، اور گناہ کو بخش دے اس کو ایسی تجارت کر دے جس میں خسارہ نہ ہو۔ اے سینوں کی باتیں جاننے والے! مجھ کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکال دے۔

جب رکن یمانی کے پاس پہنچے تو اسے دونوں ہاتھوں یا کم از کم داہنے ہاتھ سے تبرکا چھوئے۔ ممکن نہ ہو تو یہاں لکڑی سے چھونا یا اشارہ کر کے ہاتھ چومنا نہیں۔ اور یہاں یہ دعا پڑھیں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِی الدِّيْنِ وَالدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ.

رکن یمانی سے پورب کی طرف مقام مستجاب ہے، یہاں ستر ہزار فرشتے دعا پر آمین کہتے ہیں، جو چاہو، دعا مانگو، یا دعاے جامع پڑھو، یعنی:

رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ.

یہ دعائیں لکھی گئی ہیں، انہیں چلا چلا کر نہ پڑھو آہستہ آہستہ اس طرح پڑھو کہ خود تم سنو دوسرا نہ سنے۔ دعا پڑھنے کے لئے کہیں رکے نہیں۔ طواف کرتے کرتے پڑھتا جائے۔

حجر اسود کے پاس پہنچے تو طواف کا ایک پھیرا ہو گیا پھر استلام کرے، اور حسب تفصیل بالا طواف کے سات پھیرے کرے۔

طواف کے بعد مقام ابراہیم میں آکر یہ آیت کریمہ: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلّٰی پڑھ کر دو رکعت نماز طواف پڑھے۔ پہلی میں سورۂ فاتحہ کے بعد قل یا ایھا الکافرون اور دوسری میں قل ھو اللہ احد یہ نماز واجب ہے۔ اگر وقت مکروہ ہے تو بعد میں پڑھے، نماز طواف پڑھ کر یہ دعا مانگے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ تَعْلَمُ سِرِّیْ وَعَلَانِيَتِیْ فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِیْ وَ تَعْلَمُ حَاجَتِیْ فَاَعْطِنِیْ سُؤْلِیْ وَتَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ اِيْمَانًا يُّبَاشِرُ قَلْبِیْ وَيَقِيْنًا صَادِقًا حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّهٗ لَا يُصِيْبُنِیْ اِلَّا مَا کَتَبْتَ لِیْ وَرِضًی مِّنَ الْمَعِيْشَةِ بِمَا قَسَمْتَ لِیْ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

اے اللہ! تو میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے تو میرے عذر کو قبول فرما اور تو میری حاجت کو جانتا ہے تو میرے سوال مجھ کو عطا کر اور جو میرے جی میں ہے تو اسے جانتا ہے۔ تو میرے گناہوں کو بخش دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے اس ایمان کا سوال کرتا ہوں جو میرے دل میں بیٹھ جائے اور سچا یقین مانتا ہوں تا کہ میں جان لوں کہ مجھے وہی پہنچے گا جو

تو نے میرے لیے لکھا ہے اور جو تو نے میری قسمت میں کیا ہے، اس پر راضی رہوں، اے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان۔

نماز و دعا سے فارغ ہو کر ملتزم کے پاس آئے اور حجر اسود کے قریب اس سے لپٹے اپنا سینہ اور پیٹ اور کبھی داہنا رخسار اور کبھی پورا چہرہ اس پر رکھے۔ اور دونوں ہاتھ سر سے اونچا کر کے دیوار پر پھیلائے یا داہنا ہاتھ کعبہ کے دروازے کی طرف اور بایاں حجر اسود کی طرف پھیلائے اور یہ دعا پڑھے:

يَا وَاجِدُ وَ يَا مَاجِدُ لَاتُزِلْ عَنِّيْ نِعْمَةً اَنْعَمْتَهَا عَلَيَّ .

اے قدرت والے عظمت والے! تو نے جو مجھے نعمت دی ہے، اس کو مجھ سے دور مت کرنا۔

ملتزم سے لپٹنے سے پہلے نماز طواف، اس طواف کے بعد ہے جس طواف کے بعد سعی ہے اور جس کے بعد سعی نہیں، اس میں نماز سے پہلے ملتزم سے لپٹے پھر جا کر مقام ابراہیم پر نماز طواف پڑھے۔ سعی صرف عمرہ اور حج کے طواف کے بعد ہے۔

اس کے بعد زمزم پر آؤ۔ اگر ہو سکے تو خود ایک ڈول کھینچو ورنہ بھرنے والوں سے لے لو اور کعبہ کی طرف منہ کر کے تین سانسوں میں جتنا پی سکو خوب پیٹ بھر کر کھڑے کھڑے پیو۔ بسم اللہ سے شروع کرو، الحمد للہ پر ختم کرو۔ ہر بار کعبہ کی طرف نظر کرو۔ باقی پانی بدن پر ڈال لو یا منہ بدن سب پر، ہر بار کم از کم کچھ پانی ملو، پیتے وقت دعا کرو قبول ہوگی۔ اس وقت کی دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا وَاسِعًا وَعَمَلاً مُتَقَبَّلاً وَشِفَاءً مِنْ كُلِّ دَاءٍ .

یا وہی جامع دعا:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً آخر تک پڑھو۔

جب تک وہاں حاضر رہو جتنا ہو سکے زمزم پیو اور ہر بار پیٹ بھر کر پیو۔ اب حکومت نے بیر زمزم تہ خانے میں کر دیا ہے، اور نل لگا دیئے ہیں۔ انہیں نلوں سے پانی پیے، اور کنویں

پر دور ہی سے نگاہ ڈال لے۔ اس کے بعد سعی کے لیے پھر حجر اسود کے پاس آؤ اور اس طرح تکبیر وغیرہ کے ساتھ استلام کرو یا اس کی طرف منہ کر کے اللہ اکبر لا الہ الا اللہ والحمد للہ اور درود شریف پڑھتے ہوئے باب صفا سے نکل کر صفا کی طرف چلو۔ صفا کی پہلی سیڑھی پر چڑھو، اس سے آگے ہرگز نہ بڑھو۔ سیڑھی پر چڑھنے سے پہلے یہ پڑھو:

اَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۔

اس سے شروع جس سے اللہ نے شروع فرمایا۔ بے شک صفا اور مروہ اللہ کے دین کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس لیے جو حج یا عمرہ کرے اس پر ان دونوں کے طواف میں کوئی گناہ نہیں، اب جو شخص نیک کام زیادہ کرے تو اللہ عزوجل بلاشبہ بدلہ دینے والا جاننے والا ہے۔

پہلی سیڑھی پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ مونڈوں تک دعا کی طرح پھیلاؤ۔ اتنی دیر تک جتنی دیر میں مفصل کی سورہ یا سورۂ بقرہ کی پچیس آیتیں تلاوت کی جائیں، ٹھہرو۔ تسبیح تہلیل، تکبیر اور درود پڑھو، اپنے لیے اپنے دوستوں، اور دوسرے مسلمانوں کے لیے دعائے خیر کرو، یا دعائے جامع "ربنا آتنا فی الدنیاحسنة" پڑھو۔

دعا میں ہتھیلیاں آسمان کی طرف ہوں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو جب تک دعا مانگتا رہے، اٹھائے رہے، جب پوری دعا ختم ہو جائے تو ہاتھ چھوڑ دے پھر سعی کی اس طرح نیت کرے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ السَّعْیَ بَیْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ فَیَسِّرْهُ لِیْ وَتَقَبَّلْهُ مِنِّیْ ۔

اے اللہ! میں سعی کا ارادہ کرتا ہوں صفا و مروہ کے درمیان، اسے میرے لیے آسان فرما اور میری طرف سے قبول فرما۔

نیت کرتے ہی صفا سے اتر کر مروہ کی طرف چلے۔ درود و ذکر جاری رکھے۔ جب پہلا سبز میل آئے تو وہاں سے دوڑنا شروع کر دے، دوسرے میل تک دوڑتا ہوا جائے اس وقت یہ دعا پڑھے:

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ وَتَعْلَمُ مَا لَا نَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَسَعْيًا مَّشْكُوْرًا وَذَنْبًا مَّغْفُوْرًا اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَا مُجِيْبَ الدَّعْوَاتِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

اے پروردگار! بخش اور رحم کر اور درگزر کر اس سے جسے تو جانتا ہے اور تو اسے جانتا ہے جسے ہم نہیں جانتے۔ بے شک تو عزت وکرم والا ہے۔ اے اللہ! تو اسے حج مبرور کر، اور سعی مشکور کر، اور گناہ بخش۔ اے اللہ! مجھ کو اور میرے والدین اور جمیع مومنین ومومنات کو بخش دے۔ اے دعاؤں کے قبول فرمانے والے! اے پروردگار! ہم سے تو قبول کر بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے، اور ہماری توبہ قبول کر بے شک تو توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے پروردگار! تو ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو عذاب جہنم سے بچا۔

دوسرے میل سے آگے نکل کر یہ دعا پڑھتے ہوئے مروہ تک جاؤ:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ.

مروہ کی پہلی سیڑھی تک چڑھو۔ اس سے آگے نہ بڑھو، پھر کعبہ کی طرف منھ کر کے جیسا صفا پہ کیا تھا کرو، یعنی تسبیح، تکبیر، حمد وثنا، درود ودعا یہ ایک پھیرا ہوا۔ اسی طرح سات پھیرے کرو۔

عمرہ صرف اتنے ہی کا نام ہے۔ یعنی طواف اور سعی اگر وہ مفرد ہو تو اس کے لیے یہ طواف قدوم ہوا، وہ حجامت نہ بنوائے، بدستور احرام میں رہے۔ قران والا بھی احرام میں رہے۔ متمتع حجامت بنوا کر عمرہ کے احرام سے باہر ہو جائے پھر متمتع آٹھویں تاریخ کو حج کا احرام باندھے پھر دو رکعت نفل احرام کی نیت سے پڑھے، اس کے بعد حج کی نیت کرے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُرِيْدُ الْحَجَّ فَيَسِّرْهُ لِيْ وَتَقَبَّلْهُ مِنِّيْ نَوَيْتُ الْحَجَّ وَاَحْرَمْتُ بِهٖ

مُخْلِصًا لِلّٰهِ تَعَالٰی.

پھر لبیک پڑھے، آسانی اسی میں ہے کہ اضطباع کے ساتھ ایک نفل طواف کر لے جس میں رمل بھی کرے۔طواف کے بعد سعی بھی کرے اب طواف زیارت کے بعد رمل اور سعی نہیں کرنی پڑے گی۔طواف زیارت کے وقت بھیڑ بہت ہوتی ہے، رمل اور سعی میں دشواری ہوگی۔آفتاب نکلنے کے بعد منیٰ کو چلے۔یہ ضروری ہے کہ ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھے، جب منیٰ نظر آئے تو یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ هٰذِهٖ مِنیٰ فَامْنُنْ عَلَیَّ بِمَا مَنَنْتَ بِهٖ عَلٰی اَوْلِیَائِکَ.

الٰہی! یہ منیٰ ہے مجھ پر وہ احسان فرما جو اپنے اولیا پر تو نے کیا۔

آٹھویں کی ظہر سے لے کر نویں کی صبح تک پانچ نمازیں یہیں پڑھو۔رات منیٰ میں گزارو، اور اگر اللہ عزوجل توفیق دے تو پوری رات ذکر وعبادت میں گزارے، اس رات میں خاص پڑھنے کی دعا یہ ہے:

سُبْحَانَ الذی فِی السَّمَاءِ عَرْشُهٗ سُبْحَانَ الذی فِی الْاَرْضِ مَوْطِئُهٗ سُبْحَانَ الذی فِی الْبَحْرِ سَبِیْلُهٗ سُبْحَانَ الذی فِی النَّارِ سُلْطَانُهٗ سُبْحَانَ الذی فِی الْجَنَّةِ رَحْمَتُهٗ سُبْحَانَ الذی فِی الْقَبْرِ قَضَاءُهٗ سُبْحَانَ الذی فِی الْهَوَاءِ رُوْحُهٗ سُبْحَانَ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمَاءَ سُبْحَانَ الَّذِیْ وَضَعَ الْاَرْضَ سُبْحَانَ الَّذِیْ لَا مَلْجَاَ وَمَنْجَاَ مِنْهُ اِلَّا اِلَیْهِ.

پاک ہے وہ جس کا عرش بلندی میں پاک ہے وہ جس کی حکومت زمین میں ہے پاک ہے وہ کہ جس کا قبضہ سمندر پر ہے پاک ہے وہ کہ آگ میں اس کی سلطنت ہے۔پاک ہے وہ کہ جنت میں اس کی رحمت ہے۔پاک ہے وہ کہ قبر میں اس کا حکم ہے۔پاک ہے وہ کہ ہوا میں جو روحیں ہیں اس کی ملک میں ہیں۔پاک ہے وہ جس نے آسمان کو بلند کیا۔پاک ہے وہ جس نے زمین کو پست کیا۔پاک ہے وہ کہ اس کے عذاب سے پناہ اور نجات کی کوئی جگہ نہیں، مگر اسی کی طرف۔

اس دعا کو ہزار بار پڑھے۔اللہ تعالیٰ سے جو مانگے گا پائے گا۔صبح مستحب وقت میں

نماز فجر پڑھ کر لبیک ذکر اور درود شریف میں مشغول رہو، یہاں تک سورج کوہِ ثبیر پر چمکے۔ اس کے بعد عرفات چلو۔ دل کو اللہ عزوجل کی طرف متوجہ رکھو۔ یہ تصور کرو کہ ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ یہ نہ ہو سکے تو یہ تصور باندھو کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ کوشش کرو کہ غیر کا خیال دل میں نہ آئے۔ منیٰ سے نکل کر یہ دعا پڑھو۔

اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ تَوَجَّهْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَلِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ اَرَدْتُ فَاجْعَلْ ذَنْبِيْ مَغْفُوْرًا وَّحَجِّيْ مَبْرُوْرًا وَارْحَمْنِيْ وَلَا تُخَيِّبْنِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْ سَفَرِيْ وَاقْضِ بِعَرَفَاتٍ حَاجَتِيْ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا اَقْرَبُ غَدْوَةٍ غَدَوْتُهَا مِنْ رِضْوَانِكَ وَابْعِدْهَا مِنْ سَخَطِكَ اَللّٰهُ اِلَيْكَ غَدَوْتُ وَعَلَيْكَ اعْتَمَدْتُ وَوَجْهَكَ اَرَدْتُّ فَاجْعَلْنِيْ مِمَّنْ تُبَاهِيْ بِهِ الْيَوْمَ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنِّيْ وَاَفْضَلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ الدَّائِمَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

اے اللہ! میں تیری طرف متوجہ ہوا، اور میں نے تجھ پر بھروسہ کیا، اور تیرے وجہ کریم کا ارادہ کیا۔ میرے گناہ بخش اور میرے حج کو مبرور کر۔ اور مجھ پر رحم کر اور مجھے نقصان میں نہ ڈال اور میرے لیے میرے سفر میں برکت دے، اور عرفات میں میری حاجت پوری کر۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ! میرا چلنا اپنی خوشنودی سے قریب کر اور اپنی ناخوشی سے دور کر، اے اللہ! میں تیری طرف چلا اور تجھی پر بھروسہ کیا اور تیری ذات کا ارادہ کیا تو مجھے ان میں سے کر جن کے ساتھ آج تو مجھ سے مباہات کرے گا، جو مجھ سے بہتر اور افضل ہیں۔ اے اللہ! میں تجھ سے عفو و عافیت کا سوال کرتا ہوں، جو دنیا و آخرت میں ہمیشہ رہنے والی ہے، اور اے اللہ! رحمت نازل فرما بہترین مخلوق محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کی آل و اصحاب پر۔

راستے بھر ذکر و عبادت و دعا کرتا جائے۔ جب جبل رحمت پر نظر پڑے اور زیادہ خشوع و خضوع حضور قلب اور ذکر و دعا میں کوشش کرے۔ عرفات میں پہنچ کر اس پہاڑ کے پاس اگر جگہ ملے تو بہتر ورنہ جہاں جگہ ملے ٹھہرے، البتہ بطن عرنہ میں نہ ٹھہرے۔ دوپہر تک جو وقت ملے جہاں تک ہو سکے رب العالمین کے حضور گریہ وزاری کرے۔ ذکر لبیک، دعا،

استغفار، کلمہ توحید، درود شریف کی کثرت کرے، حسب طاقت صدقات خیرات کرے، اس وقت کی خاص دعا یہ ہے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ .

دوپہر سے پہلے کھانے پینے دیگر ضروریات سے فارغ ہو لے۔ دوپہر ڈھلتے ہی مسجد نمرہ جائے، سنتیں پڑھ کر خطبہ سنے، امام کے ساتھ ظہر پڑھے۔ ظہر کے بعد فوراً عصر کی امامت ہوگی۔ جماعت سے عصر پڑھے۔ بیچ میں سلام وکلام تو بڑی بات ہے۔ سنتیں بھی نہ پڑھے، ظہر اور عصر ملا کر پڑھنا اسی وقت جائز ہے کہ نماز امیر الحجاج کے پیچھے جماعت سے پڑھے، جوظہر اکیلے پڑھے یا خاص جماعت سے پڑھے اسے وقت سے پہلے عصر پڑھنا جائز نہیں۔ موجودہ امام مقیم ہوتے ہوئے قصر کرتا ہے۔ اس کے پیچھے ہرگز نماز نہ پڑھے۔ نماز نہ ہوگی، اگر چہ خود یہ مسافر ہو۔

اس کے بعد سارے خیالوں سے دل ہٹا کر صدق دل سے اپنے کریم مہربان رب کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ میدان قیامت میں حساب اعمال کے لیے اس کے حضور میں حاضری کا تصور کریں۔ پورے خشوع وخضوع، عاجزی انکساری کے ساتھ لرزتے کانپتے، ڈرتے، امید کرتے آنکھیں بند کیے گردن جھکائے دست دعا آسمان کی طرف سے اونچا پھیلائے۔ تکبیر، تہلیل، تسبیح، لبیک، حمد، ذکر، دعا، توبہ واستغفار میں ڈوب جائے، رونے کی کوشش کرے، جتنا رو سکے، ایک قطرہ آنسو کا نکل گیا تو دلیل قبول ہے، اثنائے ذکر ودعا لبیک کی بار بار تکرار کرے۔ آج کے دن کی دعائیں بہت منقول ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ دعائے جامع: "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة" بار بار پڑھو۔ اور سب سے آسان اور سب سے بہتر یہ ہے کہ سارا وقت درود ذکر اور تلاوت قرآن میں گزارو۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وسیلہ اور حضور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے توسل سے جو جائز بات چاہو مانگو۔

یہ وقوف عرفہ حج کی جان اور اس کا سب سے بڑا رکن ہے۔ وقوف کے لیے کھڑا رہنا افضل ہے۔ وقوف میں نیت اور رو بہ قبلہ ہونا بھی افضل ہے۔ وقوف سے پہلے غسل کرنا،

حالت وقوف میں با وضو رہنا، روزہ نہ رکھنا سنت ہے۔ جب سورج ڈوبنے کا یقین ہو جائے اور رات کا تھوڑا حصہ آجائے تو مزدلفہ چلو، راستہ بھر ذکر، درود شریف، لبیک، زاری و بکا میں مصروف رہو۔ مغرب کی نماز ابھی نہ پڑھو۔ مزدلفہ میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھو:

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا جَمْعٌ . اَسْأَلُکَ اَنْ تَرْزُقَنِیْ جَوَامِعَ الْخَیْرِ کُلِّہٖ . اَللّٰھُمَّ رَبَّ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ . وَ رَبَّ الرُّکْنِ وَالْمَقَامِ . وَرَبَّ الْبَلَدِ الْحَرَامِ . وَرَبَّ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ . اَسْأَلُکَ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الْکَرِیْمِ اَنْ تَغْفِرَ لِیْ ذُنُوْبِیْ . وَتَرْحَمَنِیْ وَتَجْمَعَ عَلَی الْھُدٰی اَمْرِیْ . وَتَجْعَلَ التَّقْوٰی زَادِیْ وَذُخْرِیْ . وَالْاٰخِرَۃَ مَاٰلِیْ . وَھَبْ لِیْ رِضَاکَ عَنِّیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ . یَا مَنْ بِیَدِہِ الْخَیْرُ کُلُّہٗ . اَعْطِنِیْ الْخَیْرَ کُلَّہٗ . وَاصْرِفْ عَنَّا الشَّرَّ کُلَّہٗ . اَللّٰھُمَّ حَرِّمْ لَحْمِیْ وَعَظْمِیْ وَشَحْمِیْ وَشَعْرِیْ وَسَائِرَ جَوَارِ حِیْ عَلَی النَّارِ . یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ .

ترجمہ: اے اللہ! یہ جمع (مزدلفہ) ہے میں تجھ سے تمام خیر کے مجموعہ کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! مشعر الحرام کے رب رکن ومقام کے رب اور عزت والے شہر کے رب اور عزت والی مسجد کے رب! میں تجھ سے بوسیلہ تیرے وجہ کریم کے سوال کرتا ہوں کہ میرے گناہ بخش دے اور مجھ پر رحم کر اور ہدایت پر میرے کام کو جمع کر دے اور تقویٰ کو میرا توشہ اور ذخیرہ کر اور آخرت میرا مرجع کر۔ دنیا اور آخرت میں مجھ سے راضی رہ۔ اے وہ ذات! جس کے قبضہ میں تمام بھلائی ہے، مجھ کو ہر قسم کی بھلائی عطا کر اور ہر طرح کی برائی سے بچا۔ اے اللہ! میرے گوشت اور ہڈی اور چربی اور بال اور تمام اعضا کو جہنم پر حرام کر دے۔ اے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان۔

حتی الامکان جبل قزح کے پاس اترو۔ وہاں جگہ نہ ملے تو جہاں جگہ ملے اترو۔ جب عشا کا وقت ہو جائے تو مغرب اور عشا ایک ساتھ پڑھو خواہ امام کے ساتھ پڑھو یا اپنی خاص جماعت کر و یا اکیلے پڑھو ہر صورت میں یہی حکم ہے۔ (کہ وقت عشا میں مغرب بہ نیت ادا پڑھیں پھر عشا پڑھیں، یہاں دونوں نماز کو ایک ساتھ پڑھنے کے لیے مسجد یا امام کی کوئی شرط نہیں آپ تنہا پڑھیں یا جماعت سے بہر حال دونوں نمازیں عشا کے وقت ایک ساتھ

پڑھیں) مغرب اور عشا کے درمیان سنت اور نوافل نہ پڑھو۔ عشا کے فرض کے بعد مغرب اور عشا کی سنتیں اور وتر پڑھو۔

کوشش کرو کہ پوری رات عبادت میں بسر ہو اور اگر سونا ہے تو باوضو سوئے۔ صبح صادق سے اتنے پہلے اٹھو کہ ضروریات وغیرہ سے فارغ ہو کر وضو کرلو۔ بہت اندھیرے میں فجر کی نماز پڑھو۔

اب اس کے بعد دربار اعظم کی حاضری کا دوسرا وقت آیا۔ اگر مشعر حرام (یہ ایک پہاڑ ہے اسے جبل قزح بھی کہتے ہیں۔ اب وہاں اس نام کی ایک مسجد بھی بنا دی گئی ہے۔ ''مسجد مشعر الحرام'') میں جگہ ملے فبہا نہیں تو اس کے دامن میں۔ وہاں بھی جگہ نہ ملے تو وادیٔ محسر (وادیٔ محسر منیٰ اور مزدلفہ کے بیچ میں واقع ہے اور یہ ان دونوں کی حدود سے خارج ہے۔ یہاں اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا یہاں ٹھہرنا جائز نہیں) چھوڑ کر اسی طرح جیسے عرفات میں کیا تھا یہاں بھی کرو یہیں سے چھوٹی چھوٹی کھجور کی گٹھلی کے برابر کم از کم ۴۹؍ کنکریاں پاک جگہ سے لے کر تین بار دھولو (مزدلفہ میں وقوف کا اصلی وقت صبح صادق سے لے کر اجالا ہونے تک ہے لہذا جو اس وقت کے بعد پہنچا یا بغیر عذر کے صبح صادق سے پہلے مزدلفہ چھوڑ کر چلا گیا تو کفارہ کی قربانی لازم ہوگی۔ بیمار، ضعیف مجبوراً وقت سے پہلے منیٰ چلے گئے تو دم واجب نہیں مگر کچھ صدقہ وخیرات کر دینا چاہیے)

جب آفتاب نکلنے میں دو رکعت پڑھنے کا وقت باقی رہ جائے تو منیٰ کی طرف کوچ کرو۔ راستے میں بدستور ذکر، دعا، درود شریف، لبیک کی کثرت کرو، اور یہ دعا پڑھو۔

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَفَضْتُ وَمِنْ عَذَابِکَ اَشْفَقْتُ وَاِلَیْکَ رَجُعْتُ وَمِنْکَ رَھِبْتُ فَاقْبَلْ نُسُکِیْ وَعَظِّمْ اَجْرِیْ وَارْحَمْ تَضَرُّعِیْ وَاقْبَلْ تَوْبَتِیْ وَاسْتَجِبْ دُعَاءِیْ۔

اے اللہ! تیری طرف واپس ہوا، اور تیرے عذاب سے ڈرا، تیری طرف رجوع کی، اور تجھ سے خوف کیا، میری عاجزی پر رحم کر، اور میری توبہ قبول کر، اور میری دعا قبول کر۔

مزدلفہ سے کم از کم ۴۹ کنکریاں لے، اور اگر تیرہویں ذوالحجہ کو بھی منیٰ میں قیام کا ارادہ ہو تو ستر (۷۰) کنکریاں لے۔ احتیاطاً کچھ زیادہ لے لے۔ مزدلفہ سے منیٰ پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی تو اسی وقت رمی کرے۔ دسویں کی رمی کا وقت طلوع فجر سے گیارہویں کی فجر تک ہے مگر سنت یہ ہے کہ طلوع آفتاب سے زوال تک ہو۔ اور زوال سے غروب تک مباح اور غروب سے فجر تک مکروہ۔ یوں ہی دسویں کی فجر سے طلوع آفتاب تک مکروہ۔ لیکن اگر کسی عذر کی وجہ سے دن میں رمی نہ کر سکا، رات میں کر لی تو مکروہ نہیں۔ مریض یا اتنا کمزور جو جمرہ تک نہ جا سکتا ہو وہ کسی دوسرے کو حکم دے سکتا ہے کہ اس کی طرف سے رمی کر دے۔ یہ دوسرا شخص پہلے اپنی طرف سے رمی کرے پھر اس کی طرف سے کرے۔ اگر کوئی خواہ مرد ہو یا عورت رمی چھوڑ دے گا تو اس پر کفارہ کے طور پر ایک بکری یا بھیڑ یا دنبہ کی قربانی واجب ہے۔

جب منیٰ پہنچے، سب سے پہلے جمرۃ العقبہ پر جا کر کنکری مارے۔ کنکری مارتے وقت یوں کھڑا ہو کہ منیٰ داہنے ہاتھ پر اور کعبہ بائیں ہاتھ پر اور جمرہ کی طرف منھ ہو۔ سات کنکری الگ الگ چٹکی میں لے کر داہنا ہاتھ خوب اٹھا کر کہ بغل کی رنگت ظاہر ہو رہی ہو رمی کرے۔ ہر کنکری مارتے وقت یہ پڑھے:

بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَرَغْمًا لِّلشَّيْطَانِ وَرِضًى لِّلرَّحْمٰنِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَّسَعْيًا مَّشْكُوْرًا وَّذَنْبًا مَّغْفُوْرًا ۔

اللہ کے نام سے مارتا ہوں اللہ بہت بڑا ہے۔ شیطان کو ذلیل کرنے کے لیے، رحمٰن کو راضی کرنے کے لیے۔ اے اللہ! اس کو حج مبرور کر اور سعی مشکور کر اور گناہ بخش دے۔

یہ دعا نہ یاد ہو تو صرف بسم اللہ اکبر کہہ کر مارے پہلی ہی کنکری مارتے لبیک بند کر دے اور کنکری مارتے وقت ہی وہاں سے چل دے۔

اس کے بعد قربانی کرے۔ قربانی کے بعد قبلہ رو ہو کر مرد سر منڈوائیں، اور عورتیں بال کتروائیں۔

افضل یہ ہے کہ دسویں ہی کو ورنہ گیارہویں یا بارہویں کو طواف زیارت کے لیے مکہ حاضر ہو، یہ فرض ہے۔

اگر حج کے احرام کے بعد طواف نفل میں جو رمل اور سعی یا صرف سعی کر چکا ہے تو اس طواف میں رمل وسعی کچھ نہیں، ورنہ ہے۔

گیارہویں تاریخ کو بعد نماز ظہر پھر کنکری مارنے چلو۔ آج تینوں جمروں پر کنکری ماری جائے گی۔

اسی طرح بارہویں کو بھی۔ افضل یہ ہے کہ تیرہویں کو بھی دوپہر بعد رمی کرے۔ لیکن اگر حجاج بارہویں کو چلے گئے تو کوئی حرج نہیں۔ واپسی کے وقت طواف وداع کرے۔ اس میں نہ اضطباع ہے، نہ رمل نہ سعی۔ اس طواف کے بعد دروازۂ کعبہ کے سامنے کھڑا ہو کر چوکھٹ کو بوسہ دے۔ اور حج وزیارت قبول ہونے اور بار بار حاضری کی توفیق کی دعا مانگے۔

اَلسَّائِلُ بِبَابِکَ یَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ وَمَعْرُوْفِکَ وَیَرْجُوْ رَحْمَتِکَ.

تیرے دروازے پر سائل تیرے فضل واحسان کو مانگتا ہے، اور تیری رحمت کا امیدوار ہے۔ یا دعائے جامع پڑھے۔

پھر ملتزم پر آ کر غلاف کعبہ تھام کر اسی طرح لپٹو ذکر اور دعا کی کثرت کرو، اس وقت یہ دعا پڑھو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ . اَللّٰهُمَّ كَمَا هَدَیْتَنَا لِهٰذَا فَتَقَبَّلْهُ مِنَّا وَلَا تَجْعَلْ هٰذَا اٰخِرَ الْعَهْدِ مِنْ بَیْتِكَ الْحَرَامِ وَارْزُقْنِیْ الْعَوْدَ اِلَیْهِ حَتّٰی تَرْضٰی بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّم عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ.

سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں ہدایت دی۔ اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت نہ پاتے۔ اے اللہ! جس طرح تو نے اس کی ہدایت دی، اسی طرح تو اسے قبول فرما، اور بیت اللہ شریف کی یہ ہماری آخری حاضری نہ کر اور اس کی طرف لوٹنا ہمیں نصیب کر حتی کہ اپنی رحمت کے سبب ہم سے راضی ہو جا۔ اے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان، اور سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اور اے اللہ! درود

بھیج ہمارے سردار محمد اوران کی آل واصحاب پر۔

پھر حجر اسود کو بوسہ دو، اور جو آنسو رکتے ہو گراؤ، اور یہ پڑھو:

یَا اَمِیْنَ اللّٰہِ فِیْ اَرْضِہٖ اِنِّیْ اُشْھِدُکَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا اِنِّیْ اَشْھَدُ اَنْ لاَّ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ سَیِّدَنَا مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاَنَا اُوْدِعُکَ ھٰذِہِ الشَّھَادَۃَ لِتَشْھَدَنِیْ بِھَا عِنْدَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَفِیْ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ یَوْمَ الْفَزَعِ الْاَکْبَرِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُشْھِدُکَ عَلٰی ذٰلِکَ وَاُشْھِدُ مَلَائِکَتِکَ الْکِرَامَ ۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

اے زمین میں اللہ کے امین! میں تجھے گواہ بناتا ہوں اور اللہ کی گواہی کافی ہے کہ میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور میں تیرے پاس اس شہادت کو امانت رکھتا ہوں کہ اللہ کے حضور قیامت کے جس دن بڑی گھبراہٹ ہوگی، تو میرے لیے اس کی شہادت دے گا۔ اے اللہ! میں تجھے اور تیرے عزت والے فرشتوں کو گواہ بناتا ہوں، اے اللہ! درود بھیج ہمارے سردار محمد اوران کی آل واصحاب پر۔

پھر الٹے قدم کعبہ کی طرف منھ کر کے مسجد سے باہر آؤ اور اگر الٹے قدم چلنے میں دشواری ہو تو بار بار مڑ کر کعبہ کو حسرت سے دیکھتے رہو۔ اس کی جدائی پر روتے یا کم از کم رونے والے جیسا حال بناتے ہوئے مسجد کریم کے دروازے سے بایاں پاؤں پہلے بڑھا کر نکلو اور اس وقت کی دعا پڑھو۔ اس وقت نکلنے کے لیے سب سے بہتر باب الحزورہ ہے۔

ہندوستان وپاکستان کی میقات

جب سے ہندوستانی حج کر رہے ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے کہ "کوہ یلملم" ہندوستانیوں کی میقات ہے، اسی پر ہمیشہ سے عمل درآمد ہوتا چلا آرہا ہے۔ اسی کے مطابق جہاز والے اعلان بھی کرتے ہیں۔ مگر اب چند سالوں سے کچھ لوگوں نے اپنے ذہن سے یہ نکال لیا ہے کہ ہندوستانیوں کی میقات "بحرہ" ہے، جو جدہ

اور مکہ معظمہ کے درمیان ہے۔ اسی کے مطابق یہ لوگ جہاز میں احرام نہیں باندھتے بلکہ جدہ پہنچ کر باندھتے ہیں۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ جو شخص میقات سے نہ گزرے کچھ فاصلے سے گزرے تو اس کی میقات راستے کا وہ مقام ہے جو میقاتوں کے درمیان دونوں میقاتوں میں سے کسی ایک کی محاذاۃ (سیدھ) میں ہو۔ جدہ دو میقاتوں یعنی جحفہ اور یلملم کے درمیان ہے، جب یلملم سے جحفہ تک خط کھینچتے ہیں تو یہ خط بحرہ پر گزرتا ہے، اس لیے ہندوستانیوں کی میقات ''بحرہ'' ہوئی۔

اتنی بات تو مسلم ہے کہ دو میقاتوں کے درمیان گزرنے والے کی میقات دونوں میں سے کسی ایک کی محاذات ہے۔

عالم گیری میں ہے:

كُلُّ مَنْ قَصَدَ مَكَّةَ مِنْ طَرِيقٍ غَيْرِ مَسْلُوكٍ اَحْرَمَ اِذَا حَاذٰى مِيقَاتًا مِنَ الْمَوَاقِيتِ وَاِنْ سَلَكَ بَيْنَ الْمِيقَاتَيْنِ فِي الْبَحْرِ اَوِ الْبَرِّ اِجْتَهَدَ وَاَحْرَمَ اِذَا حَاذٰى مِيقَاتًا مِنْهُمَا وَاَبْعَدُهُمَا اَوْلٰى .

جو ایسے راستے سے مکہ جانا چاہے جو چالو نہ ہو تو وہ کسی بھی میقات کی سیدھ میں پہنچے احرام باندھ لے جو دو میقاتوں کے درمیان چل رہا ہے، خواہ سمندر میں ہو خواہ خشکی میں تو وہ کوشش کر کے معلوم کرے اگر کسی میقات کی سیدھ میں پہنچ گیا تو احرام وہیں باندھ لے۔

اور ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ محاذات سے مراد حرم کی طرف جاتے ہوئے محاذاۃ ہے۔ یعنی جانے والا جب کعبہ کا رخ کرے تو میقات اس کے داہنے ہاتھ یا بائیں ہاتھ پڑے، اور یہ بھی تسلیم ہے کہ یلملم سے جحفہ تک جب خط مستقیم کھینچا جائے گا تو وہ ''بحرہ'' پر گزرے گا، مگر ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ بحرہ، یلملم جحفہ کے محاذی ہے، جحفہ کی بات کرنا تو یہاں خارج از مبحث ہے۔ اعتبار قریب ترین میقات کا ہے۔ بحرہ سے قریب یلملم ہے، اس کو سامنے رکھ کر بحث کرنی ہے۔ یلملم مکہ سے تقریبا سو کلومیٹر ہے اور جدہ تقریبا ۷۵ کلومیٹر، بحرہ جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان ہے، تو اس کا فاصلہ ۳۵/۴۰ کلومیٹر سے زائد نہ ہوگا۔ اب ہر شخص سوچے کہ جو مقام مکہ معظمہ سے سو کلومیٹر دور ہے، اس کے محاذی وہ مقام کیسے ہوسکتا ہے، جو مکہ معظمہ سے

صرف ۴۰ رکلومیٹر دور ہو۔ اس کے محاذی وہ جگہ ہوگی جو مکہ معظمہ سے سو کلو میٹر کی دوری پر ہو۔ اس میں لم یہ ہے کہ زمین کروی گیند کی شکل کی ہے۔ محاذات کے لیے اس پر جو خط کھینچا جائے گا وہ مستقیم نہیں کمان دار ہوگا۔ اب جس کا جی چاہے نقشہ بنا کر کعبہ کو مرکز مان کر پرکار کے ایک سرے کو کعبہ پر اور دوسرے کو یلملم پر رکھ کر خط کھینچے تو اسے معلوم ہوگا کہ جدہ سے بھی ۲۵ رکلو میٹر دور سمندر میں یلملم کی سیدھ پڑے گی، جس کے آگے کوئی احرام باندھے بغیر آئے گا، تو اس پر دم لازم آئے گا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ جو شخص جدہ احرام باندھے بغیر اترے گا، خواہ وہ پانی کے جہاز سے خواہ ہوائی جہاز سے اس پر دم لازم آئے گا۔

رہ گئی یہ بات کہ پھر اس پر عمل درآمد کیوں ہے کہ جب جہاز یلملم کے سیدھے دکھن جانب پہنچ جاتا ہے تو علما احرام باندھنے کا حکم دیتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاز جب جدہ بندرگاہ کے قریب پہنچ جاتا ہے تو جہاز میں ایک ہفتہ سے مقید حجاج اترنے کے لیے اپنا بستر باندھنے سامان سمیٹنے میں مشغول ہو جاتے ہیں، اس وقت احرام باندھنے کا موقع کہاں رہتا ہے، اور میقات سے پہلے احرام باندھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ بہتر ہے۔ اس لیے حجاج کی آسانی کے لیے کچھ پہلے ہی احرام باندھنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ حجاج پر لازم ہے کہ اس کا خیال رکھیں، اور جدہ پر ہرگز ہرگز احرام کے بغیر نہ اتریں۔ بلکہ عام حجاج کے ساتھ جب جہاز میں احرام کے لیے سیٹی ہو، احرام باندھ لیں اور اس نئی اپچ پر دھیان نہ دیں ورنہ ان پر دم لازم ہوگا، گناہ الگ ہوگا، اور دم نہ دیں تو وہ ذمہ میں رہ جائے گا۔

نماز سفر

(۱) اگر آپ کے وطن سے دہلی یا جہاں سے آپ کو ہوائی جہاز یا بحری جہاز ملے وہ ۹۲ رکلومیٹر کی دوری پر ہے، تو اپنی آبادی سے نکلنے کے بعد ظہر، عصر، عشا میں قصر کریں۔ یعنی فرائض بجائے ۴ ر رکعت کے صرف ۲ ر پڑھیں۔ فجر و مغرب میں قصر نہیں۔ ان کے فرائض پورے پڑھیں۔ اسی طرح سنتوں میں بھی قصر نہیں۔ اگر موقع ہو تو پوری پڑھیں ورنہ

معاف ہیں۔

(۲) بمبئی، دہلی، مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ، جہاں بھی جائیں، اگر وہاں مسلسل پندرہ دن یا زائد ٹھہرنے کی نیت ہو، پندرہ دن کے اندر اندر کہیں ۹۲ رکلومیٹر کی دوری پر نہ جانا ہو تو قصر نہ کریں۔ پوری نمازی پڑھیں، اور اگر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت ہو تو قصر کریں۔

(۲) کہیں بھی ٹھہرنے کے بعد اگر ۹۲ رکلومیٹر کی دوری پر سفر کرنا ہو تو راستے میں قصر ہے خواہ پندرہ دن یا زائد رک کر سفر شروع کیا ہے، خواہ کم رکا ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر پندرہ دن ٹھہرنے کے بعد سفر شروع کیا ہے تو جب تک آبادی سے باہر نہ نکل جائے قصر جائز نہیں۔ اگر پندرہ دن سے کم میں سفر شروع کیا ہے تو آبادی میں بھی قصر ہے۔

(۴) مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد اگر ۸ر ذی الحجہ پندرہ دن یا اس سے زائد ہے تو پوری نماز پڑھیں۔ مکہ میں بھی اور منیٰ عرفات مزدلفہ میں بھی، اور اگر پندرہ دن سے کم ہے تو مکہ معظمہ میں بھی قصر کریں۔ اور منیٰ عرفات مزدلفہ ہر جگہ، اگر چہ بعد حج مکہ معظمہ پہنچنے سے وطن واپس ہونے کی تاریخ ۱۵ ر دن بعد ہو۔

درمختار جلد اول ص: ۵۵۲ / پر ہے:

فلو دخل الحاج مكة ايام العشر لم تصح نيته لانه يخرج منىٰ وعرفة فصار كنية الاقامة في غير موضعها وبعد عوده من منىٰ تصح .

اگر حج کرنے والا مکہ میں ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں پہنچا تو اس کی اقامت کی نیت درست نہیں اس لیے کہ وہ منیٰ اور عرفات میں جائے گا، تو گویا نیت ایسی ہوئی جیسے کوئی ایسی جگہ اقامت کی نیت کرے جو اقامت کے لائق نہیں، منیٰ سے واپسی کے بعد اقامت کی نیت صحیح ہے۔

(۵) مکہ معظمہ ایسے وقت پہنچا کہ ذوالحجہ کی ۸ر تاریخ ۱۵ ر دن بعد تھی۔ اس لیے وہ مکہ معظمہ پندرہ دن قیام کر کے منیٰ آیا۔ تو منیٰ، عرفات، مزدلفہ ہر جگہ پوری نماز پڑھے۔ پھر حج سے فراغت کے بعد مکہ معظمہ آیا، اور اب ۱۵ ر دن سے کم رہنے کا ارادہ ہے تو بھی مقیم ہی ہے، قصر نہ کرے پوری نماز پڑھے۔

(٦) مسافر پر فرض ہے کہ قصر کرے اسے پوری پڑھنا جائز نہیں۔ اگر پوری پڑھے

گا تو گنہ گار ہوگا۔ (حدیث)

(۷) مسافر پر قصر اس وقت ہے کہ جب کہ وہ تنہا پڑھے۔ یا مسافر امام کے پیچھے پڑھے اور جب مقیم امام کے پیچھے پڑھے تو پوری پڑھے اور اگر مسافر نے ایسے مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھی جو قصر کرتا ہے تو مسافر کی نماز نہ ہوگی۔ جیسے منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں موجودہ امام ہیں کہ مقیم ہوتے ہوئے قصر کرتے ہیں، ان کے پیچھے ہرگز نماز نہ پڑھیں۔ نماز نہیں ہوگی، نہ مسافر کی نہ مقیم کی۔

طواف کے مسائل

(۱) عازمین حج کو دیکھا گیا ہے کہ وہ احرام باندھتے ہی اضطباع کر لیتے ہیں۔ یعنی چادر اپنی بغل سے نکال کر اس کے دونوں کنارے بائیں مونڈھے پر ڈال لیتے ہیں، اور اسی طرح نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اضطباع کے ساتھ نماز پڑھنے سے نماز مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہوتی ہے۔ اضطباع صرف اس طواف میں مسنون ہے جس کے بعد سعی ہے۔ وہ بھی صرف اسی وقت تک جب تک طواف کر لے۔ طواف ختم ہوتے ہی اضطباع ختم کر کے چادر عادت کے مطابق دونوں شانوں پر ڈال لیں۔ سعی کی حالت میں اضطباع نہیں۔

(۲) بہت سے حجاج رکن شامی وعراقی کا بوسہ دیتے ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ رکن یمانی پر صرف دونوں ہاتھ یا داہنا ہاتھ رکھ کر بوسہ دیں۔ اور اگر بھیڑ کی وجہ سے میسر نہ آئے تو ہاتھ سے اشارہ کر کے ہاتھ چومنے کی بھی یہاں ضرورت نہیں۔

(۳) طواف کے لیے باب السلام سے داخل ہونا مسنون ہے۔ باب السلام کعبہ شریف کے پورب مطاف کے کنارے تھا۔ اب موجودہ حکومت نے اسے اٹھا دیا ہے۔ وہاں سیاہ پتھر کے نشان بنا دیئے ہیں۔ عام حجاج کو اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔ حجاج کو چاہیے کہ کعبہ کے پورب اس کو تلاش کر لیں۔

(۴) عام حجاج کو معلوم نہیں ہوتا کہ باب الصفا کہاں ہے؟ بعض ناواقف مروہ سے سعی شروع کر دیتے ہیں۔ اگر مروہ سے سعی شروع کی جائے گی تو یہ پھیرا لغو ہوگا، شمار نہ ہوگا۔

محنت بھی رائیگاں جائے گی۔ حجاج کو چاہیے کہ سعی کے لیے حجر اسود کا استلام کر کے سیدھے کونے پر مسجد حرام کے دلان میں آئیں۔ حجر اسود کی سیدھ میں مسجد حرام سے باہر نکلنے کا جو دروازہ ہے وہی باب الصفا ہے، اس سے نکلتے ہی صفا ہے۔

(۵) چوں کہ حجامت کی بنوائی وہاں ان دنوں ۵/ریال ہو جاتی ہے یعنی ہندوستانی روپئے سے ۲۱/روپے۔ اس لیے بہت سے بخیل اپنے آپ قینچی سے چند بال کے کچھ حصے کاٹ لیتے ہیں، اور احرام کھول دیتے ہیں۔ اس لیے احرام سے باہر آنے کے لیے بہتر یہی ہے کہ پورا سر منڈ والیں، اور منڈ وانا منظور نہ ہو تو پورے سر کے بالوں سے ایک انگلی کے پور کے برابر کتریں، یہ مستحب ہے۔ یا کم از کم چوتھائی بالوں کو انگلی کے پور کے برابر ضرور کاٹیں۔ اگر چوتھائی سر کے بال کتریں تو ایک پور سے زائد کتریں۔ بال چھوٹے بڑے ہوتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ چھوٹے بال ایک پور سے کم کردیئے جائیں یہ واجب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اپنے ہاتھ سے سر مونڈ لیں، یا اس کا وہ جس کی حجامت نہیں بنی ہے سر مونڈ دے یا کتر دے۔ (بہار شریعت بحوالہ منسک)

رمی کے مسائل

(۱) سب سے زیادہ حجاج کنکری مارنے میں غفلت کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دور سے کنکری مارتے ہیں۔ جو ادھر ادھر چلی جاتی ہے، بہتر تو یہی ہے کہ کنکری (جمرہ) ستون پر لگے، ورنہ یہ ضروری کہ زیادہ سے زیادہ جمرہ سے تین ہاتھ کے فاصلے پر گرے۔ اگر تین ہاتھ سے زائد کے فاصلے پر گرے گی تو وہ شمار میں نہیں آئے گی۔

(۲) معمولی عذر کی وجہ سے دوسروں سے کہہ دیتے ہیں کہ ہماری طرف سے بھی کنکری مار آنا۔ جن کے ساتھ عورتیں ہوتی ہیں وہ از خود عورتوں کے وکیل بن جاتے ہیں۔ حالاں کہ یہی عورتیں مکے کے بازاروں میں گھنٹوں دھکے کھاتی پھرتی ہیں۔ صرف ایسے مریض اور کمزور کی طرف سے دوسرے کو کنکری مارنا درست ہے جو سواری پر بھی جمرہ نہیں جاسکتا۔ فقہا نے لکھا ہے کہ کوئی اتنا کمزور ہے کہ جمرہ پر پہنچ گیا اور خود کنکری مارنے کی قوت

نہیں رکھتا تو اس کا ساتھی مریض کے ہاتھ پر کنکری رکھ کر رمی کرادے۔ ایسی صورت میں وہ مرد اور وہ عورتیں جو سامان خریدنے کے لیے مکہ معظمہ کے بازاروں میں دھکے کھانے کی قوت رکھتی ہیں، انہیں یہ کب درست ہوگا کہ وہ خود کنکری نہ ماریں، دوسروں کو وکیل کریں۔ ایسے لوگ ضرور رمی کے تارک ہوں گے اور ان پر دم واجب ہوگا۔ دسویں تاریخ کو ۹ ربجے تک کوئی خاص بھیڑ نہیں ہوتی ہے۔ آسانی سے رمی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح بعد عصر بھی بھیڑ بہت کم ہوتی ہے اور رات میں جمرہ بالکل خالی رہتا ہے، بالفرض دن بھر بھیڑ میں دبنے کچلنے کا اندیشہ ہے تو کمزور مرد اور عورتیں رات میں کنکری ماریں۔ عذر کی بنا پر رات میں کنکری مارنے میں کوئی کراہت نہیں۔ اس سے یہی نہ ہوگا کہ دسویں کو قربانی نہ ہو سکے گی، احرام نہ کھل سکے گا، طواف زیارت نہ ہو سکے گا، مگر اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور بلا عذر شرعی خود کنکری نہ مارنا دوسرے سے رمی کرانا جرم ہے جس پر گناہ بھی ہے، اور دم بھی۔ یہی گیارہویں اور بارہویں کو کریں، بارہویں کو اگر مکہ معظمہ واپسی کا ارادہ ہے تو بعد عصر کنکری ماریں۔

(۳) بعض حجاج بارہویں کو قبل زوال کنکری مار کر مکہ معظمہ چل دیتے ہیں۔ یہ اصل مذہب حنفی کے خلاف ہے۔ اور ایک ضعیف روایت ہے اس پر عمل جائز نہیں۔ (لہذا گیارہ بارہ ذی الحجہ کو زوال آفتاب سے پہلے رمی کرلی تو رمی نہ ہوئی اس کا اعادہ اسی دن ضروری ہے۔ اگر اس دن اعادہ نہ کریں گے تو دم واجب ہوگا)

(طواف زیارت فرض ہے اگر دسویں کو موقع نہ مل سکے تو بارہویں کی مغرب سے پہلے کرلیں ورنہ دم واجب ہوگا۔ عورتوں کے لیے بھی طواف زیارت فرض ہے لیکن اگر حیض ونفاس کی وجہ سے بارہویں تک نہ کرسکیں تو ان پر دم لازم نہیں آئے گا۔ جب بھی پاک ہوں طواف زیارت کرلیں۔ حیض ونفاس میں عورتیں نماز، تلاوت، طواف نہیں کرسکتیں ہاں منیٰ، عرفات، مزدلفہ جانا اور رمی کرنا اسی حالت میں جائز ہے)

قِران کا بیان

نیت کے بیان میں گزر چکا ہے کہ حج کی تین قسمیں ہیں۔ تمتع، قِران، افراد، چوں

کہ عام طور پر لوگ تمتع ہی کرتے ہیں اس لیے ہم نے تمتع کے احکام مفصل بیان کردیئے مگر ضرورت اس کی بھی ہے کہ دوسرے اقسام کے احکام بھی مختصر طور سے بیان کردیئے جائیں۔
قِران کے معنی ملانے کے ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ حج وعمرہ کے ساتھ ملا کر ادا کیا جائے۔
قِران کرنے والا نماز احرام کے بعد یہ نیت کرے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ فَیَسِّرْھُمَا لِیْ وَتَقَبَّلْھُمَا مِنِّیْ نَوَیْتُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ تَعَالٰی ۔

''اے اللہ! میں نے حج اور عمرہ دونوں کی نیت کی ان دونوں کو میری طرف سے قبول فرما۔ میں نے اللہ عزوجل کے لیے حج اور عمرے کی نیت کی''۔

قارن مکہ معظمہ پہنچ کر پہلے عمرہ کرے یعنی عمرے کا طواف اضطباع اور رمل کے ساتھ اور صفا ومروہ کی سعی کرے مگر حجامت نہ بنوائے نہ احرام کھولے اور وقوف عرفہ سے پہلے حج کے لیے ایک اور طواف کرے جسے طواف قدوم کہتے ہیں اگر طواف زیارت والی سعی اسی طواف کے ساتھ کرنا چاہے اور اسی میں آسانی ہے تو اس طواف میں اضطباع بھی کرے اور رمل بھی۔ اور اگر افضل پر عمل کرنا چاہے تو ابھی سعی نہ کرے اس صورت میں اس طواف میں نہ اضطباع ہے نہ رمل۔

جب طواف زیارت کرے تو اس میں اضطباع اور رمل کرے اس کے بعد سعی کرے۔

طواف قدوم کے بعد بھی حجامت نہ بنوائے نہ احرام کھولے۔ احرام باندھے ہوئے مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے نفل طواف جتنا چاہے کرے مگر عمرہ نہیں کرسکتا۔ آٹھویں تاریخ کو اسی احرام کے ساتھ منیٰ جائے اور تفصیل بالا کے مطابق حج کے تمام ارکان ادا کرے۔ دس کو رمی جمرہ کے بعد قربانی کرے اس پر بھی قربانی واجب ہے پھر حجامت بنوا کر احرام کھولے پھر طواف زیارت کرے۔ جس جرم کی وجہ سے تمتع کرنے والے پر ایک دم ہے قارن پر دو۔

افراد کا بیان

افراد کے معنی ہیں تنہا کرنا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ حج کے ساتھ عمرہ نہ کرے صرف حج

کرے۔ احرام کی نیت یوں کرے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْحَجَّ فَیَسِّرْہُ لِیْ وَتَقَبَّلْہُ مِنِّیْ نَوَیْتُ الْحَجَّ لِلّٰہِ تَعَالٰی

"اے اللہ! میں حج کا ارادہ کرتا ہوں تو میرے لیے اسے آسان فرما اور میری طرف سے قبول فرما میں نے اللہ کے لیے حج کی نیت کی۔

صرف حج کرنے والے کو مفرد کہتے ہیں یہ مکہ معظمہ پہنچ کر حج کے لیے طواف قدوم کرے چاہے تو اسی کے بعد سعی بھی کرے اس صورت میں اس طواف میں اضطباع اور رمل کرے اور اگر طواف زیارت کے بعد سعی کرنا چاہتا ہے تو اس میں اضطباع ہے نہ رمل مگر طواف زیارت میں اضطباع اور رمل ضروری ہوگا اور اس کے بعد طواف قدوم سے فارغ ہوکر نہ حجامت بنوائے نہ احرام کھولے بدستور احرام باندھے رہے۔ آٹھویں ذوالحجہ کو اسی احرام کے ساتھ منیٰ جائے اور حج کرے۔ دسویں کو کنکری مار کر احرام کھول دے اور طواف زیارت کرے۔ اس پر قربانی واجب نہیں مگر مستحب ہے۔ اگر کرے گا بہت ثواب پائے گا نہیں کرے گا تو کوئی گناہ نہیں مفرد بھی حج سے فراغت کے پہلے عمرہ نہیں کرسکتا۔

مکہ معظمہ کے چند متبرک مقامات

غار حرا:

ان میں سب سے اہم غار حرا ہے جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل نبوت مدت دراز تک اور بعد نبوت بھی عبادت فرمائی ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسی حالت میں اب بھی ہے اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے اس لیے اس کی زیارت کو ضرور حاضر ہو۔ وہاں حاضر ہوکر اس یقین کے ساتھ دو رکعت نفل ادا کرے کہ یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اقدس ضرور مس ہوا ہے بلکہ پیشانی بھی مس ہوئی ہے۔ یہ مبارک غار مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر منیٰ جاتے ہوئے بائیں ہاتھ جبل نور میں ہے۔ اسی جبل نور پر وہ متبرک جگہ بھی ہے جہاں شق صدر ہوا تھا۔

غار ثور:

یہ وہ مقدس غار ہے جس میں حضور اقدس ﷺ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہجرت کے موقع پر تین دن تین راتیں قیام فرمایا تھا اور اب بھی اسی حالت میں ہے اس لیے یقین ہے کہ اس کی زمین، اس کے در و دیوار ضرور ان حضرات کے جسم مبارک سے مس ہوئے ہیں۔ یہ غار ثور مکہ معظمہ سے قریب قریب پانچ کلومیٹر دکھن جانب ہے۔ اس کی بلندی بھی تقریباً ڈھائی کلومیٹر ہے۔

جنت المعلیٰ:

یہ مکہ معظمہ کا قبرستان ہے۔ اس کی زیارت کو بھی ضرور جائے۔ اس میں ہزار ہا صحابۂ کرام و تابعین و اولیاء اللہ کے مزارات ہیں۔ اس قبرستان کے دو حصے ہیں۔ ایک سڑک کے اتر جانب۔ اس میں اتر جانب ایک چھوٹے سے کمپاؤنڈ میں اسلام کی عظیم محسنہ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد کے مزارات ہیں۔ یہیں حضرت عبد المطلب کا بھی مزار ہے اس کی بھی زیارت کریں۔ اور ابو طالب کی بھی قبر ہے اس کی زیارت نہ کریں کہ انہیں ایمان نصیب نہیں ہوا تھا۔ دوسرا حصہ سڑک کے دکھن ہے۔ اس میں حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عبد اللہ بن زبیر اور ان کی والدہ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہم کے مزارات ہیں۔

دیگر مساجد و مآثر:

مولد النبی ﷺ جہاں حضور اقدس ﷺ کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ جگہ صفا سے پورب لب سڑک ہے۔ دو منزلہ عمارت بنی ہے نیچے کتب خانہ ہے اوپر تار، ٹیلیفون کا دفتر ہے اور بورڈ لگا ہے۔ "وزارۃ الحج والاوقاف، مکتبۃ مکۃ المکرمۃ"

دار حمزہ:

سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جائے پیدائش، یہ جگہ مسفلہ میں ہے۔ باب العجرۃ کے بالکل سامنے والی گلی میں وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس گلی کا نام ہی

"شارع حمزہ" ہے۔

مسجد ذی طوی:

تنعیم جاتے ہوئے راستے میں پڑتی ہے۔ یہاں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں قیام فرمایا تھا۔

مسجد جن:

اس جگہ جنوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا تھا۔ یہ مسجد جنت المعلیٰ کے قریب دکھن جانب ہے۔

مسجد رایہ:

اسی جگہ فتح مکہ کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا گاڑا تھا۔ یہ مسجد جن کے قریب ہی ہے۔

دار خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

اس مقدس گھر میں برسہا برس تک حضور اقدس ﷺ نے قیام فرمایا۔ یہیں تمام صاحب زادیاں اور حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ تمام صاحب زادے پیدا ہوئے۔ یہ جگہ شارع فیصل پر ایک گلی میں ہے۔ وہاں دار الحفاظ قائم ہے۔

جبل بوقبیس:

یہ صفا کے قریب بیت اللہ کے سامنے ہے۔ اسی پہاڑ پر حضور اقدس ﷺ نے چاند کو دو ٹکڑے فرمایا۔ اب وہاں ایک مسجد ہے جسے مسجد بلال کہتے ہیں۔

منیٰ میں جمرۃ العقبۃ: (بڑے شیطان) کے قریب ہی وہ مبارک گھاٹی ہے جہاں انصار کرام نے ایمان قبول فرمایا، جہاں سے ہجرت کا منصوبہ بنا۔

غار مرسلات:

یہ بھی منیٰ ہی میں ہے اس جگہ سورہ مرسلات نازل ہوئی تھی۔ اس کی بڑی فضیلت ہے۔

منیٰ ہی میں مسجد کبش بھی ہے جہاں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم حضرت اسماعیل کو قربان کرنے لے گئے تھے۔ وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ اور کثیر مخصوص مبارک آثار ہیں۔ فرصت کے ایام میں پوچھ پوچھ کر ہو سکے تو سب جگہ حاضری دے۔ بغیر پوچھے ہوئے کتابوں میں دیکھ کر تلاش کرنا ناممکن ہے۔ ذکر اس لیے کر دیا کہ اس سے یہ معلوم ہو جائے کہ مخصوص مآثر کیا کیا ہیں۔ اس کے علاوہ کتنے مآثر دار ارقم، دار ام ہانی وغیرہ نجدی حکومت نے نیست و نابود کر دیئے۔

حاضری مدینہ طیبہ

فضائل:

اللہ عزوجل فرماتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآؤُكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا . (پ ۵ سور نساء)

اپنے اوپر ظلم کرنے والے اگر تمہارے پاس حاضر ہو کر اللہ سے مغفرت طلب کریں۔ اور رسول بھی ان کے لیے استغفار کریں تو وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پائیں گے۔

حدیث (۱) حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہے (دار قطنی، بیہقی)

حدیث (۲) فرمایا جو میری زیارت کو آئے سوائے میری زیارت کے اور کسی حاجت کے لیے نہ آئے تو مجھ پر حق ہے کہ قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں۔ (طبرانی کبیر)

حدیث (۳) فرمایا: جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو ایسا ہے جیسے میری حیات میں میری زیارت سے مشرف ہوا۔ (طبرانی، دار قطنی)

حدیث (۴) فرمایا: جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی اس نے مجھ پر جفا کیا۔

(ابن عدی کامل)

زیارت اقدس قریب قریب واجب ہے۔ جو اس سے محروم رہا بہت بڑا محروم ہے۔ جب مدینہ طیبہ کا سفر شروع کرے تو اپنی خوش بختی پر ناز کرے اور اللہ عزوجل کا شکر کرے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے اپنے حبیب کے در پر لے جارہا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کے تصور میں ڈوب جاؤ۔ سرکار کی اس عنایت بے غایت پر ناز کرو کہ اپنے دربار میں بلا رہے ہیں۔ راستے بھر جس قدر زیادہ ہو سکے درود شریف پڑھتے رہو۔ جب حرم مدینہ آئے تو بہتر یہ کہ پیدل ہو۔ روتے ہوئے آنکھیں نیچی کیے ہوئے سر جھکائے ہوئے جتنی ہو سکے درود شریف کی کثرت کرو۔ اگر ہو سکے تو ننگے پاؤں چلو۔ جب گنبد خضرا نظر آئے کھڑے ہو جاؤ۔ اس وقت خصوصیت سے جتنا زیادہ ہو سکے درود وسلام کی کثرت کرو۔ الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ۔ مسجد اقدس کی حاضری سے پہلے ایسی تمام ضروریات سے فارغ ہولے جو دل بٹنے کا باعث ہوں۔ پھر ہو سکے تو غسل کرلے ورنہ وضو اور مسواک کرے۔ سفید، صاف ستھرے عمدہ سے عمدہ جو کپڑے نصیب ہوں وہ پہنے۔ خوشبو لگالے مل سکے تو مشک افضل ہے۔

غرض کہ اچھی سے اچھی، عمدہ سے عمدہ ہیئت بطریقِ مسنون ومستحب بنالو اس کے بعد آستانہ اقدس کی طرف تواضع وعاجزی کے ساتھ چلو۔ اگر اس وقت کچھ آنسو نکل آئے تو قسمت بن گئی۔ بہتر یہ ہے کہ باب جبریل سے داخل ہو۔ (یہ مشرق میں واقع ہے)

جب مسجد اقدس کے دروازے پر حاضر ہو صلاۃ وسلام عرض کرکے تھوڑی دیر رکے رہو گویا سرکار سے حاضری کی اجازت مانگ رہے ہو پھر بسم اللہ کہہ کر سیدھا پاؤں اندر رکھو اور یہ دعا پڑھو۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ.

ہوش، گوش، قلب ودماغ، آنکھ زبان سب خیالِ غیر سے پاک کرکے محبوبِ رب

العلمین کے تصور میں ڈوب جاؤ حتی کہ مسجد اقدس کے نقش ونگار زیبائش کو بھی نہ دیکھو۔ قدم بہت آہستہ آہستہ رکھو کہ آواز نہ ہونے پائے۔ خبردار! خبردار! دھیان رکھو کہ کوئی آواز بلند نہ نکلے۔

یقین جانو کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سچی، حقیقی، دنیاوی، جسمانی حیات کے ساتھ زندہ ہیں وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ نہ صرف دیکھ رہے ہیں بلکہ تمہارے دل کے خطرات وخیالات پر بھی مطلع ہیں۔ اگر اس وقت جماعت صحیحہ قائم ہوتو جماعت میں شریک ہوجاؤ ورنہ اگر غلبۂ شوق مہلت دے اور وقت مکروہ نہ ہوتو دو رکعت تحیۃ المسجد شکرانۂ حاضری دربارِ اقدس سورۂ فاتحہ اور قل یا اور قل ہواللہ سے سنت کی رعایت کرتے ہوئے مختصر سے مختصر پڑھو۔ اگر محرابِ نبوی میں جگہ مل جائے تو کیا کہنا۔ ورنہ جہاں جگہ ملے وہاں پڑھو۔ پھر سجدۂ شکر ادا کرو۔ اللہ عزوجل سے اس کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ادب کا سوال کرو اور یہ کہ حاضری کو قبول فرمالے اور حضور بھی قبول فرمالیں۔

حاضریِ بارگاہ

اس کے بعد گناہوں کی ندامت سے شرمندہ گردن جھکائے آنکھیں نیچی کیے لرزتے کانپتے کمال ادب میں ڈوبے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو وکرم کی امید رکھتے ہوئے حضور والا کی پائینتی یعنی پورب کی طرف سے مواجہۂ عالیہ میں حاضر ہو۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح جلوہ فرما ہیں کہ سر مبارک پچھم ہے اور پائے اقدس پورب ہیں اور روئے انور دکھن۔ اس کے بعد یہ تصور کرے کہ اب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ اقدس کے سامنے ہوں۔ پورے وقار وادب، خوف وامید کے ساتھ قندیل کے نیچے، چاندی کی کیل کے سامنے جو حجرۂ مبارکہ کی جنوبی دیوار میں چہرۂ انور کے مقابل لگی ہے۔ (حجرۂ مبارکہ کے اردگرد جالیاں لگ جانے کی وجہ سے یہ چاندی کی کیل نظر نہیں آتی۔ اس کے مقابل جالیوں میں گول سوراخ ہیں وہیں کھڑا ہو) کم از کم چار ہاتھ کے فاصلے سے

قبلہ کی طرف پیٹھ کیے ہوئے مزار پرانوار کی طرف منہ کر کے جیسے نماز میں ہاتھ باندھتے ہیں اس طرح باندھ کر کھڑے ہو۔ اب نہایت ادب ووقار کے ساتھ غمگین وشرمندہ دل، معتدل آواز سے یہ سلام عرض کرو۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا خَیْرَ خَلْقِ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا شَفِیْعَ الْمُذْنِبِیْنَ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ وَعَلٰی آلِکَ وَاَصْحَابِکَ وَاُمَّتِکَ اَجْمَعِیْنَ اَسْئَلُکَ الشَّفَاعَۃَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ۔

پھر جن لوگوں نے سلام عرض کرنے کی درخواست کی ہو سب کا سلام عرض کرے اپنے لیے اور اپنے متعلقین کے لیے جو چاہے مانگے۔

اس رسالہ کے پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ جب کبھی ان کی حاضری ہو ان کے اس ناکارہ غلام شریف الحق کا سلام بھی عرض کردیں۔ اسی طرح رسالہ کے شائع کرنے والے .... کا سلام بھی عرض کردیں اور ہم سب کے لیے شفاعت کا سوال کریں۔

پھر اپنے داہنے ہاتھ یعنی پورب کی طرف ایک ہاتھ کی مقدار ہٹ کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالٰی عنہ کے چہرۂ نورانی کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کرے۔ یہاں بھی جالیوں میں سوراخ بنا ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا خَلِیْفَۃَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا وَزِیْرَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا صَاحِبَ رَسُوْلِ اللّٰہِ فِی الْغَارِ وَفِی الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ ۔

پھر ایک ہاتھ اور پورب ہٹ کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالٰی عنہ کے روبرو کھڑے ہو کر عرض کرو۔ یہاں بھی گول سوراخ بنا ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُتَمِّمَ الْاَرْبَعِیْنَ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا عِزَّ الْاِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ ۔

پھر ایک بالشت پچھم کی طرف پلٹو اور حضرت صدیق وفاروق کے درمیان کھڑے

ہوکر عرض کرو۔

اَلسَّلامُ عَلَیْکُمَا یَا خَلِیْفَتَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلامُ عَلَیْکُمَا یَا وَزِیْرَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلامُ عَلَیْکُمَا یَا ضَجِیْعَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَسْأَلُکُمَا الشَّفَاعَۃَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ ۔

یہ سب حاضریاں قبولیت دعا کی جگہ ہیں۔ جتنی چاہو دعا مانگو اور درود وسلام پر اکتفا کرو تو بہتر ہے اور جی چاہے تو یہ دعا مانگو۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُشْھِدُکَ وَاُشْھِدُ رَسُوْلَکَ وَاَبَا بَکْرٍ وَّعُمَرَ وَاُشْھِدُ الْمَلَائِکَۃَ النَّازِلِیْنَ عَلٰی ھٰذِہِ الرَّوْضَۃِ الْکَرِیْمَۃِ الْعَاکِفِیْنَ عَلَیْھَا اِنِّیْ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ وَحْدَکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ وَاَنَّ سَیِّدَنَا مُحَمَّدًا عَبْدُکَ وَرَسُوْلُکَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ مُقِرٌّ بِجِنَایَتِیْ وَمَعْصِیَتِیْ فَاغْفِرْلِیْ وَامْنُنْ عَلَیَّ بِالَّذِیْ مَنَنْتَ عَلٰی اَوْلِیَائِکَ فَاِنَّکَ الْمَنَّانُ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۔ رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔

اس کے بعد منبر اطہر کے قریب حاضر ہوکر دعا مانگو پھر منبر اور روضۂ مبارک کے درمیان ریاض الجنۃ (جنت کی کیاریاں) میں حاضر ہو اور وقت اگر مکروہ نہ ہو دو رکعت نفل پڑھ کر دعا مانگو۔ مسجد شریف کے ہر ہر ستون کے پاس نماز پڑھو اور دعا مانگو۔ جب تک مدینہ طیبہ کی حاضری نصیب ہو ایک سانس ضائع نہ ہونے دو۔ ضروریات کے سوا اکثر وقت مسجد اقدس میں باطہارت حاضر رہو۔ نماز تلاوت، درود میں وقت گزارو۔ کوشش کرو کہ کم از کم ایک ختم قرآن مجید وہاں ہوجائے۔ اگر قوت ہو تو دن روزے میں گزارو۔ کم از کم چالیس نمازیں مسجد اقدس میں ضرور پڑھو اس پر نفاق اور دوزخ سے آزادی کا وعدہ ہے۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھو کہ نماز یا کسی وقت بھی مزار اقدس کی طرف پیٹھ نہ ہو۔

جنت البقیع کی زیارت سنت ہے۔ سرکار اعظم کی حاضری کے بعد وہاں حاضر ہو خصوصاً جمعہ کے دن۔ یہاں قریب قریب بیس ہزار صحابہ مدفون ہیں۔ یہاں جب حاضر ہو تو سارے آسودگان بقیع کو مخاطب کر کے یوں سلام عرض کرو۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ اَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ وَّاِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی بِکُمْ لَاحِقُوْنَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِاَھْلِ الْبَقِیْعِ بَقِیْعِ الْغَرْقَدِ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَھُمْ ۔

چاہے تو اتنا اور بڑھا لے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِوَالِدَیْنَا وَلِاُسْتَاذِنَا وَلِاِخْوَانِنَا وَلِاَوْلَادِنَا وَلِاَحْفَادِنَا وَلِاَصْحَابِنَا وَلِاَحْبَابِنَا وَلِمَنْ لَہٗ حَقٌّ عَلَیْنَا وَلِمَنْ اَوْصَانَا وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ۔

پھر درود شریف، سورہ فاتحہ، آیت الکرسی، چاروں قل، یا جتنا قرآن شریف پڑھ سکو سب کے لیے ایصال ثواب کرو۔ اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضر ہو کر سلام عرض کرو۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا ثَالِثَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا ذَا الْھِجْرَتَیْنِ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا ذَا النُّوْرَیْنِ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُجَھِّزَ جَیْشِ الْعُسْرَۃِ بِالنَّقْدِ وَالْعَیْنِ ۔ جَزَاکَ اللّٰہُ عَنْ رَسُوْلِہٖ وَعَنْ سَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَرَضِیَ اللّٰہُ عَنْکَ وَعَنِ الصَّحَابَۃِ اَجْمَعِیْنَ ۔

حضور اقدس ﷺ کے صاحبزادے حضرت سیدنا ابراہیم اور صاحبزادی حضرت رقیہ اور دیگر صحابۂ کرام کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ حضرت عباس، حضرت امام حسن، سر مبارک حضرت امام حسین کے مزارات پر حاضر ہو۔ ازواج مطہرات کے مزارات پر بھی حاضری دے۔ اب حکومت گیٹ میں تالا بند کیے رہتی ہے۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ اس لیے گیٹ کے باہر سے ہی کھڑے ہو کر سلام کرے اور فاتحہ پڑھے۔ (میں ۱۴۰۵ھ میں حاضر ہوا تھا۔ سنا ہے اب مخصوص اوقات میں کھول دیا جاتا ہے)

قبا شریف کی ضرور زیارت کرے۔ ہفتہ کا دن ہو تو بہتر اور پیدل جائے تو کیا کہنا۔ وہاں حاضر ہو کر دو رکعت نماز نفل پڑھے۔ حدیث میں ہے قبا میں نماز عمرہ کے مثل ہے۔ شہدائے احد شریف کی بھی زیارت کرے۔ حضور اقدس ﷺ ہر سال کے شروع میں یہاں تشریف لے جاتے۔ کوہِ احد کی بھی زیارت کرے، کوہِ احد پر چڑھے بھی اور اس پر اُگی ہوئی

سبزیوں میں سے کچھ کھائے بھی۔ ہمیشہ پنج شنبہ کے دن صبح کو بہتر ہے۔ مسجد غمامہ، مسجد قبلتین، مساجد خمسہ وغیرہ کی بھی زیارت سے مشرف ہو۔ مدینہ طیبہ کے وہ مبارک کنوئیں جو حضور کی طرف منسوب ہیں کسی سے حضور نے وضو فرمایا، کسی کا پانی پیا، کسی میں لعاب دہن ڈالا ان کی بھی زیارت کرے۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا زِیَارَةَ حَرَمِکَ وَحَرَمِ حَبِیْبِکَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ۔

واپسی کے بعد

گھر واپس ہونے کے بعد حج وزیارت کی نعمت ملنے پر اللہ عزوجل کا شکر ادا کرے۔ اللہ کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے سچے ارشاد کے مطابق یہ اعتقاد رکھے کہ اب میں گناہوں سے پاک صاف ہوگیا ہوں اس لیے اب پوری کوشش کرے کہ اللہ عزوجل اور اس کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرے اور ہر گناہ سے بچے۔

حج مبرور مقبول کی یہی علامت ہے کہ حج کے بعد آدمی کا حال پہلے کی بہ نسبت بہتر ہوجائے یعنی دین کی پابندی اللہ عزوجل کا خوف، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے حیا بڑھ جائے۔ ایک بار یہ نعمت ملی ہے دوبارہ ملے یا نہ ملے کون جانے۔

مناسک حج ایک نظر میں

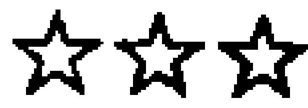
حج کا پہلا دن ۸؍ذی الحجہ	حج کا دوسرا دن ۹؍ذی الحجہ	حج کا تیسرا دن ۱۰؍ذی الحجہ	حج کا چوتھا دن ۱۱؍ذی الحجہ	حج کا پانچواں دن ۱۲؍ذی الحجہ
مکہ سے منیٰ کو روانگی	فجر کی نماز منیٰ میں ادا کر کے عرفات کو روانگی	مزدلفہ میں اول وقت فجر کی نماز کے بعد واجب وقوف، ذکر ودعا۔ سورج نکلنے میں جب دو رکعت ادا کرنے کا وقت باقی رہے تو منیٰ کو روانگی	منیٰ میں رمی کرنا زوال کے بعد	منیٰ میں رمی کرنا زوال کے بعد
منیٰ میں آج کے دن	ظہر کی نماز عرفات میں پڑھنی ہے	وہاں پہلے بڑے شیطان کی رمی	پہلے چھوٹے شیطان کی	پہلے چھوٹے شیطان کی
ظہر	وقوف عرفات	پھر قربانی کرنا	پھر درمیانے شیطان کی	پھر درمیانے شیطان کی
عصر	عصر کی نماز عرفات میں پڑھنی ہے	پھر سر کے بال مونڈانا یا کتروانا	پھر بڑے شیطان کی رمی کرنا ہے	پھر بڑے شیطان کی رمی کرنا ہے
مغرب	مغرب کے وقت مغرب کی نماز پڑھے بغیر مزدلفہ کو روانگی	پھر طواف زیارت کو مکہ جانا	طواف زیارت اگر کل نہیں کیا تھا تو آج کر لیں	طواف زیارت اگر نہیں کیا تھا تو آج مغرب سے پہلے ضرور کر لیں
عشا پڑھنی ہیں	مغرب اور عشا کی نمازیں عشا کے وقت مزدلفہ میں ادا کرنی ہیں	رات منیٰ میں قیام	رات منیٰ میں قیام	۱۳؍ذی الحجہ کو اگر قیام کیا تو اس دن بھی تینوں جمروں پر رمی واجب ہے اس کا وقت صبح تا غروب آفتاب ہے مگر قبل زوال مکروہ ہے
رات منیٰ میں قیام	رات مزدلفہ میں قیام کرنا ہے	☆☆☆	☆☆☆	☆☆☆

نوٹ: اس کے علاوہ حج کے بقیہ دنوں میں روزمرہ کی طرح نمازیں ادا کریں۔

طواف زیارت کا وقت ۱۰/ذی الحجہ کی فجر سے ۱۲/ذی الحجہ کے غروب آفتاب یعنی مغرب تک ہے۔طواف زیارت سے رات کے کسی بھی حصہ میں فارغ ہوں تو بقیہ رات قیام کے لیے منیٰ چلے جائیں۔

(یہ قیمتی مضمون ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور مئی ۱۹۹۱ء کے شماروں میں دو قسطوں میں شائع ہوا، اور الگ سے پاکٹ سائز کے کتابی شکل میں بھی اشاعت ہوئی۔افادیت کے پیش نظر نذر قارئین ہے)

اسے پاکٹ سائز کتابی شکل میں سب سے پہلے حاجی غلام حسین خازن جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے شائع کیا۔ پھر المجمع الاسلامی مبارک پور نے شائع کیا۔ یہ رسالہ دونوں جگہوں سے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔



رمی جمرات کے اوقات میں
تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں

روز نامہ ''انقلاب'' بمبئی کی ۱۴یا۱۵/اپریل کی اشاعت میں ایک مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے۔''رمی جمرات کے اوقات میں تبدیلی لانے پر غور'' جس کے اندر مکتوب تھا کہ جمرات پر کنکری مارنے پر جو حوادثات ہر سال ہوتے رہتے ہیں۔اس لیے سعودی مفتی صاحبان اس پر غور کر رہے ہیں کہ اس کے اوقات میں تبدیلی کر لی جائے۔ ۱۲/۱۱/ذی الحجہ کو کنکری مارنے کا وقت بعد ظہر شروع ہوتا ہے۔اس کو بدل کر نماز فجر کے بعد سے شروع کر دیا جائے۔نیز سعودی مفتی صاحبان کا خیال ہے کہ شیطان کو کنکری مارنے کے رکن پر ظہر سے پہلے عمل شروع کرنا اسلامی روایات کے خلاف نہیں ہوگا۔توقع ہے کہ آئندہ سال حج سے قبل اس سلسلے میں فتویٰ جاری کر دیا جائے گا۔

نیز اسی میں لندن کے اخبار ''الحیات'' کے حوالے سے خبر دی ہے کہ اس قسم کے فتویٰ کی راہ ہموار کرنے کے لیے سعودی علما جو وہابی مکتب فکر کے سخت پابند ہیں آٹھویں صدی کے ابوحنیفہ النعمان کی لچک دار تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے غیر معمولی اقدام کریں گے۔

یہ پورا مضمون کئی وجہ سے قابل تنقید ہے۔ہم اس وقت سر دست اس بات پر روشنی ڈال رہے ہیں کہ کیا شرعاً اس کی گنجائش ہے کہ ۱۲/۱۱/ذی الحجہ کو کنکری مارنے کا وقت نماز فجر کے بعد مقرر کرنا درست ہے؟اور کیا حنفی مذہب کے مطابق ایسا کرنا صحیح ہے؟۔

اول:۱۲/۱۱/ذی الحجہ کو کنکری مارنے کے وقت کی ابتدا دوپہر ڈھلنے سے ہوتی ہے۔اس کے پہلے کنکری مارنا کالعدم ہے۔اس لیے کہ حج کے ارکان قیاسی نہیں کہ ہم اپنی عقل ومنشا کے مطابق اس میں جو چاہیں ردوبدل کریں،حج کے سارے ارکان اور ان کے اوقات من جانب الشرع متعین اور مقرر ہیں۔حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اقدس ﷺ نے جس طرح جس ترتیب اور اوقات کی تعین کے ساتھ حج فرمایا اسی طرح ہم پر حج کے افعال ادا

کرنا لازم ہے۔اس کے خلاف کرنے سے حج میں نقص لازم آئے گا۔اس سلسلے میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

بخاری جلد اول صفحہ ۲۳۵، مسلم جلد اول صفحہ ۴۲۰۔ابو داؤد جلد اول صفحہ ۲۷۱ میں ہے:

عن جابر قال رمی رسول اللہ ﷺ الجمرۃ یوم النحر ضحی واما بعد فاذا زالت الشمس.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم نحر (دسویں ذی الحجہ) کو چاشت کے وقت کنکری ماری اور اس کے بعد جب سورج ڈھل گیا تب ماری۔

نیز ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

فمکث بھا لیالی ایام التشریق یرمی الجمرۃ اذا زالت الشمس.(ابو داؤد جلد اول صفحہ ۲۷۱)

حضور ﷺ نے ایام تشریق میں منیٰ میں قیام فرمایا اور جمرہ پر کنکری مارتے جب سورج ڈھل جاتا۔

اسی کے مطابق صحابۂ کرام کا عمل یہ تھا کہ ۱۱/۱۲ ذی الحجہ کو زوال کے بعد کنکری مارا کرتے تھے۔ابو داؤد میں اسی صفحہ پر نیز بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول مذکور ہے:

کنا نتحین زوال الشمس فاذا زالت الشمس رمینا.

ہم سورج ڈھلنے کا انتظار کرتے رہتے، جب سورج ڈھل جاتا تو ہم کنکری مارتے۔

ان احادیث کی روشنی میں چاروں ائمہ مذاہب حضرت امام اعظم ابو حنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی، حضرت امام حنبل رضی اللہ عنہم اجمعین کا متفقہ مذہب یہ ہے کہ ۱۱/۱۲ ذی الحجہ کو کنکری مارنے کا وقت دو پہر بعد سے شروع ہوتا ہے۔اس کے قبل وقت نہیں ہوتا۔کچھ اسلاف کا یہ مذہب ضرور ہے کہ ان دنوں میں قبل زوال بھی رمی صحیح ہے۔مگر ان حضرات کا قول مرجوح ہونے کی وجہ سے بالکلیہ متروک ہے۔

عہد رسالت سے آج تک پوری امت کا یہی مذہب ہے اور اسی پر عمل ہے ان دنوں میں رمی جمار کا وقت زوال سے پہلے نہیں ہوتا زوال کے بعد شروع ہوتا ہے۔کسی نے امن

تاریخوں میں زوال سے پہلے رمی نہیں کی۔

حضرت امام نووی شافعی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

واما ایام التشریق فمذھبنا و مذھب مالک و احمد و جماھیر العلماء انہ لا یجوز الرمی فی الایام الثلاثۃ الا بعد الزوال لھذا الحدیث الصحیح دلیلنا انہ ﷺ رمی کما ذکرنا و قال ﷺ لتاخذو امنا سککم۔(جلد ا ص ۴۲)

ہمارا اور امام مالک اور امام احمد اور جمہور علما کا مذہب یہ ہے کہ ایام تشریق (۱۳/۱۲/۱۱ رذی الحجہ) میں زوال سے پہلے رمی جائز نہیں۔اس حدیث صحیح کی وجہ سے، ہماری دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ویسے ہی رمی فرمائی جیسے ہم نے ذکر کیا، اور ارشاد فرمایا کہ تم لوگ مجھ سے حج کے ارکان سیکھ لو۔

حتیٰ کہ علامہ ماوردی نے اس پر اجماع کا دعویٰ فرمایا جیسا کہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد ثالث صفحہ ۲۲۹ پر ہے، اور یہی دیوبندی جماعت کے ممتاز اور معتمد عالم خلیل احمد انبیٹھی نے بذل المجہود میں لکھا:

فاما بعد ذالک الی یوم النحر فبعد زوال الشمس ای فرمی الجمار الثلاث بعد زوال الشمس وھذہ المسئلۃ مجمع علیھا۔(بذل المجھود جلد ۳ صفحہ ۱۷۹)

یوم نحر (دسویں تاریخ) کے بعد تینوں جمرات کی رمی سورج ڈھلنے کے بعد ہے۔اور اس پر اجماع ہے۔

قرن ثانی میں اس مسئلے میں کچھ اختلاف تھا مگر اس کے بعد احادیث صحیحہ کی بنا پر پوری امت کا اس پر اتفاق ہوگیا کہ ۱۲/۱۱ رذی الحجہ کو قبل زوال رمی جائز نہیں، اور حضرت علامہ ماوردی کے دعویٰ اجماع کا حاصل یہی ہے۔

رہ گیا احناف کا مذہب وہ بھی صحیح، مختار، مفتیٰ بہ یہی ہے کہ گیارہویں بارہویں کو قبل زوال رمی جائز نہیں۔ان دنوں میں رمی کی وقت بعد زوال ہے سارے متون میں یہی مذکور ہے۔

قدوری میں ہے:

فاذا زالت الشمس من الیوم الثانی من ایام النحر رمی الجمار الثلاث (الیٰ

ان قال)فاذا کان من الغد رمی الجمار الثلاث بعد زوال الشمس . (صفحہ ۹۹)
یوم نحر کے دوسرے دن جب سورج ڈھل جائے تو تینوں جمار پر کنکری مارے ایسے ہی اس کے دوسرے دن زوال شمس کے بعد کنکری مارے۔

اور یہی فتاویٰ خانیہ، ہدایہ، کنز، تنویر الابصار، نور الایضاح وغیرہ سارے متون میں ہے۔
ہمارا اصل مذہب وہی ہے جو متون میں مذکور ہے، اور یہی ہمارے علماے احناف کا مختار و مفتیٰ بہ ہے۔ جیسا کہ کتب فقہ سے ظاہر ہے۔ ہاں! ایک روایت ضعیف حضرت امام حسن سے تو یہی ہے کہ ۱۲ رتاریخ کو بعد زوال رمی کی جائے، لیکن اگر کسی نے قبل زوال کرلیا تو کافی ہے۔

ہدایہ میں ہے:
فی المشہور من الروایۃ.
اس کے تحت عنایہ میں ہے:
احتراز عما روی الحسن عن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ انہ ان کان من قصدہ ان یتعجل فی النفر الاول فلا باس بان یرمی فی الیوم الثالث قبل الزوال وانما بعدہ فہو افضل.(جلددوم صفحہ ۳۹۳)
(مشہور کی قید)اس سے احتراز ہے، جو امام حسن نے امام ابو حنیفہ سے روایت کی کہ اگر اس کا قصد یہ ہے کہ نفر اول میں جلدی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ تیسرے دن زوال سے قبل رمی کرلے، اور اگر زوال کے بعد رمی کرلے تو افضل ہے۔
مگر اس روایت کو ہمارے علمانے دو طرح مرجوح قرار دیا، اول: جو متون میں ہے وہ ظاہر مذہب ہے، اور یہ روایت نوادر میں سے ہے۔ روایت نوادر کے مقابل ظاہر مذہب کو ترجیح ہوگی۔ ثانی: دلیل کے اعتبار سے بھی یہ مرجوح ہے۔ امام ابن ہمام نے اور صاحب عنایہ وغیرہ نے فرمایا کہ حج کے ارکان کی ادائیگی کے وقت اور جگہ کے سلسلے میں حضور اقدس ﷺ کی پیروی لازم ہے۔ جس طرح یہ جائز نہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے جو رکن جہاں ادا کیا اس جگہ کو تبدیل کیا جائے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ وقت میں تبدیلی کی جائے۔

اور جب قبل زوال رمی کی اجازت مرجوح اور ضعیف ہے تو نہ اس پر فتویٰ دینا درست اور نہ اس پر عمل جائز۔ درمختار میں ہے:

فعلینا اتباع مارجحوہ وصححوہ الفتیا بالقول المرجوح جھل وخرق للاجماع.

ہم پر اسی کا اتباع واجب ہے، جس کی علما نے تصحیح کی، جس کو ترجیح دیا، قول مرجوح پر فتویٰ دینا جہالت اور خرق اجماع ہے۔

اس کو آپ یوں سمجھئے جیسے کسی بارے میں حدیث صحیح اور ضعیف متعارض ہوں تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حدیث صحیح کو ترجیح ہوگی اس طرح اگر کسی امام سے دو روایتیں متعارض ہوں ایک صحیح دوسری ضعیف تو صحیح کو ترجیح دینا لازم ہے۔ تعجب ہے علماے سعودیہ پر کہ وہ ادنیٰ ادنیٰ سی جرح پر احادیث حسنہ کو بھی نا قابل عمل قرار دیتے ہیں۔ اور یہاں صحیح حدیث کے خلاف اور سارے مذہب کے صحیح قول کے خلاف ایک ضعیف مرجوح روایت پر عمل کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ نیز یہ لوگ اپنے آپ کو حنبلی کہتے ہیں، حنبلی مذہب بھی یہی ہے کہ ۱۱/۱۲/ ذی الحجہ کو بعد زوال رمی کی جائے۔ قبل زوال رمی جائز نہیں۔

مذہب حنبلی کی معتبر کتاب المغنی لابن قدامہ جلد ثالث صفحہ ۴۵۲ پر ہے:

ولا یرمی فی ایام التشریق الا بعد الزوال فان رمی قبل الزوال اعاد.

ایام تشریق میں رمی نہ کرے مگر بعد زوال۔ اگر قبل زوال رمی کرے تو لوٹائے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے ایسی کوئی روایت نہیں کہ ۱۲/ کو قبل زوال رمی جائز ہے۔ اس سے ثابت کہ حنابلہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ۱۲/ اور ۱۳/ کو قبل زوال رمی درست نہیں بعد زوال ہی رمی ضروری ہے۔

رہ گئے حوادثات کی وجہ سے ارکان حج کے اوقات میں تبدیلی کسی طرح مسلمان برداشت نہیں کر سکیں گے۔ یہ حوادث بر سہا برس سے ہو رہے ہیں مگر سعودی حکومت نے اس کے سد باب کے لیے نہ کچھ سوچا نہ انتظام کیا مجھے حیرت ہے کہ سعودی حکومت ساڑھے چار سو ریال فی حاجی کس لیے وصول کرتی ہے؟۔

حوادث کے اسباب میں سب سے بڑا سبب حجاج کی عجلت ہے۔ نیز حکومت کی

لاپرواہی۔ یہ حوادث زیادہ تر دس کو ہوتے ہیں۔ یا ۱۲ر کو۔ دس کو حجاج کو یہ جلدی رہتی ہے کہ جلد از جلد احرام کھول دیں حالاں کہ وہ اگر صبر کریں اور احرام کھولنے کے لیے بےچین نہ ہوں تو کوئی حادثہ نہ ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۰ر کو زوال سے پہلے پہلے کنکری مار لینا سنت ہے۔ لیکن اس کا وقت غروب آفتاب تک بلا کراہت ہے۔ بلکہ رات میں بھی اگر عذر کی بنا پر کنکری ماریں تو کراہت نہیں۔

اسی طرح ۱۲ر کو اگر وہ مکہ واپس ہوں تو جلدی نہ مچائیں تو کوئی حادثہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں حکومت پر لازم ہے کہ وہ جمرہ پر بہت مستعد اور چاق چوبند فوجیوں یا شرطیوں کو متعین کریں اور ان کی مقدار بھی معتد بہ ہو، جو بھیڑ پر قابو پا سکیں۔ ایک اندازہ لگا لیں کہ بیک وقت ایک جمرے پر کتنے آدمی کنکری مار سکتے ہیں اتنی ہی آدمیوں کو وقفے وقفے پر جمرہ پر جانے دیں تو کوئی حادثہ نہ ہوگا۔ اس طریقے پر مزید غور کر کے مناسب اقدام کیا جائے۔ پھر جب علما نے تصریح فرمادی کہ اگر دن میں کسی عذر کی وجہ سے ۱۲ر کو کنکری نہیں مار سکا تو رات میں بلا کراہت جائز ہے، زیادہ سے زیادہ یہی نہ ہوگا کہ ۱۳ر کو منیٰ میں پھر رہنا پڑے گا، تو اس میں کیا حرج ہے۔ ایک دن مزید رک جائیں۔ ۱۳ر کو بعد زوال کنکری مار کر مکہ واپس آئیں۔ یہ عمل بلا شبہہ سنت و شریعت کے مطابق ہوگا۔ لیکن اگر بالفرض سعودی مفتیوں نے رمی کے وقت میں تبدیلی کی تو یہ دین میں ان کی بے جا مداخلت ہوگی، جسے مسلمان کبھی نہیں برداشت کر سکیں گے۔

دسویں کو تو صبح ہی سے کنکری ماری جاتی ہے، اس کے باوجود اس دن بھی حادثے ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ خلاف شرع وقت کی تبدیلی مسئلے کا حل نہیں بلکہ انتظام کی درستی یا شریعت کی رخصت کے مطابق تاخیر۔ مسئلے کا حل ہو سکتی ہے۔

مضمون مذکور میں ہے کہ رمی کا وقت بعد ظہر ہے، یہ غلط ہے۔ رمی کا وقت دوپہر کے بعد فوراً ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اگر کسی نے نماز نہیں پڑھی، دوپہر ڈھلتے ہی فوراً ہی رمی کر لی تو صحیح ہے، اسی طرح اس میں یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ آٹھویں صدی کے امام ہے، یہ بھی غلط ہے۔ حضرت امام اعظم دوسری صدی کے امام اور تابعی ہیں۔

مہر اور جہیز
کے سلسلے میں ایک گزارش

آج سے چالیس پچاس سال پہلے اعظم گڑھ کے مشرقی حصہ میں انصاری برادری میں مہر ۲۵/روپے سکہ رائج الوقت متعین تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ۵۱/روپے ہوا، اور اب ۲۵۱/روپے ہے۔

جب مہر پچیس روپے تھا تو چاندی کے روپے کا چلن تھا، اس لیے رائج الوقت سے وہی چاندی کے روپے مراد ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تنازع کے بعد مہر میں چاندی کے پچیس روپے دیے جاتے تھے۔

اور آج کل چاندی کے روپیوں کا چلن بند ہوگیا ہے، نوٹ یا نکل کے روپے چلتے ہیں۔ آج جب سکۂ رائج الوقت کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہر ۲۵۱/روپے نوٹ ہیں۔

اب ہر شخص کے لیے لمحہ فکر یہ ہے کہ جب غربت و افلاس تھا تو مہر چاندی کے پچیس روپے تھے، جس کی قیمت نوٹوں سے اس وقت لگ بھگ پونے دو ہزار روپے ہوتے ہیں، اور آج جب کہ فراخی اور وسعت زر ہے مہر صرف ۲۵۱/ روپے، یہ انتہائی نا مناسب بات ہے۔ ہمارے سماج میں لڑکیاں ماں، باپ کے بس میں ہوتی ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مردہ بدست زندہ ہوتی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اپنے شادی کے معاملہ میں اف نہیں کر سکتی ہیں۔ ہمارا ماحول ایسا ہے کہ اگر بے زبان مجبور لڑکیاں اپنی شادی کے معاملہ میں زبان کھول دیں تو گستاخ، زبان دراز وغیرہ خطابات سے نوازی جائیں گی۔ مہر ان کا حق ہے، اگر وہ ماحول کے دباؤ کی وجہ سے یا اپنی فطری حیا کی وجہ سے کچھ نہ بولیں یہ ان کی سعادت ہے۔ مگر باپ

پر فرض ہے کہ وہ اپنی لڑکی کے حق کو سمجھے اور اسے پورا پورا دے۔ ہندوؤں سے سیکھ کر اب مسلمانوں میں ضرورت سے زیادہ جہیز دینے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہو چکا ہے۔ لیکن مہر جو خاص اسلامی چیز ہے، اور لڑکی کا حق ہے اس پر کوئی بھی غور نہیں کر رہا ہے۔ ہم عوام کی آگاہی کے لیے ازواج مطہرات اور سیدہ فاطمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین کے مہر اور جہیز کی تفصیل درج کر دیتے ہیں۔ مسلمان اسے دیکھیں اور اللہ توفیق دے تو اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں۔

حضور اقدس ﷺ کی ازواج مطہرات اور بنات مکرمات کا مہر پانچ سو درہم سے زائد نہ تھا۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ماعلمت رسول اللہ ﷺ نکح شیئا من نسائه ولا انکح شیئاًمن بناته علیٰ اکثر من اثنتی عشرة اوقیة.

میں نہیں جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہ اوقیہ سے زیادہ پر اپنا یا اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کیا ہو۔

اس میں حضرت ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر ایک روایت میں چار ہزار درہم تھا جیسا کہ ابو داؤد میں ہے۔ اور دوسری روایت کی بنا پر چار ہزار دینار تھا جیسا مستدرک میں ہے۔ مگر ان کا مہر شاہ حبشہ نجاشی رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے ادا کیا تھا۔ اور حضرت بتول زہرا رضی اللہ عنہا کا مہر اقدس چار سو مثقال چاندی تھا۔ چاندی کا وزن انگریزی چاندی والے چہرہ دار روپے سے ایک سو ساٹھ روپے ہے، جس کی قیمت آج کے سکے سے دس ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ اور پانچ سو درم کے چاندی والے چہرہ دار روپے سے ایک سو چالیس روپے بھر ہوا، جس کی قیمت موجودہ سکوں سے تقریباً نو ہزار ہوگی۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے سوا اور ازواج مطہرات کا مہر آج کے سکے سے لگ بھگ نو ہزار تھا اور حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا مہر مبارک لگ بھگ دس ہزار روپے تھا۔ ازواج مطہرات کو ان کے میکے سے جہیز کیا ملا؟۔ اس سلسلے میں مجھے اب تک کوئی تفصیل نہیں مل سکی البتہ حضرت بتول زہرا رضی اللہ عنہا کو حضور اقدس ﷺ نے جو جہیز دیا تھا، وہ یہ

ہے ایک بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا جس کی اندر روئی کے بجائے کھجور کی شاخوں کے ریشے تھے، ایک چھاگل (پیالہ) ایک مشک دو چکیاں اور مٹی کے دو گھڑے۔

اب ہر مسلمان کے لیے لمحہ فکر یہ ہے کہ وہ مہر اور جہیز دونوں کے سلسلے میں اسلامی نظریے کو سمجھیں کہ اسلام میں مہر کی کیا حیثیت ہے، اور جہیز کی کیا حیثیت ہے۔ پھر اس روایت کو بھی سن لیں کہ اس وقت حضرت علی مرتضیٰ بہت ہی تنگ دست تھے، ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ صرف ایک زرہ تھی جو بدر کے موقع پر خود حضور اقدس ﷺ نے عطا فرمایا تھا۔ مگر پھر بھی وہ مہر مقرر ہوا۔ اور آج لڑکی کسی حیثیت کی ہو لڑکا کسی بھی حیثیت کا ہو مہر وہی ۲۵۱ر روپے۔ یہ اپنی بچیوں پر ظلم ہے۔ تمام ذمہ دار ذی اثر مسلمانوں سے اپیل ہے کہ وہ لڑکیوں کے مہر کے معاملے میں غور وخوض باہمی رائے مشورہ کے بعد ایسی مقدار مقرر کریں جو مناسب ہو، جس میں لڑکیوں کی حق تلفی نہ ہو۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اب پنچایتی طور پر مہر کی مقدار کم از کم دو ہزار کر دی جائے، اور یہ ہرگز زیادہ نہیں۔ گزر چکا کہ چالیس پچاس سال پہلے پنچایتی طور پر مہر پچیس روپے چاندی تھا۔ جس کی قیمت لگ بھگ پونے دو ہزار ہوتی ہے۔ وہ عسرت اور تنگ دستی کا زمانہ تھا اس لحاظ سے دو ہزار مہر زائد نہیں۔

دوسری نہایت اہم گزارش یہ ہے کہ جہیز کے سلسلے میں جہاں تک ہو کمی کی جائے۔ اللہ توفیق دے تو بقدر ضرورت لڑکیوں کو جہیز دیا جائے مگر اتنا نہیں کہ خود بار ہو اور لڑکی والوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کہ روا کے مطابق جہیز کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے رشتے لگنے کے باوجود لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتی ہے۔ بسا اوقات رشتہ ختم کرنا پڑتا ہے۔ اگر مشترکہ طور پر جہیز کے لیے کچھ پابندی لگا دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

جہیز کی شرعی حیثیت

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ اب ادھر چند برسوں سے مسلمانوں میں یہ رواج ہوتا جا رہا ہے کہ لڑکوں کی شادی طے کرتے وقت جہیز کی مقدار معین مانگتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ دس ہزار نقد لیں گے اور موٹر سائیکل لیں گے اور گھڑی لیں گے۔ اگر لڑکی والے اس کو منظور کرتے ہیں تو شادی طے ہوتی ہے ورنہ کینسل کر دیتے ہیں۔ طے ہونے کے بعد اگر لڑکی والے ان مقررہ جہیز میں کچھ بھی کم دیتے ہیں تو اس کے لیے جھگڑا کھڑا کرتے ہیں۔ بدنام کرتے ہیں بلکہ بعض دفعہ برات تک واپس ہو جاتی ہے۔ اور اگر لڑکی سسرال گئی تو اسے زندگی بھر طعنہ دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکی بیٹھا دیتے ہیں کہ جب تک فلاں فلاں چیز جو مقرر جہیز میں سے اب تک نہیں ملی ہے، ملے گی نہیں، ہم تم کو نہیں رکھیں گے۔ کیا شرعاً یہ جائز ہے۔ بینوا توجروا۔

المستفتی: وکیل عبد الاول صاحب، اشرفیہ مبارک پور

جواب:

جہیز کی مقدار طے کرنا بلکہ مقدار نہ بھی معین ہو کہیں شادی طے کرتے وقت جہیز کا مطالبہ ہی کرنا یا شادی کے وقت مطالبہ کرنا یا شادی ہو جانے کے بعد جہیز کا مطالبہ کرنا یہ سب حرام ہے۔ اور یہ رشوت مانگنا ہے جو مال لیا مال حرام لیا۔ رشوت لیا۔ فرض ہے کہ اسے واپس کرے۔ اس کو استعمال میں لانا حرام ہے۔

شامی کتاب الھبۃ میں ہے:

جعلت المال علی نفسها عوضا عن النکاح وفی النکاح العوض لا یکون علی المرأۃ.(ج ۵ . ص ۷۰۱)

عورت جو مال اپنے نکاح کے عوض دے وہ باطل ہے، نکاح میں عوض عورت پر نہیں۔

عورت دے یا اس کے ماں باپ بھائی دیں سب ایک حکم میں ہے۔ کتب فقہ کی یہ تصریح کہ نکاح میں عوض عورت کے ذمہ نہیں سب کو شامل ہے۔ ہماری شریعت نے نکاح میں عوض مرد کے ذمہ رکھا ہے حتیٰ کہ اگر مرد و عورت نے بغیر مہر مقرر کیے نکاح کیا جب بھی مہر مرد پر واجب ہے بلکہ اگر یہ شرط کردی کہ کچھ مہر نہ ہوگا جب بھی مہر مثل واجب ہے اگر نکاح کے بعد وطی یا خلوت صحیحہ ہوگئی۔ درمختار میں ہے۔

و کذا یجب مهر المثل فیما اذا لم یسم مهرا او نفی ان وطی الزوج او مات عنها او لم یتراضا علی شئی یصلح مهرا والا فذالک الشئی هو الواجب. (جلد سوم: صفحه ۱۰۸)

اگر مہر مقرر نہیں کی یا مہر کا نام نہ لیا۔ یا مہر کی نفی کر دی تو مہر مثل واجب ہے اگر شوہر نے وطی کر لی یا مر گیا۔ ہاں اگر دونوں نے رضا مندی سے کوئی مقدار کسی ایسے چیز کی مقرر کر لی جو مہر ہو سکے تو وہی واجب ہے۔

عورت یا عورت کے اولیا سے مال مانگنا یہ قلب موضوع اور الٹا ہے علاوہ ازیں کتب فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ اگر عورت کے بھائی نے نکاح کے عوض کچھ مال مانگا تو یہ رشوت ہے۔ اور شوہر اسے واپس لے سکتا ہے، نکاح کے عوض عورت کے اولیا کا کچھ لینا رشوت اور حرام ہے۔ جب کہ خود عورت کو شریعت نے نکاح کے عوض مہر لینے کا حق دیا ہے تو مرد کو یا مرد کے متعلقین کو کچھ لینا بدرجہ اولیٰ رشوت ہوگا۔ عالمگیری میں ہے:

خطب امرأة فی بیت اخیها فابی ان یدفعها حتیٰ یدفع الیه دراهم فدفع وتزوجها یرجع بما دفع لانها رشوة کذا فی القنیة.

کسی کی بہن کو نکاح کا پیغام دیا۔ بھائی نے انکار کیا کہ جب تک کچھ روپے نہیں دو گے منظور نہیں، مرد نے دیا اور نکاح کر لیا جو دیا ہے واپس لے سکتا ہے اس لیے کہ یہ رشوت ہے، ایسا ہی قنیہ میں ہے۔ (ج:۴ص۴۰۳)

اور درمختار و ردالمحتار میں ہے:

اخذ اهل المرأة شیئا عندا لتسلیم فللزوج ان یسترده لانه رشوة ای

بان ابی ان یسلمها اخوها او نحوه حتی یا خذشیئا و کذا لوابی ان یزوجهافللزوج الاسترداد قائما او هالکا لانه رشوة.(ج ۳ ص ۱۵۶)

رخصتی کے وقت لڑکی والوں نے اگر کچھ لیا ہے تو شوہر کو اسے واپس لینے کا حق ہے کیوں کہ وہ رشوت ہے یعنی اگر بھائی وغیرہ نے بغیر کچھ لیے رخصت کرنے سے انکار کر دیا یا شادی سے انکار کر دیا تو شوہر کو حق حاصل ہے کہ اسے واپس لے لے چاہے وہ مال موجود ہو چاہے ختم ہو گیا ہو اس لئے کہ یہ رشوت ہے۔ یہاں تو ایک طرح کا جبر ہے اسی میں یہاں تک تصریح ہے کہ خسر اگر داماد سے کچھ لے وہ بخوشی دے تو بھی مال حرام ہے۔

ومن السحت ما یاخذه الصهر من الختن بطیب نفسه.

خسر داماد سے جو کچھ (مانگ کر) لے اگر چہ داماد بخوشی دے مال حرام ہے، تو جبر کی صورت میں بدرجہ اولی حرام۔

یہ لعنت مسلمانوں نے ہندوؤں سے سیکھی۔ الناس علی دین ملوکہم لوگ اپنے بادشاہ کے طریقے پر ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کی غلامی نے ذہنوں پر اثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان کے مذہب میں تلک چڑھانے کی رسم ہے اس کی بنیاد اس پر ہے کہ چوں کہ وہ لڑکی کو میراث نہیں دیتے تو لڑکی کو گھر سے نکالتے وقت اپنی حیثیت کے مطابق بھر پور جہیز و نقد تلک کے نام پر دے دیتے ہیں کہ آئندہ اب وہ باپ کے مال میں کسی طرح کی حقدار نہیں۔ اس طریقہ نے اب اتنی بھیانک صورت اختیار کر لی ہے کہ موجودہ دور میں ہندوؤں کے دانشور اس کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں۔ ہندوؤں کی اس مردود رسم کو مسلمان اپنا رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جن کی مذہبی رسم تھی انہوں نے تو اس کے انجام بد سے عاجز آ کر اسے چھوڑنا شروع کر دیا اور ہم تباہ ہونے کے لیے اسے اپنا رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارے مذہب میں اس کی کسی طرح گنجائش ہی نہیں۔ ہمارے مذہب میں لڑکی کو باپ کے مال میں سے وراثت کا حق ہے۔ وہ الگ لے گی اور شادی کے وقت جہیز کے نام سے الگ بٹورے گی۔ باپ بھائی پر لڑکی کا یہ دوہرا بار تقاضائے عقل کے خلاف ہے۔ اور اصول فطرت اور مرد کی شان کے بھی۔ فطری اصول سے مرد عورت پر بالا دستی رکھتا ہے، اس سے قوت میں زیادہ ہے اس میں کمانے

کی بہ نسبت عورت کے صلاحیت زیادہ ہے، مجموعی طور پر عقل و تدبیر میں زیادہ ہے۔عورت صنف نازک ہے۔خلقی طور پر کمزور اس میں کمانے کی وہ قوت نہیں جو مرد میں ہے۔اس کے فطری عوارض اس میں مانع، اور تخلیقی مقاصد حارج۔ایام حمل و رضاعت میں کمانا اس کے لیے دشوار بلکہ اس کو کمانے پر مجبور کرنا ظلم۔اس لئے اسلام نے مرد کو عورت پر حاکم رکھا۔الرجال قوامون علی النساء اور مرد پر فرض کیا کہ نکاح کے معاوضہ میں مہر دے۔نکاح کے بعد اسکی پوری کفالت کرے، اور جہیز کی لعنت اس کے بالکل برعکس ہے۔گویا عورت نکاح کا معاوضہ دے اور اتنا دے جو مدت دراز تک مرد کو عیش کرنے کے لیے کافی ہو۔گویا جہیز مانگنے والے اتنے بے غیرت ہوتے ہیں کہ عورت کا مال کھانے کی ہوس رکھتے ہیں۔

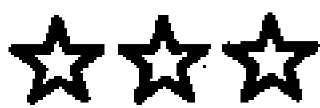
شریعت نے تو یہاں تک پابندی کی تھی ماں باپ بخوشی حسب حیثیت جو کچھ لڑکی کو جہیز میں دیں وہ لڑکی کی ملک ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

کل احد یعلم ان الجھاز للمرأۃ.

سب کو معلوم ہے کہ جہیز لڑکی کی ملکیت ہے۔

مگر مرد سب جہیز کو اپنی ملک سمجھتا ہے۔نقد اڑاتا ہے اور سامان بیچ کر برباد کرتا ہے۔یہ حرام اور بے غیرتی کی باتیں ہیں۔مسلمانوں میں جو لوگ ذی اثر و دین دار اور قومی ملی جذبہ رکھتے ہیں انہیں لازم ہے کہ اس جہیز کی لعنت کے خلاف ابھی سے صف آرا ہو جائیں، مسلمانوں میں اسے پھیلنے سے روکیں اور اس کے لیے سمجھانے بجھانے سے کام نہ چلے تو ہر ممکن سختی کریں ابھی ابتدا ہی میں روک تھام ہو گئی تو رک سکتی ہے۔ورنہ بہت مشکل ہو جائے گا۔حریص لالچی بے غیرت نہ مانیں تو ان کا سوشل بائیکاٹ کریں۔نکاح خوان علما میاں جی لوگوں کو لازم کہ جہاں معلوم ہو کہ جہیز کی عوض لڑکا خریدا گیا ہے وہاں نکاح پڑھانے نہ جائیں اپنے بیس آنے پیسے کے لالچ میں قوم کو تباہ نہ ہونے دیں۔دس بیس ایسی پابندی ہو گئی تو امید ہے کہ ہندوؤں کی دھتکاری ہوئی یہ بلا مسلمانوں میں نہ پھیلے۔واللہ اعلم۔



فلم "پیغام" کی شرعی حیثیت

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین "فلم پیغام" کے متعلق جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر بنائی گئی ہے۔ اس فلم میں اصحاب کرام اور صحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فرضی تصویریں اور کردار بھی دکھائے گئے ہیں۔ اس فلم کے علاوہ حکومت سعودی عرب نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ایک فلم سازی شروع کردی ہے۔ دریافت طلب یہ ہے کہ ان فلموں کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ دلائل کے ساتھ بیان فرمائیں۔

المستفتی
میر صدیق علی رضوی

الجواب

فلم کوئی بھی، کیسی ہو جو واقعات فلمائے گئے ہوں جن لوگوں کو فلمایا گیا ہو وہ اچھے ہوں یا برے حرام وگناہ ہے۔ اس بارے میں احادیث اتنی کثیر ووافر ہیں کہ باعتبار معنی حد شہرت کو پہونچ چکی ہیں۔ چند احادیث درج ہیں۔

اول: امام بخاری وامام مسلم حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا تصاوير.

ترجمہ: جس گھر میں کتے یا تصویریں ہوں ان میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

دوم: ام المومنین محبوبہ محبوب رب العالمین صدیقہ بنت الصدیق عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے امامین جلیلین بخاری ومسلم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اصحاب هذا الصور یعذبون یوم القیٰمة یقال لهم احیوا ما خلقتم .

ترجمہ: ان تصویر والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا کہا جائے گا جو تم نے بنایا ہے اس میں جان ڈالو۔

سوم: انہیں سے یہی دونوں امام روایت کرتے ہیں:

اشد الناس عذابا یوم القیٰمة یضاهئون خلق الله .

ترجمہ: سب سے سخت عذاب قیامت کے دن ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ عزوجل کی بنائی ہوئی چیز کی نقل بناتے ہیں۔

چہارم: امام مسلم حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اشد الناس عذابا عند الله المصورون .

ترجمہ: اللہ عزوجل کے یہاں سخت ترین عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔

پنجم: حضرت امام مسلم سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

ومن اظلم ممن ذهب یخلق کخلقی فیخلق ذرة او لیخلق حبة او شعیرا .

ترجمہ: اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے۔ جو میرے بنائی چیز کے مثل بناتا ہے۔ ذرا ایک ذرہ تو بنائیں یا ایک دانہ جو تو بنائیں۔

ششم: یہی امام حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا:

کل مصور فی النار یجعل لها بکل صورة صورها بنفسها فیعذبه فی جهنم .

ترجمہ: ہر تصویر بنانے والا جہنم میں ہے اس کی بنائی ہوئی ہر تصویر کے عوض ایک جان بنائی جائے گی جو اسے جہنم میں عذاب دے گی۔

ہفتم: انہیں سے بخاری میں ہے:

ومن صور صورة عذب و کلف ان ینفخ فیها ولیس بنافخ .

ترجمہ: ہر تصویر بنانے والے کو عذاب دیا جائے گا اور اسے تکلیف دی جائے گی کہ اس میں جان ڈالے اور وہ نہیں ڈال سکے گا۔

ہشتم: حضرت ابو جحیفہ سے روایت ہے کہ فرمایا:

لعن آکل الربا مؤکله والواشمة والمصور .

ترجمہ: سود کھانے والے کھلانے والے گودنے والی گوند لگانے والی اور تصویر بنانے والے پر لعنت ہے۔

نہم: حضرت ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مسلم میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مرض وصال میں حضرت ام سلمہ اور ام حبیبہ نے حبشہ کے گرجا کا تذکرہ کیا۔ جس کا نام ماریہ تھا اس کی زیبائش اور تصویروں کا بھی تذکرہ کیا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سر اقدس اٹھایا اور فرمایا:

اولئک اذا مات فیهم الرجل الصالح بنوا علی قبره مسجدا ثم صوروا فیها هذه الصور اولئک شرار خلق الله

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان میں کوئی نیک آدمی مرتا تو اس کی قبر پر مسجد بنالیتے اور اس میں یہ تصویریں بنالیتے۔ یہ مخلوقات میں سب سے بدتر ہیں۔

دہم: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ترمذی میں روایت ہے فرمایا:

یخرج عنق من الناس یوم القیٰمة لها عینان تبصران و اذنان تسمعان ولسان ینطق، یقول انی و کلت بثلثة لکل جبار عنید و کل من دعا مع الله الها آخر والمصورین.

ترجمہ: قیامت کے دن جہنم سے ایک گردن نکلے گی جس کی آنکھیں ہوں گی جن سے دیکھے گی۔ کان ہوں گے جن سے سنے گی۔ زبان ہوگی جن سے بولے گی۔ کہے گی میں ہر ظالم متکبر اور مشرک اور تصویر بنانے والوں پر مقرر کی گئی ہوں۔

یازدہم: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مشکوٰۃ میں بحوالہ بیہقی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اشد الناس عذابا یوم القیٰمة من قتل نبیا او قتله نبی او احد ابویه والمصور وعالم لم ینتفع بعلمه ۔

ترجمہ: قیامت کے دن سب سے سخت ترین عذاب ان لوگوں کو ہوگا جس نے کسی نبی کوقتل کیا یا اسے کسی نبی نے قتل کیا اور تصویر بنانے والے پر اور اس عالم پر جس کے علم سے نفع نہیں ہوا۔

جن دلوں میں ایمان ہے اور اللہ عزوجل کا خوف اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے شرم ہے وہ ان احادیث کو پڑھیں دیکھیں غور کریں۔ اتنی سخت وعیدوں کے باوجود کیا تصویر کے جواز کی کوئی صورت ہے۔ بناءً علیہ حضرت ملا علی قاری مرقاۃ میں فرماتے ہیں:

قال اصحابنا وغیرهم من العلما تصویر صورة الحیوان حرام شدید التحریم وهو من الکبائر لانه یتوعد علیه بهذا الوعید الشدید المذکور فی الاحادیث ۔

ترجمہ: علما اور دیگر علما نے فرمایا جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے سخت حرام اور یہ گناہ کبیرہ ہے اس پر اتنی سخت وعیدیں آئی ہیں جو احادیث میں مذکور ہیں۔

جاندار عام ہے اس سے کہ وہ حیوان ہو یا انسان اور انسان عام ہے اس سے کہ وہ عامی ہو یا خاص، صالح ہو یا فاسق عالم ہو کہ جاہل، ولی کہ نبی، بلکہ صلحا اولیا، انبیاء کی تصویریں بنانی اور سخت تر ممنوع۔ اس لیے کہ بت پرستی کی بنیاد۔ انبیاء، اولیاء، کی تصاویر ہی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ود، سواع، یعوق، نسر، قوم نوح کے صلحا تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے معتقدین نے ان کی تصویریں گھروں میں رکھ لیں، ابتداءً ان کی صرف تعظیم وتکریم ہوتی تھی بعد میں پرستش ہونے لگی۔ اس لیے صلحاء مشائخ اولیاء، انبیاء کی تصاویر بنانا اور سخت منع ہے جیسا کہ حدیث نمبر میں صلحاء کی تصویریں بنانے والوں کو فرمایا: **اولئک شرار الخلق** یہ بدترین مخلوق ہیں۔

جیسا تصویر بنانا حرام ہے، اسی طرح بنوانا اور اس کی کسی طرح اعانت بھی حرام ہے۔ ارشاد باری ہے: **انکم اذا مثلهم** اب تم بھی انہیں جیسے ہو۔ تفسیر خازن میں اس آیت

کے تحت فرمایا:

قال العلما وھذا یدل علی ان من رضی بالکفر فھو کافر ومن رضی بمنکر او خالط اھلہ کان فی الاثم بمنزلتھم اذا رضی بہ وان لم یباشرہ .

ترجمہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کفر پر راضی ہو کافر ہے اور جو گناہ پر راضی ہو یا گناہ کرنے والوں کے ساتھ میل جول کرے وہ بھی گناہ میں انہیں کے برابر ہے۔

ظاہر ہے کہ تصویر بنوانے والا خریدنے والا، تصویر بنانے پر راضی ہے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ تصویر بنوانے والا بھی بنانے والے کے برابر گناہ میں حقدار ہے۔ ارشاد ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان.

ترجمہ: نیکی پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو گناہ اور سرکشی پر تعاون نہ کرو۔

چونکہ تصویر کھینچوانے والا۔ تصویر سازی میں تصویر ساز کا معاون ہے اس لیے تصویر کھینچوانا حرام ہے۔ علاوہ ازیں حدیث نمبر۲ '' **ان اصحاب ھذا الصور** '' کے تحت مرقاۃ میں ہے: **ھو یشمل من یعملھا او من یستعملھا** یہ وعید تصویر بناتے اور بنوانے والے دونوں کو شامل ہے۔

جب تصویر بنانا اور بنوانا دونوں حرام اور فلم دیکھنے والے ان دونوں گناہوں پر معاون راضی اس لیے فلم دیکھنا حرام و گناہ۔ خواہ کوئی بھی فلم ہو۔ صحیح واقعہ بنایا گیا ہو، یا غلط اور فرضی، جو کردار دکھایا گیا ہو وہ سب کا سب اچھا ہو یا برا۔ یا کچھ برا۔ خواہ مہذب اخلاق ہو یا مخرب اخلاق۔ اس لیے فلم پیغام کے بنانے بنوانے نمائش کے ناجائز ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ فلم ہے اس میں تصویریں ہیں، اسے دیکھنا دکھانا تصویر سازی جیسے گناہ کبیرہ پر اعانت ہے۔ اس گناہ کی حوصلہ افزائی ہے۔ اسے رواج دینا ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے اس فلم کے سخت اشد حرام ہونے کے مختلف وجوہ ہیں۔

فلم کی بنیاد ہی لہو ولعب پر ہے۔ اسی لیے اس کو ایجاد کیا گیا ہے، اور اسی لیے دیکھی اور دکھائی جاتی ہے۔ اور حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہمارا دین ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ اور ارشاد ہے لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ اور دین کو لہو ولعب بنانا حرام قطعی بلکہ منجر الی الکفر ہے۔ ارشاد ہے:
وذر الذین اتخذو دینھم لعبا ولھوا انہیں چھوڑ و جنہوں نے اپنے دین کو کھیل کود بنالیا۔
اس آیت میں دین سے دین اسلام مراد ہے۔ بیضاوی میں ہے:
الذی کلفوہ دعوا الیہ وھو دین الاسلام اس دین کے وہ مکلف ہیں جس کی طرف وہ بلائے گئے ہیں اور یہ دین اسلام ہے۔

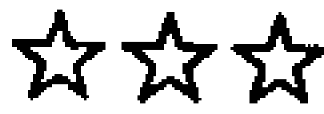
یا ایھا الذین آمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم ھزوا ولعبا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار اولیاء واتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین.
ترجمہ: اے مومنو! ان کتابیوں اور کافروں کو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنایا، دوست نہ بناؤ اگر تم مومن ہو۔
پھر اس فلم کو دیکھنے والے مسلم اور غیر مسلم بھی ہیں۔ صحابہ کرام کے لباس وضع قطع ان کے جو احوال فلم میں دکھائے گئے ہیں ان پر غیر مسلم بے دین ملحدین ضرور ہنسی اڑائیں گے ان کا ٹھٹھا کریں گے کیا یہ دین کی اہانت نہیں۔ دین کی اس طرح ہنسی اڑانے والوں کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا، بنص قرآن حرام ارشاد ہے:

اذا سمعتم اٰیٰت اللہ یکفر بھا ویستھزأ بھا فلا تقعدوا معھم .
ترجمہ: جب تم دیکھو کہ اللہ کی آیتوں سے کفر کیا جا رہا ہے اس کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو۔

انکم اذا مثلھم ۔ اب تم بھی انہیں جیسے ہو، اگر اس کفر پر راضی ہوئے تو کافر خاموش بیٹھے رہے تو معصیت و گناہ، پھر یہ کہ مقدس صحابہ کرام کا سوانگ کون کر رہا ہے جو اعلیٰ درجہ کا آوارہ اور بدکار ہے شرابی، جواڑی اور وہ کون نا کردنی ہے۔ جو فلم ایکٹر نہیں کرتے۔ یہ اس فلم کی قباحت کے لیے کیا کم ہے، ان ناپاکوں کو دیکھ کر ان پر صحابہ کرام کا شبہہ ہوگا۔ کیا یہ دھوکا فریب نہیں؟ پھر ایکٹنگ کرنا سوانگ بھرنا یہ خود حرام نیز اس میں نزول وحی کی کیفیت دکھائی گئی، کیا ایک گندا فاسق بولے اور اسے روح القدس کی آواز بتانا سخت حرام اور قریب کفر

کے نہیں۔ پھر جن گندے اداکاروں کا انتخاب ہوا ہے وہ صحابہ کرام کے مشابہ ہیں۔ یہ کیسے معلوم یہ دجل وفریب ہے پھر ان کو جو لباس پہنایا گیا کیسے معلوم کہ یہی لباس اسی وضع قطع کا صحابہ کرام کا تھا۔ یہ بھی فریب۔ نیز اسی فلم میں قرآن مجید کی آیتیں غلط پڑھی گئی ہیں، یہ خود حرام اشد حرام اور قرآن کریم کی تحریف کی جانب مفضی۔ غرض کہ یہ فلم ایک نہیں دسیوں شرعی خرابی پر مشتمل ہے۔ اور محرمات کا مجموعہ ہے۔ اسے دیکھنا دکھانا دین کو کھیل تماشا بنانے پر راضی ہونا بلکہ اس میں معاون ہونا ہے کیا مسلمان کی غیرت ملی اس کو گوارا کرے گی کہ فساق وفجار کو صحابہ کرام کے روپ میں پیش کیا جائے؟ کیا مسلمان یہ پسند کرے گا کہ جبرئیل امین کی آواز اس آواز کو کہا جائے جو انتہائی آوارہ وفاسق کی ہے۔ کیا مسلمان اس کو گوارہ کر سکتا ہے کہ جس پردے پر شراب خوری قماری بازی ناچ گانا، سارے فواحش کا سوانگ دکھایا جاتا ہے، اسی ناپاک پردے پر قرآن مجید کی مقدس آیات تلاوت کی جائیں۔ اس لیے کسی دیندار کو اس میں ذرہ برابر شبہہ نہیں کہ یہ فلم حرام اس کو دیکھنا حرام۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(ماہنامہ اشرفیہ۔ ستمبر ۱۹۷۷ء ص: ۵ تا ۸ اور ۱۷)



انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا

جمہور علمائے اہل سنت کثرہم اللہ تعالیٰ حتی کہ سیدی وسندی وسند الفقہاء الکاملین حضرت مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم العالیہ کا یہی فتویٰ ہے کہ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ انجکشن خواہ گوشت میں لگنے والا ہو خواہ رگ میں اور یہی عندا لتحقیق حق ہے۔ البتہ روزے کی حالت میں انجکشن لگوانا مکروہ ہے۔ انجکشن مفسد صوم یوں نہیں کہ دونوں انجکشنوں میں دوا یا غذا صرف کسی منفذ کے ذریعہ دماغ اور معدہ تک نہیں جاتی بلکہ ابتدا یا وسط یا انتہا میں صرف مسامات ہی ذریعہ رہ جاتے ہیں اور یہ بات فقہ کے ساتھ ہر ادنیٰ سی ممارست رکھنے والا جانتا ہے کہ اندرون جسم کسی دوا یا غذا کا جانا مطلقا مفسد صوم نہیں بلکہ اس شرط پر ہے کہ وہ دوا یا غذا پیٹ یا دماغ تک منفذ ہی کے ذریعہ یقینی طور پر پہنچے، نیز یہ کہ دوا یا غذا مسامات کے علاوہ کسی منفذ کے ذریعہ داخل ہو اور مدخل اور دماغ ومعدہ تک کہیں منفذ ختم ہو کر صرف مسامات ہی واحد راستہ نہ ہوں اگر ابتدا یا انتہا یا وسط کہیں بھی داخلہ کے ذریعہ صرف مسامات ہی ہوں، اگرچہ اول وآخر ووسط میں منفذ ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اگرچہ دوا دماغ یا پیٹ تک پہنچ جائے۔

عالمگیری میں ہے:

ما يدخل من مسام البدن من الدهن لا يفطر ومن اغتسل فی ماء فوجد برده فی باطنه لايفطره ولو اقطر شيئا من الدواء فی عينه لا يفسد صومه عندنا وان وجد طعمه فی حلقه واذا بزق فرأى اثر الكحل ولونه فی بزاقه عادة المشائخ علىٰ انه لايفسد صومه واذا اقطر فی احليله لايفسد صومه عندابی حنيفة ومحمد رحمهما الله سواء اقطر فيه الماء او الدهن وهذا اختلاف فيما اذا وصل المثانة واما اذا لم يصل بان كان فی قصبة الذكر بعد لا يفطر

بالاجماع.

ترجمہ: بدن کے مسامات کے ذریعہ جو تیل داخل ہو اوہ روزہ نہیں توڑے گا، کسی نے ٹھنڈے پانی میں غسل کیا پانی کی ٹھنڈک اندر محسوس کی روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ آنکھ میں دوا ڈالی روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اگر چہ اس کا مزہ حلق میں محسوس کرے، اگر تھوکا، اور اس میں سرمہ کا اثر اور رنگ ملا تو عام مشائخ کا یہی مذہب ہے کہ روزہ نہیں ٹوٹا، اگر احلیل (پیشاب کی نلکی) میں ہی دوا ٹپکائی۔ امام اعظم، امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا، خواہ پانی ڈالیں خواہ تیل۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے کہ یہ تیل اور پانی مثانہ میں پہنچ گیا اگر مثانہ تک نہیں پہنچا تو بالاتفاق روزہ نہیں توڑے گا۔

اسی میں ہے:

وفي دواء الجائفة والآمة عامة المشائخ على ان العبرة للوصول الى الجوف او الدماغ لا لكونه رطبا اويابسا حتى اذا علمه ان اليابس وصل يفسد صومه ولوعلمه ان الرطب لم يصل لم يفسد اذا لم يعلم احدهما وكان الدواء رطبا فعند ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ يفطر للوصول عادة وقالا لا لعدم العلم به فلا يفطر بالشك وان كان يابسا فلافطر اتفاقا .

ترجمہ: اور جائفہ (پیٹ کا وہ زخم جو معدہ تک گہرا ہو) اور آمّہ (سر کا وہ زخم جو بھیجے کی جھلی تک گہرا ہو) دوا میں اکثر مشائخ کے نزدیک اعتبار معدہ یا دماغ تک پہنچنے کا ہے۔ دوا کے تر یا خشک ہونے کا نہیں۔ یہاں تک کہ اگر معلوم ہو جائے کہ خشک دوا پہنچ گئی، روزہ ٹوٹ گیا۔ اور اگر معلوم ہو کہ تر نہیں پہنچی تو نہیں ٹوٹا اور اگر پہنچنا اور نہ پہنچنا معلوم نہ ہو اور دوا تر ہو تو امام اعظم کے نزدیک روزہ توڑ دے گی، اس لیے کہ تر دوا عادۃً پہنچ ہی جاتی ہے۔ صاحبین نے فرمایا: نہیں۔ اس لیے کہ پہنچنا معلوم نہیں، شک سے روزہ نہیں ٹوٹے گا اور اگر خشک ہے تو بالاتفاق روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

نقایہ اور اس کی شرح ملا علی قاری میں ہے:

وصل من غير الفم دواء الى جوفه او دماغه بان داوى آمة وهي

الشجة التی تبلغ ام الدماغ من غير المسام قيد به لانه لو وصل الى جوفه من المسام لا يقضي كما لو اغتسل بالماء البارد وجد برده فی كبده وكما لو ادهن فوجد اثر الدهن فی بوله او اكتحل فوجد طعم الكحل فی حلقه ولونه فی بزاقه .

دوا اگر منھ کے علاوہ کسی اور راستے سے دماغ یا پیٹ میں گئی، مثلاً آمہ میں دوا ڈالی تو روزہ ٹوٹ گیا، قضا واجب ہے بہ شرطیکہ مسامات کے ذریعہ نہ گئی ہو۔ یہ قید اس لیے لگائی کہ اگر دوا یا غذا مسامات کے ذریعہ پہنچی تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، جیسے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور پانی کی ٹھنڈک کلیجے میں محسوس کی یا تیل لگایا اور تیل کا اثر پیشاب میں پایا، سرمہ لگایا اور سرمہ کا مزہ حلق یا رنگ تھوک میں پایا تو روزہ نہیں ٹوٹا۔

تنویر الابصار، درمختار، ردالمحتار میں ہے:

ادهن او اكتحل او احتجم إن وجد طعمه فی حلقه ای طعم الكحل او الدهن وكذا لو بزق فوجد لونه فی الاصح. بحر فی النهر لان الموجود فی حلقه اثر داخل من المسام هو خلل البدن والمفطر انما هو الداخل من المنافذ بالاتفاق على إن من اغتسل فی ماء فوجد برده فی باطنه لا يفطر .

تیل ملا، یا سرمہ لگایا، یا سینگی لگوائی تو روزہ نہ ٹوٹا اگر چہ سرمہ یا تیل کا مزہ حلق میں محسوس کرے۔ یوں ہی تھوکا اور اسی کا رنگ تھوک میں ملا تو بھی مذہب اصح پر روزہ نہیں گیا۔ نہر میں فرمایا: اس لیے کہ حلق میں موجود مسامات کے ذریعہ داخل شدہ کا اثر ہے اور مسام بدن کے خلل کا نام ہے اور روزہ توڑنے والی صرف وہ دوا یا غذا ہے جو منافذ کے ذریعہ داخل ہو اس لیے کہ اس پر اتفاق ہے کہ کسی نے پانی میں غسل کیا اور اندر ٹھنڈک محسوس کی تو روزہ نہیں ٹوٹا۔

انہیں تینوں میں ہے:

داوى جائفة او آمة فوصل الدواء حقيقة إلى جوفه ودماغه اشار الى ان ما وقع فی ظاهر الرواية من تقيد الا فساد بالدواء الرطب مبنی على العادة من انه يصل و إلا فالمعتبر حقيقة الوصول حتى لو علم وصول اليابس افسد أو عدم وصول

الطری لم یفسد وانما الخلاف اذا لم یعلم یقینا فافسد بالطری حکما بالوصول نظرا الی العادۃ ونفیاہ کذا افادہ فی الفتح قلت ولم یقیدوا الاحتقان والاستعاط والاقطار بالوصول الی الجوف لظھورہ فیھا والا فلا بد منہ حتی لو بقی السعوط فی الانف ولم یصل الی الراس لایفطر ویمکن ان یکون الدواء راجعا الی الکل (قولہ الی جوفہ ودماغہ) قال فی البحر والتحقیق ان بین جوف الراس وجوف المعدۃ منفذا اصلیا فما وصل الی جوف الراس یصل الی جوف البطن . (ص:۱۰۲)

جائفہ یا آمہ میں دواڈالی اور دوا یقینی طور پر پیٹ اور دماغ تک پہنچ گئی۔ یقینی طور پر پہنچنے کی قید سے یہ اشارہ ہے کہ ظاہر الروایہ میں جو یوں قید آئی ہے کہ ''روزہ اس وقت ٹوٹے گا جب کہ دوا تر ہو'' یہ عادت کی بنا پر ہے کہ تر دوا پہنچ ہی جاتی ہے، معتبر حقیقت میں پہنچنا ہے یہاں تک کہ اگر خشک پہنچ گئی تو توڑ دے گی، تر نہیں، پہنچی تو نہیں توڑے گی، اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ یہ معلوم نہ ہو کہ دوا ضرور پہنچ گئی۔ اس صورت میں عادت پر نظر رکھتے ہوئے یہ حکم ہوگا کہ تر دوا روزہ توڑ دے گی۔ اور صاحبین نے نفی کی۔ جائفہ آمہ کی دوا کو جوف اور دماغ تک پہنچنے کے ساتھ مقید کیا اور احتقان، استعاط اور افطار میں جوف تک پہنچنے کی قید نہیں لگائی کیوں کہ ان میں جوف تک پہنچنا ظاہر ہے ورنہ روزہ توڑنے کے لیے یہ قید ضروری ہے یہاں تک کہ اگر ناک کی دوا نتھنوں میں رہ گئی اور سر تک نہیں چڑھی تو نہیں توڑے گی۔ ممکن ہے دوا سے اوپر ذکر کردہ تمام دوائیں مراد ہوں۔ بحر میں کہا کہ تحقیق یہ ہے کہ سر اور معدہ کے جوفوں کے مابین منفذ اصلی ہے تو جو سر میں گئی وہ پیٹ میں گئی۔

غور کریں یہ تمام اساطین ملت یہ تصریح فرمارہے ہیں کہ جو دوا مسامات کے ذریعہ اندرون جسم گئی اگر چہ دماغ تک پیٹ تک پہنچ جائے مگر روزہ نہیں توڑے گی، روزہ توڑنے والی وہی دوا یا غذا ہے جو کسی منفذ اصلی کے ذریعہ پیٹ یا دماغ میں جائے، اس کلیہ پر جو جزئیات متفرع ہیں ان پر ایک گہری نظر پھر ڈال لیں۔

۱۔ پانی میں غسل کیا ٹھنڈک پیٹ اور جگر میں محسوس کی، ظاہر ہے کہ یہ ٹھنڈک پانی

کے اندر پہنچنے کی بنا پر ہے مگر روزہ نہیں ٹوٹا، اگر چہ پانی پیٹ میں پہنچ گیا، اس لیے کہ پانی مسامات کے ذریعہ پیٹ میں گیا۔ کسی منفذ کے ذریعہ نہیں۔

۲۔ آنکھ میں دوا ڈالی، سرمہ لگایا، دوا اور سرمہ آنکھ کے پردوں سے گزر کر دماغ میں گیا، دماغ سے حلق میں آیا، مگر روزہ نہیں ٹوٹا۔ حالانکہ اس مسافت میں اکثر راستہ منفذ ہے۔ آنکھ کے پردوں کے بعد دماغ تک، دماغ سے حلق تک منفذ ہی کے ذریعہ گئی۔ پھر بھی روزہ نہیں ٹوٹا۔ اس لیے کہ داخلہ مسامات کے ذریعہ ہوا تھا، احلیل میں دوا ڈالی دوا مثانہ تک پہنچ گئی مگر روزہ نہیں ٹوٹا، حالانکہ دوا منفذ میں ڈالی گئی اس لیے کہ مثانہ تک پہنچ کر منفذ ختم ہو گیا مثانہ کی جھلی حائل ہو گئی اس کے آگے پیٹ تک جانے کے لیے مثانہ کے مسامات ہی واحد راستہ ہیں۔

۳۔ سر کے ایسے گہرے زخم میں دوا ڈالی جو بھیجے کی جھلی تک گہرا ہو، اگر دوا دماغ تک نہیں پہنچی تو روزہ نہیں گیا کیوں کہ دماغ تک منفذ کے ذریعہ نہیں پہنچی حالانکہ مسامات کے ذریعہ پہنچنا یقینی ہے۔

۴۔ جائفہ پیٹ کے ایسے زخم میں دوا ڈالی جو شکم تک گہرا ہو مگر دوا شکم تک نہیں پہنچی روزہ نہیں گیا حالانکہ مسامات کے ذریعہ پیٹ تک جانا یقینی ہے اس لیے کہ منفذ کے ذریعہ نہیں پہنچی۔

۵۔ تیل ملا تیل کا اثر پیشاب میں ملا روزہ نہیں ٹوٹا حالانکہ تیل کو پیٹ میں پہنچے بغیر پیشاب میں اس کا اثر ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اس لیے کہ منفذ کے ذریعہ نہیں پہنچا بلکہ مسامات کے ذریعہ پہنچا مذکورہ بالا نصوص سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے۔

فائدہ اولیٰ: مسامات کے ذریعہ جو دوا یا غذا اندرونِ جسم داخل ہو وہ مفسدِ صوم نہیں اگر چہ معدہ اور دماغ تک پہنچ جائے خواہ مدخل اور معدہ تک اور دماغ تک صرف مسامات ہوں کہیں کوئی منفذ نہ ہو جیسے نہایا اور پانی پیٹ میں پہنچا، خواہ معدہ اور دماغ تک پہنچنے میں مسامات اور منافذ کے ذریعہ ہوں، اس کی تین صورتیں ہیں: اول ابتدائے مسامات ہوں اور بعد میں معدہ اور دماغ تک منفذ۔ جیسے آنکھ میں دوا ڈالی یا سرمہ لگایا اور وہ حلق تک پہنچ گیا۔ ثانی ابتدا منفذ ہو۔ انتہا منفذ ہو۔ وسط میں مسامات ہوں جیسے احلیل میں دوا ڈالی اور مثانہ تک پہونچی کہ ادھر مثانہ تک منفذ سے اوپر مثانہ کے بعد منفذ ہے۔ ثالث صرف منتہیٰ

پر مسامات ہوں دوا منفذ میں ڈالی اور منفذ ہی کے ذریعہ آگے بڑھی مگر معدہ اور دماغ کے جوف سے پہلے مسامات ہوں اور اخیر میں جوف معدہ ودماغ تک پہنچنے کا ذریعہ صرف یہی مسامات ہوں کہ کوئی منفذ نہ ہو تو بھی مفسد صوم نہیں۔ اس لیے کہ علت افساد منحصر ہے منافذ کے ذریعہ وصول الی الجوف میں اور یہ علت یہاں منتفی ہے۔ نقض صوم کی علت وصول بالمنافذ میں منحصر ہے اس پر صاحب نہر کا یہ ارشاد جسے علامہ شامی نے نقل فرما کر مقرر کیا۔ دلیل ہے۔ فرماتے ہیں:

والمفطر انما هو الداخل من المنافـذ.

روزہ توڑنے والی صرف وہی دوا ہے جو منافذ کے ذریعہ داخل ہو۔

اور جب منتہی پر صرف مسامات ہی رہ گئے تو صرف منفذ سے داخلہ نہیں ہوا۔

فائدۂ ثانیہ: منفذ کے ذریعہ بھی کسی دوا کا غذا کا مطلقا اندرون جسم جانا مفسد نہیں کہ کھال کے اندر گھسی اور روزہ گیا بلکہ مفسد اس وقت ہے جب کہ دوا یا غذا معدہ یا دماغ تک پہنچے اگر دوا اندرون جسم منفذ ہی کے ذریعہ گئی مگر دماغ یا معدہ کے جوف تک نہیں پہنچی تو روزہ نہیں گیا۔ جیسے کلی کیا ناک میں دوا ڈالی مگر پانی حلق میں اور دوا دماغ تک نہیں چڑھی روزہ نہیں ٹوٹا۔ احلیل میں دوا ڈالی۔ اندرونِ جسم گئی، حتی کہ مثانہ تک پہنچ گئی، روزہ نہیں گیا، آمہ جائفہ میں دوا ڈالی مگر دماغ اور معدہ تک نہیں گئی، روزہ نہیں گیا، اگر اندرون جسم دوا جانا مطلقا مفسد ہوتا تو لازم تھا کہ کلی کرتے ہی ناک ہی میں دوا ڈالتے ہی احلیل میں ٹپکاتے ہی آمہ جائفہ میں ڈالتے ہی روزہ ٹوٹ جاتا، بلکہ آمہ جائفہ کی قید نہ تھی بلکہ یہ زخم میں دوا ڈالنا مفسد ہوتا۔

فائدۂ ثالثہ: فقہائے کرام کے اس ارشاد (وصل الی الجوف) سے مراد مطلقا اندرونِ جسم عروق اور ہر کھلی جگہ نہیں بلکہ صرف دماغ اور معدہ ہے۔ جس پر یہ جزیہ نص قاطع ہے کہ احلیل میں دوا ڈالی اور مثانہ میں گئی مگر روزہ نہیں گیا، مثانہ ایک کھلا عضو ہے اور یقیناً جوف ہے اگر جسم کا ہر جوف مراد ہوتا تو یقیناً اسے مفسد صوم ہونا چاہئے تھا۔ اس میں اگرچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے مگر یہ اختلاف ہمارے معروضہ پر اثر انداز نہیں ہوسکتا ہے اس لیے کہ یہ اختلاف اس لیے نہیں کہ مطلقا ہر جوف میں دوا جانا مفسد

ہے یا نہیں بلکہ اس بنا پر ہے کہ مثانہ اور معدہ کے مابین کوئی منفذ ہے یا نہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے علم میں یہ بات تھی کہ مثانہ اور معدہ کے مابین منفذ ہے اس لیے انہوں نے اسے مفسد کہا مگر امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ مثانہ اور معدہ کے مابین منفذ نہیں۔ اس لیے انہوں نے یہ حکم دیا کہ مفسد نہیں۔ اس سب سے ظاہر ہے کہ امام ابو یوسف بھی حضرات طرفین کے ساتھ اس بات پر متفق ہیں کہ مفسد وہی دوا اور غذا ہے جو معدہ تک پہنچے۔ اب جب کہ مثانہ اور معدہ پھاڑ کر انسانی اعضاء کی ہیئت و ماہیت معلوم ہوگئی اور یہ ثابت ہوگیا کہ مثانہ اور معدہ کے مابین کوئی منفذ نہیں پیشاب مثانہ میں مثانہ کی جھلیوں کے سوراخوں (جالیوں) سے ٹپکتا ہے تو یہ اختلاف باقی نہیں رہا۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

والاختلاف مبنی علی انہ ھل بین المثانۃ والجوف منفذ او لا وھو لیس باختلاف علی التحقیق والاظہر انہ لا منفذ لہ وانما یجتمع البول فیھا بالترشح کذا یقول الاطباء۔ (جلد دوم: ص ۲۹۹)

یہ اختلاف اس پر مبنی ہے کہ مثانہ اور معدہ کے مابین منفذ ہے یا نہیں اور یہ حقیقت میں اختلاف نہیں اور ظاہر تر یہ ہے کہ یہاں منفذ نہیں پیشاب مثانہ میں ٹپک کر جمع ہوتا ہے جیسا کہ اطبا کہتے ہیں:

الغرض منفذ کے ذریعہ اندر داخل شدہ دوا اسی وقت مفسد ہے جب کہ معدہ اور دماغ تک پہنچے، ان کے علاوہ دوسرے اجواف میں جانا قطعاً مفسد نہیں بلکہ علامہ شامی و طحطاوی نے صاحب بحر کی اس تحقیق کو برقرار رکھا ہے کہ مفسد اصل میں جوف معدہ میں جانے والی دوا ہے۔ دماغ میں جانے والی دوا مفسد اسی بنا پر ہے کہ دماغ اور معدہ کے مابین منفذ براہِ راست ہے یہ اس بات پر نص ہے کہ مفسد صرف معدہ میں جانے والی دوا ہے۔ اس لیے جوف سے مراد صرف معدہ ہے اور دماغ مراد ہونا اس لیے ہے کہ دماغ اور معدہ میں براہِ راست منفذ اصلی کے ذریعہ تعلق ہے، ہماری مراد پر اول دلیل یہ ہے، جس کے بعد کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا کہ جوف سے مراد اندرون جسم کے گوشت ہڈی دوسرے جوف نہیں صرف معدہ اور دماغ ہیں

اوپر ذکر کردہ نصوص اور جزئیات اور تینوں فوائد کو اچھی طرح ذہن میں رکھ لیں اور اب انجکشن کی ماہیت کو سامنے رکھ کر غور کریں، انشاء اللہ تعالیٰ ہر منصف پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انجکشن قطعی مفسد صوم نہیں خواہ وہ رگ کا ہو خواہ گوشت کا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ گوشت والے انجکشن کے جسم کے مختلف حصوں میں پہنچنے کی کیفیت یہ ہے کہ گوشت کے اندر بکثرت باریک باریک خلا ہوتے ہیں، جنہیں مسامات کہا جاتا ہے کہ ان میں ہر وقت خون بھرا رہتا ہے یہ خون اگر چہ خالص نہیں ہوتا بلکہ دیگر اخلاط کے ساتھ ممزوج ہوتا ہے مگر غلبہ خون ہی کو ہوتا ہے اس لیے ہم نے اسے خون ہی کہا، جب یہ انجکشن لگتا ہے تو پچکاری کے دباؤ سے دوا بجبر ان مسامات میں گھس کر خون میں مل جاتی ہے، خون کہیں بھی ٹھہرتا نہیں بلکہ ہر وقت جسم میں گردش کرتا رہتا ہے اس لیے یہ دوا خون کے ساتھ گردش کرتے کرتے وہاں پہنچ جاتی ہے جہاں اسے کام کرنا ہے چوں کہ دوا میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ وہ مخصوص جگہ اثر انداز ہو اس لیے وہیں اثر ڈالتی ہے، جیسے کھانے پینے والی دواؤں کا حال یہ ہے کہ سب کی سب پہلے معدہ میں جاتی ہیں پھر ہضم ہو کر اخلاط میں ملتی ہیں اور جہاں ان کی ضرورت ہے وہاں پہنچ کر اپنا کام کرتی ہیں، گوشت میں لگنے والی دوا انجکشن سے مسامات میں پہنچی پھر رگوں میں رفتہ رفتہ جہاں کے لیے تھی وہاں پہنچی، معدہ یا ماغ کی دوا ہے تو دوا یا اس کا اثر دماغ یا معدہ تک ضرور پہنچے گا مگر چوں کہ دوا کا داخلہ مسامات کے ذریعہ ہوا ہے، اس لیے روزہ نہیں توڑے گی۔ جیسا کہ اوپر گذرا کہ مسامات کے ذریعہ داخل شدہ دوا مفسد نہیں۔ اس کا جزئیہ اوپر گزرا کہ آنکھ میں دوا ڈالی یا سرمہ لگایا، دوا یا سرمہ آنکھ سے حلق میں پہنچا مگر مفسد نہیں اس لیے کہ داخلہ مسامات کے ذریعہ ہوا تھا، اگر چہ بعد میں منفذ سے حلق تک گیا، اسی طرح یہاں بھی مسامات کے بعد اگر چہ منفذ سے دوا ابتداءً رگ میں جاتی ہے جو ضرور منفذ ہے مگر رگوں کا تعلق براہِ راست معدہ یا دماغ سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔ علم تشریح میں اس کی پوری تحقیق دیکھی جا سکتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جگر میں اخلاط اربعہ علی قدر مراتب ممزوج ہو کر شرائین اور اوردہ کے ذریعہ پورے جسم میں جاتے ہیں ان میں غلبہ خون ہی کو ہوتا ہے اس کا عمدہ حصہ اعضا کی غذا بنتا ہے بقیہ جسمانی فضلات کے مل

جانے سے سیاہ اور کثیف ہوکر دل میں جاتا ہے، دل اسے پھیپھڑوں میں ڈھکیل دیتا ہے پھیپھڑوں میں باہر سے گئی ہوئی صاف ہوا بھری ہوتی ہے جو پھیپھڑوں کے مسامات اور کیسوں میں موجود رہتی ہے، خون اس تازہ ہوا سے صاف ہوتا ہے، اس کی کثافت اور دخانی مادہ ہوا میں رہ جاتا ہے جسے پھیپھڑے باہر پھینک دیتے ہیں اور خون صاف شفاف سرخ تازہ ہوکر پھر دل میں جاتا ہے اور دل شرائین اور اورطہ کے ذریعہ دوبارہ پورے جسم میں پہنچاتا ہے، اور پھر یہ خون کثیف دخانی مادوں سے سیاہ ہوکر دل میں اور دل سے پھیپھڑوں میں اور پھیپھڑے میں صاف اور تازہ ہوکر پھر دل میں جاتا ہے دل اسے پورے جسم میں پہنچاتا ہے۔ یہی چکر زندگی بھر چلتا رہتا ہے اور یہی انسانی نشو ونما وقوت کا مدار ہے۔ یہ انجکشن جب رگ میں لگا تو رگوں کے خون میں داخل گئی اور خون کے ساتھ دل میں اور پھر پھیپھڑے میں پھر دل میں اور دل سے پورے جسم میں پہنچی رگ والا خون دوا لے کر براہ راست نہ دماغ میں گیا نہ معدہ میں بلکہ دل میں گیا اور دل سے بھی براہ راست دوسرے اعضا میں نہیں گیا بلکہ پھیپھڑوں میں اور پھیپھڑوں سے واپس آکر پھر رگوں کے ذریعہ دوسرے اعضا حتی کہ دل اور معدہ میں گیا بہر حال پھیپھڑے بیچ میں ضرور آتے ہیں، اب پھیپھڑے کی ساخت اور ان میں خون کی جگہ معلوم کریں مسئلہ صاف ہوجائے گا۔ ماضی قریب کے مسلم الثبوت طبیب حاذق حکیم اجمل خاں اپنی مشہور و معروف کتاب ''حاذق'' میں لکھتے ہیں:

پھیپھڑوں کی ساخت نرم اور متخلخل ہے، ان میں نرم گوشت اور غضاریف اور قصبۃ الریہ اور شریانوں اور وریدوں کی شاخیں پائی جاتی ہیں۔ پھیپھڑے کی بالائی سطح پر آبدار جھلی اور باقی ساخت میں خانہ دار جھلی اور لچکیلے نرم ریشے اور ہوا کے چھوٹے چھوٹے خانے پائے جاتے ہیں جو باہم مل کر لوتھڑے بناتے ہیں انہیں ہوا کے کیسوں یا خانوں میں ہوا کی نالی یعنی قصبۃ الریہ کی باریک باریک شاخیں ختم ہوتی ہیں، پھیپھڑے کی شریان اور ورید کا جال بھی پھیپھڑے کے ہر حصے میں پھیلا ہوا ہے، یہاں تک کہ ہر ایک ایسے اعضا میں سے ہیں جو فضلات جسم کو خارج کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ان کا یہ فعل بھی ہے کہ وہ خون کو صاف کرتے ہیں صاف اور سرخ خون جسم کی پرورش کے لیے براستہ شرائین تنفس کے ذریعہ تمام جسم

میں چلا جاتا ہے، اور مختلف اعضا کی عروق شعریہ تک پہنچ کر وہ کثیف اور سیاہ ہو جاتا ہے جس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس میں جسمانی فضلات کے دخانی مادے مل جاتے ہیں، جب کثیف وریدی خون پھیپھڑوں کے ہوائی کیسوں کے عروق شعریہ تک پہنچتا ہے تو اس کا رنگ فوراً ہی سرخ ہو جاتا ہے کیوں کہ خون کا دخانی مادہ ہوائی کیسوں کے اندر آجاتا ہے اور ان ہوائی کیسوں کی لطیف ہوا خون میں مل کر اسے صاف اور سرخ بنا دیتی ہے۔

پھیپھڑوں کی اس تشریح سے کوئی یہ دھوکہ نہ کھائے کہ دیگر اعضا سے پھیپھڑے میں خون کی آمد ورفت براہِ راست ہے۔ نہیں بلکہ بواسطہ دل ہے، اسی کتاب میں۔ دل کی تشریح میں ہے:

دل کے دونوں دائیں بائیں اُذن ایک ہی وقت میں پھیلتے ہیں اور دائیں بائیں بطن ایک ہی وقت میں سکڑتے ہیں جب دونوں اذن پھیلتے ہیں تو دائیں اذن میں بالائی اورزیریں وریدوں کے ذریعہ جسم کا کثیف اور سیاہ خون آجاتا ہے اور بائیں اذن میں پھیپھڑوں کی وریدوں کے ذریعہ صاف شدہ خون آجاتا ہے کہ پھر دائیں اذن کا سیاہ خون درمیانی سوراخ کے راستے بائیں بطن میں اور بائیں اذن کا بائیں بطن میں چلا جاتا ہے، اور جب دونوں بطن سکڑتے ہیں تو دائیں کا خون بذریعہ شریان الریہ پھیپھڑوں میں چلا جاتا ہے اور بائیں بطن کا خون بذریعہ شرائین اورا ورطہ تمام جسم میں چلا جاتا ہے۔

الغرض! جملہ اطبا کا اس پر اتفاق ہے کہ رگوں سے خون براہِ راست دل میں جاتا ہے اور دل ہی کے ذریعہ پھیپھڑوں میں جاتا ہے، براہِ راست پھیپھڑے میں نہیں جاتا۔ اور نہ ایسا ہے کہ بغیر پھیپھڑوں میں گئے دل ہی سے واپس ہوتا ہو۔ پھیپھڑے میں ضرور جاتا ہے اور پھیپھڑوں میں صاف ہو کر پھر دل میں آتا ہے اور دل سے پھر پورے جسم میں جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پھیپھڑوں کے جن ہوائی کیسوں میں جاتا ہے اس کی حیثیت جوف کی ہے یا مسامات کی۔ اوپر ذکر کردہ تشریح سے یہ بات ظاہر ہے کہ پھیپھڑے کی جن ہوائی کیسوں میں جاتا ہے ان کی حیثیت مسامات ہی کی ہے، تو اس کا حاصل یہ ہے کہ خون دل سے مسامات میں گیا اور مسامات سے واپس ہو کر پھر دل میں آیا۔

اب اگر مان بھی لیا جائے کہ دل سے معدہ اور دماغ تک کوئی منفذ ہے تو بھی یہ دوا

مفسد نہیں ہوگی اس لیے کہ اگر چہ ابتداءً منفذ میں گئی اور انتہا پر بھی منفذ ہی سے پیٹ یا دماغ میں پہنچی مگر بیچ میں مسامات حائل ہیں تو جس طرح احلیل میں دوا ڈالی اور وہ مثانہ تک پہنچی مگر روزہ نہیں ٹوٹا اگر یہ دوا کا داخلہ بھی منفذ ہی میں ہوا اور مثانہ کے بعد بھی منفذ ہے مگر بیچ میں مثانہ کی جھلی حائل ہے جس میں اگر چہ چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں مگر ان کی حیثیت مسامات ہی کی ہے منفذ کی نہیں۔ اسی طرح رگ والے انجکشن میں اگر چہ دوا منفذ میں گئی مگر بیچ میں پھیپھڑے کے ہوائی کیسوں کی عروق شعریہ حائل ہیں جن کی حیثیت مسامات کی ہے اس لیے اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا، علاوہ ازیں دل سے دماغ یا معدے تک کوئی منفذ نہیں دل سے شرائین اور اورطہ نکل کر پورے جسم میں پھیلی ہیں، جن کے ذریعہ خون تمام اعضا کی تغذیہ کے لیے جاتا ہے۔ مگر یہ شرائین دماغ یا معدہ میں کھلتی نہیں بلکہ ان سے نکلی ہوئی عروق شعریہ کے مبدأ پر ختم ہو جاتی ہیں، عروق شعریہ ہی کے ذریعہ مسامات میں خون جا کر گوشت اور پوست کا جز بنتا ہے تو اگر ہوائی کیسوں کے عروق شعریہ کو بطور مجادلہ کوئی منفذ مانے بھی تو چوں کہ منتہا پر مسامات ہیں اور دماغ اور معدہ میں انہیں مسامات ہی کے ذریعہ پہنچے گی اس لیے اب بھی مفسد نہ ہوئی، اس لیے کہ ہم اوپر ثابت کر آئے کہ اگر منتہیٰ پر بھی مسامات ہی کے ذریعہ داخل ہیں تو مفسد صوم نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رگ والے انجکشن میں بھی دوا کسی منفذ سے گئی مگر معدہ اور دماغ تک نہیں پہنچتی بلکہ وسط میں یا انتہا پر منفذ ختم ہو کر صرف مسامات ہی کے ذریعہ دوا دماغ یا معدہ میں جائے گی۔ اس لیے مفسد صوم نہیں مگر چوں کہ انجکشن کی تقریبا تمام دواؤں میں اسپرٹ ہوتی ہے اور یہ بدترین قسم کی شراب ہے، نجس العین ہے۔ اس لیے روزہ کی حالت میں انجکشن لگوانا مکروہ ضرور ہے اس لیے کہ روزہ سے مقصود طہارت وتزکیہ باطنی ہے اور یہ انجکشن جس میں نجس العین دوا ہے باطن کو نجس کرنے والی ہے، اس لیے روزہ میں کسی قسم کے انجکشن ہرگز نہ لگوائے جائیں، اوران سے اجتناب کیا جائے۔

ہاں! اگر یہ معلوم ہو کہ دوا اسپرٹ اور ہر قسم کی شراب اور نجاست سے پاک ہے اور خارجی طور پر بھی اسپرٹ استعمال نہ کریں تو کراہت بھی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

پوتے کی وراثت

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اسلامی رو سے بیٹے کی موجودگی میں پوتے میراث سے محروم رہتے ہیں۔ اگر چہ وہ دوسرے بیٹے کے بطن سے ہوں اور اگر چہ وہ چھوٹے کام کاج کر کے کمانے کے لائق نہ ہوں۔ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان بے سہارے بچوں کو جو یتیم لاوارث ہوں۔ ضرور میراث ملے بلکہ بیٹوں سے زائد ملے تا کہ وہ برباد نہ ہوں خلاف عقل اسلام کا قانون کیوں ہے اس کی وجہ بتایئے۔

این ایس ایڈوکیٹ، رانچی

جواب:

عقل کو کیوں داغ لگاتے ہیں۔ تقاضائے عقل یہی ہے البتہ جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں پوتوں کو ضرور دادا کی میراث ملنی چاہیے۔ مگر جذبات کے تقاضے اور عقل کے تقاضے میں بہت تفاوت ہے، ہر جذبہ کا مقتضی صحیح ہو یہ ضروری نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی جذبات عقل کو اتنا مغلوب کر لیتے ہیں کہ عقل صحیح رہنمائی نہیں کر پاتی۔ یہی قصہ یہاں بھی ہے، بنیادی بات یہ ہے کہ دنیا کے ہر سیاسی تمدنی معاشی قانون کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے۔ بے بنیاد قانون، قانون نہیں ہوتا۔ ٹکا سیر بھاجی ٹکا سیر کھاجا ہوتا ہے۔ اسی طرح میراث کے جملہ جزئیات کی بھی ایک بنیاد ہے جو عین تقاضائے عقل کے مطابق ہے۔ وہ بنیاد ضرورت احتیاج یتیمی تنگ دستی مجبوری نہیں، وہ بنیاد رشتہ ہے اور مختلف درجوں کے رشتوں کی موجودگی میں قریب سے قریب تر ہے۔ اگر وراثت کی بنیاد محتاجی یتیمی تنگ دستی مجبوری مانی جائے تو لازم کہ فارغ البال بیٹے کی موجودگی میں تنگ دست اپاہج یا یتیم پڑوسی ترکہ پائے بیٹا نہ پائے۔ اور اگر دونوں کو مخلوط بنیاد ٹھہرائیں تو لازم کہ فارغ البال بیٹے کی موجودگی میں تنگ

دست اپاہج یا یتیم بھائی میراث پائے۔ بیٹا نہ پائے اگر صرف رشتہ کو بنیاد قرار دیں ضرورت اور مجبوری نہ شامل کریں جب بھی تو چاہیے کہ بیٹا بھی پائے اور بھائی بھی پائے، چچا بھی پائے وغیرہ وغیرہ حالانکہ تمام دنیا کے عقلا اور لطف یہ کہ یہی عقلا جو بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو میراث دینے پر مصر ہیں، بیٹے کی موجودگی میں بھائی اور چچا کو میراث نہیں دیتے۔ حالانکہ رشتہ تینوں جگہ ہے بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں بھائی اور بھائی کی موجودگی میں چچا میراث سے کچھ نہیں پائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ وراثت کی بنیاد صرف رشتہ نہیں بلکہ رشتہ اقرب فالاقرب ہے یعنی قریب تر رشتہ دار کے ہوتے ہوئے اس کی بہ نسبت دور کا رشتہ دار خواہ وہ کتنا ہی ضرورت مند ہو، خواہ وہ کتنا ہی مجبور ہو، اگر چہ دودھ پیتا یتیم ہو، میراث کا حق دار نہیں۔ اور یہی عقل کا تقاضا ہے تو اب فیصلہ آسان ہے کہ بیٹے کی بہ نسبت پوتا رشتہ میں ضرورت دور ہے اور بیٹا بہ نسبت پوتے کہ ضرور قریب تر ہے اس لیے بیٹے کی موجودگی میں پوتا محروم رہتا ہے، اگر چہ وہ کتنا ہی کم سن ہو اگر چہ وہ یتیم ہو اگر چہ وہ مجبور ہو اس لیے کہ بنیاد یتیمی نہیں رشتہ ہے وہ بھی قریب سے قریب ترکی ترتیب کے ساتھ ہے۔

عقل سے جذبات کا دباؤ ختم کر کے سوچیے تو بات بالکل صاف ہے ورنہ غور کیجیے، بھائی اور پوتے ایک درجہ کے ہیں، پوتا بیٹے کی اولاد ہے اور بھائی باپ کی، دونوں کے درمیان یہ بات مشترک ہے کہ بیچ میں ایک پیڑھی حائل ہے، پھر کیوں بھائی کی میراث بھائی نہ پائے اور دادا کی میراث پوتا پائے۔ وجہ فرق بتانا پڑے گا اور اگر یہ کہیں کہ پوتا اس کا جز ہے بھائی اس کا جز نہیں بلکہ یہ جس کا جز ہے وہ اس کا جز ہے تو بتائیے کہ نواسا اور نواسی تو اس کے جز کے جز ہیں، اور بقیہ وہی صورت ہے جو پوتے میں ہے، پھر چاہیے کہ نواسے اور نواسی کو میراث ملے مگر اس کو نہ تو کوئی کہتا ہے اور نہ کوئی قانون ہے آخر کیوں؟ گھوم پھر کر پھر وہیں آنا پڑے گا کہ چونکہ وراثت کی بنیاد رشتہ اقرب فالاقرب کی ترتیب ہے اس لیے نواسا اور نواسی میراث نہیں پائیں گے۔ پھر یہی قاعدہ پوتے اور پوتی میں کیوں از کار رفتہ ہے۔ وہی عقل پر جذبات کا دباؤ، اور دوسرا ذہنی دباؤ ماحول کا "الناس علی دین ملوکھم" لوگ اپنے بادشاہ کے طریقے پر رہتے ہیں۔ انگریز جب حکمراں تھے تو ان کا تمدن ان کا قانون کچھ لوگوں کو اچھا

لگتا تھا اور اب جب کہ حکمراں ہندو ہیں تو ان کا طور طریقہ اچھا لگنے لگا، ان کے یہاں چونکہ یہ قانون ہے کہ متوفی بیٹے کی اولاد نرینہ زندہ بیٹوں کی موجودگی میں میراث کی حق دار ہے ،اس لیے اب مسلمانوں کو بھی یہی صحیح نظر آنے لگا، لیکن ذی عقل جانتا ہے کہ غور و فکر پر جب کوئی رعب ہو اور وہ بھی حکمراں کا رعب تو عقل صحیح کام نہیں کرتی۔ اس لیے کسی بھی معاملہ کو صحیح طریقے سے جانچنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ عقل کو ہر قسم کے جذبات سے ہر قسم کے دباؤ سے آزاد کر لیا جائے، پھر سوچا جائے تو فیصلہ صحیح ہوگا ورنہ فیصلہ کا غلط ہونا لازم ہے۔ یتیمی، بے چارگی، ضرورت احتیاج کا علاج وراثت کے استحقاق کے علاوہ شریعت نے کچھ اور رکھا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دادا اپنے پوتوں کو اپنی زندگی ہی میں جو چاہے دے دے۔ یا وصیت کر جائے، تہائی ترکے تک وصیت کا اس کو حق ہے۔ دادا جب جانتا ہے کہ میرے ترکے میں سے پوتوں کو کچھ نہیں ملے گا اور وہ چاہتا ہے کہ ان کو ملے تو زندگی میں دینے سے کس نے روکا تھا، وصیت کرنے سے کس نے منع کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پوتے کی وراثت

سوال:

پوتے کے سلسلے میں آپ کا جواب موصول ہوا، اور اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کا جواب مکمل طور سے تسلی بخش ہے، اس کے قبل میں نے یہ بات بہت سے علما کے سامنے رکھی مگر کسی نے ایسا جواب نہ دیا جس سے پورا اطمینان حاصل ہوتا، ایک صاحب نے تو یہ کہہ کے بات ٹال دی کہ یہی اللہ و رسول کا حکم ہے۔ یہ ہماری عقل کا قصور ہے کہ جو سمجھ میں نہیں آتی۔

ایک صاحب نے بتایا کہ پوتا ڈبل میراث پائے گا، ایک دادا کی اور ایک اپنے باپ کی جو پا چکا ہے۔ جب میں نے کہا کہ یہی بات تو اس بیٹے کی اولاد پر صادق ہے جو میراث پا رہا ہے، اس کی اولاد اپنے باپ کی میراث پائیں گے جو منجملہ ہوگی، دادا کی میراث کا، تو خاموش ہو گئے۔ آپ نے صحیح نباضی کی، اس مسئلہ کو سمجھنے میں حارج جذبات تھے، جب میں

نے پہلی بار پڑھا تو بہت کم سمجھ میں آیا، مگر جب دوبارہ پڑھا تو سمجھ کے قریب ہوا، تیسری مرتبہ جب ہر ہر آئٹم کو بغور ٹھہر ٹھہر کر پڑھا تو بالکل سمجھ میں آگیا۔ آپ نے جس طرح آسان کر کے اسے سمجھایا ہے، وہ آپ ہی کا حق ہے۔

اب صرف ایک شبہہ رہ گیا کہ جب وراثت کی بنیاد رشتہ قریب سے قریب تر ہے تو چاہیے کہ بیٹا اور بیٹی کو برابر حصہ ملے، حالانکہ بیٹی کو بیٹے کا آدھا حصہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے نا کہ وہ دوسرے خاندان کی فرد ہے اسی طرح نواسا بھی چونکہ دوسرے خاندان کا فرد ہے اس لیے میراث سے محروم ہوگا۔ اور پوتا چونکہ دادا ہی کے خاندان کا فرد ہے اس لیے اسی کو ملنا چاہیے۔ امید کہ اس شبہے کو بھی آپ حل کر دیں گے، اس کا جواب ایک صاحب نے یہ دیا ہے کہ یہ مسئلہ خلاف عقل ہے، مگر میں ایسا مسلمان ہوں کہ شریعت کے کسی بھی مسئلہ کو خلاف عقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اب آپ بتائیے کیا بات ہے؟۔

(این، ایس، رانچی)

جواب:

آپ کو میری بات سمجھ میں آگئی اور آپ کو اطمینان کلی حاصل ہوگیا۔ اس کی مجھے بے حد خوشی ہے، یہ بات اپنی جگہ حق ہے کہ اسلام چونکہ دین فطرت ہے۔ فرمایا گیا: فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا. اللہ کی ڈالی ہوئی بنا پر لوگوں کو پیدا کیا، اور فطری شے مقتضائے عقل کے خلاف نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں اللہ عزوجل حکیم ہے، اور حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم الٰہی کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے۔ ہم کیا ہماری عقلیں کیا! ہوسکتا ہے کہ حکم الٰہی کے رموز تک ہمارے عقل کی رسائی نہ ہو سکے۔ اللہ عزوجل کے احکام کی کنہ کو جاننا تو بڑی بات ہے۔

بعض دفعہ ایک انسان دوسرے انسان کی باتوں کی کنہ کو نہیں جان پاتا، حالانکہ بات وہی درست ہوتی ہے، مسٹر جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ مسٹر گاندھی کی باتیں ابتدا میں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، مگر ہوتا وہی جو وہ کہتے۔ بار بار کے تجربے سے جب ہم نے دیکھ لیا کہ جو وہ کہتے ہیں وہی صحیح ہوتا ہے تو میں ہمیشہ ان کی باتوں کو بلا دلیل مان لیا

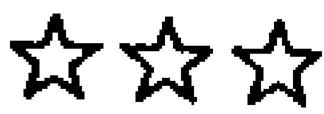
کرتا تھا۔ جب دنیا داروں کی باتوں میں یہ حال ہے تو اللہ عزوجل اور رسول ﷺ کی باتوں کو اپنی عقل کی ترازو پر تولنا کس قدر غلط ہوگا، اس کا عادی بنا کہ جو بات ہماری سمجھ میں آئے تو اسے مانیں اور جو سمجھ میں نہ آئے اس کا انکار کریں، آدمی کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے۔

عادت انکی ڈالنی چاہیے کہ اسلام کے ہر قانون کو بلا دلیل مانیں گے۔ اپنی سمجھ میں آئے یا نہ آئے آپ نے اگر میری سابقہ فتویٰ ہی کو دقت نظر سے پڑھا ہوتا تو یہ شبہہ زائل ہو جاتا۔ شریعت نے بیٹی کو بالکل محروم نہیں کیا ہے، باپ کی میراث میں سے حصہ دیا ہے۔ اگر دوسرے خاندان کا فرد ہونا وراثت سے محرومی کا سبب کلی ہوتا تو شادی شدہ بیٹی کو کچھ نہ ملتا، مگر اس کو بھی ملتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ رشتہ بر ترتیب اقرب فالاقرب وراثت کے استحقاق کی غیر متزلزل بنیاد ہے، اس پر دوسرے خاندان کا فرد ہونا بھی اثر انداز نہیں، ورنہ بیٹی کو کچھ نہ ملتا بہن کو کچھ نہ ملتا، شادی شدہ ہوتی یا نہ ہوتی۔ آخر غیر شادی شدہ لڑکی اور بہن آج نہیں تو کل بالیقین دوسرے خاندان کا فرد ہوگی۔

اب رہ جاتی ہے یہ بات کہ پھر بیٹی کو بہن کو بیٹے اور بھائی کا آدھا کیوں ملتا ہے جب کہ رشتہ قربت میں ایک درجے کا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ مرد پر اپنے اہل وعیال کی مکمل ذمہ داری ہوتی ہے اور عورت پر کسی کے اخراجات کا بار نہیں ہوتا بلکہ اس کے سارے اخراجات اس کے شوہر کے سر ہوتے ہیں، اس لیے مرد کو عورت سے زیادہ ملنا لازم ہے۔

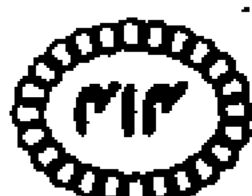
اس کا حاصل یہ ہے کہ استحقاق وراثت کی بنیاد بہر حال رشتے پر بہ ترتیب اقرب فالاقرب ہے البتہ حصہ کی کمی بیشی دوسرے اسباب پر مبنی ہے، جو مختلف ہیں اور جن کی تفصیل بہت دراز ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

(ماہنامہ پاسبان، الہ آباد: مئی ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۸ تا ۲۰)



باب چہارم

اسفار و مشاہدات



سفر نامہ حرمین طیبین

اَحِنُّ شوقا الیٰ دیار لقیت فیھا جمـــال سلمیٰ
کہ می رساند ازاں نواحی پیام وصلت بجانب ما
جمال روئے تو قبلۂ جاں ،حریم کوئے تو کعبہ دل
فان سجدنا الیک نسجد وان سعینا الیک نسعیٰ

جب سے شعور بیدار ہوا اس وقت سے اس کی تڑپ تھی کاش! کبھی اللہ کے گھر اور اس کے حبیب کے در کی حاضری نصیب ہو جائے ،اس تمنا کی تکمیل کے لیے کتنی دعائیں کیں ، کتنے آنسو بہائے ان کو شمار نہیں کرسکتا۔ جب حجاج اور زائرین کے قافلے حرمین طیبین جاتے دل میں ہوک اٹھتی مگر تڑپ تڑپ کر رہ جاتا اب جب کہ عمر کی اخیر منزل میں ہوں اسباب و وسائل پر نظر کرتا تو سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہ ہوتا مگر اللہ عزوجل اور اس کے حبیب ﷺ جس پر چاہیں کرم فرمائیں ۔اس بے مایہ پر بھی نگاہ کرم ہوگئی اور سال گزشتہ انہوں نے مجھے بلالیا۔

ہوا یہ کہ محسن ملت الحاج سیٹھ ابراہیم احمد صاحب برکاتی مالک فرینڈ اسٹورس بھنڈی بازار ممبئ کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ مجھے اپنے صرفے سے حج وزیارت کرائیں۔ چنانچہ بغیر میری کسی تحریک وخواہش کے مجھے خط لکھا اور ساتھ ہی ساتھ درخواست کے فارم بھی بھیج دیے کہ اگر آپ پسند کریں تو فارم پر دستخط کر کے بھیج دیں میں بقیہ سب کاروائی انجام دے لوں گا۔ جب حاجی صاحب موصوف کا یہ خط ملا تو فرط مسرت سے مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ کچھ دیر تک تو ایسا محسوس ہوا گویا میں خواب دیکھ رہا ہوں،لیکن بیداری پر خواب کا گمان کب تک رہتا میں نے بلا تأمل ضروری خانہ پری اور دستخط کر کے فارم ان کے پاس بھیج دیے،چوں کہ حاجی صاحب موصوف نے خود ہی ہوائی جہاز سے سفر کی پیش کش کی تھی اس لیے

مجھے بھی کوئی تامل نہ ہوا۔ سالہائے گزشتہ کے ریکارڈ سے امید واثق تھی کہ درخواست منظور ہو ہی جائے گی۔ اب میں انتظار کی گھڑیاں گننے لگا لیکن امسال عازمین حج وزیارت کی کثرت کی وجہ سے ہوائی جہاز سے بھی سفر کے خواہش مند بہت سے حضرات کی درخواستیں نا منظور ہوئیں اس میں میری بھی درخواست تھی اگر میں نے بغیر ان کی وساطت کے ازخود براہ راست درخواست دی ہوتی تو شاید امسال محروم ہی رہ جاتا مگر حاجی صاحب موصوف حج و زیارت کے سلسلے کے تمام امور سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے فورا بلا تاخیر متبادل کاروائی کی حج وزیارت کے سلسلے میں ایک ہزار ایسی محفوظ سیٹیں ہیں کہ اگر کسی کا کوئی عزیز یا شناسا سعودیہ عربیہ میں ہو اور وہ تمام اخراجات کے لیے ڈرافٹ بھیج دے تو اسے اس ایک ہزار محفوظ نشستوں میں سے منظوری مل جاتی ہے۔

چناں چہ حاجی صاحب موصوف نے جدہ میں رہنے والے اپنے ایک شناسا سے ڈرافٹ منگالیا اور اس طرح ان ایک ہزار محفوظ نشستوں میں سے میرے لیے منظوری حاصل ہوگئی، اور پہلے جہاز سے میری منظوری آگئی۔

امسال حج کمیٹی اور حکومت ہند کے مابین کچھ معاملات میں ایسا الجھاؤ پیدا ہوا جس کی وجہ سے ہوائی جہاز کی روانگی کی تاریخیں بہت تاخیر سے متعین ہوئیں، اس کے نتیجے میں عازمین حج وزیارت کو بہت ذہنی کوفت بھی اٹھانی پڑی اور پریشانیاں بھی۔ ہماری حکومت کا محکمہ ڈاک اتنا چوپٹ ہو چکا ہے کہ اس پر اعتماد ہی نہیں کیا جا سکتا، نہ خطوط کا اعتبار، نہ تار کا۔ رجسٹریاں اتنی دیر میں ملتی ہیں کہ اس کے بھروسے پر اس کا اندیشہ تھا کہ شاید جہاز کی روانگی کی تاریخ گزر جانے کے بعد امیدواروں کو ملے اس لیے اندازے سے اکثر عازمین وقت سے بہت پہلے ممبئی پہنچ گئے۔ یہی میرا بھی حال ہوا حاجی صاحب موصوف ہی کے مشورے کے مطابق ۱۰ر جولائی بروز چہار شنبہ گھر سے ممبئی کے لیے نکل گیا، اور ۲۳ر شوال ۱۲ر جولائی بروز جمعہ بعد نماز مغرب ممبئی پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر لینے کے لیے خود حاجی ابراہیم احمد صاحب اور ان کے بڑے بھائی حاجی علی محمد صاحب موجود تھے۔ ممبئی تک بھیجنے کے لیے میری

لخت جگر وحید الحق سلمہ اور عزیز ارشد مولانا حافظ عبد الحق زید مجدہم استاذ الجامعۃ الاشرفیہ بھی ہمراہ تھے۔ممبئی میرا قیام عطاری مسجد پھول والی گلی بھنڈی بازار میں رہا۔وہاں اس مسجد کے خطیب اور ممبئی میں اہل سنت کے اہم نقیب جناب قاری سراج اظہر صاحب نے سر آنکھوں پر رکھا۔ہر قسم کا آرام اور سہولت پہنچائی۔۱۲ر جولائی سے لیکر ۲۷ر جولائی تک ممبئی قیام رہا۔اس اثنا میں ممبئی کے کثیر احباب نے دعوت تواضع کی ،مثلا حاجی علی محمد برکاتی،خود ابراہیم احمد صاحب برکاتی ،الحاج سیٹھ احسان اللہ خاں صاحب عرف پہلوان سیٹھ،جناب سیٹھ غلام مصطفیٰ خاں صاحب کرلا،حافظ غلام دستگیر صاحب،الحاج سیٹھ عبد المجید صاحب ،جناب سیٹھ للن صاحب چمبور،جناب سیٹھ ریاض الدین صاحب وغیرہم خصوصیت سے عزیزی مولانا ولی اللہ سلمہ خطیب نورانی مسجد چمبور اور اس محلہ کے دیگر احباب اہل سنت نے ۔حضرت مولانا سید شاہ حامد اشرف صاحب بانی درالعلوم محمدیہ نے درالعلوم میں مدعو کیا،اور وہاں تمام طلبہ و مدرسین کے سامنے گل پوشی وضیافت فرمائی۔ مولیٰ عزوجل ان سب کو جزاے خیر عطا فرمائے۔آمین

عالی جناب الحاج سیٹھ ابراہیم احمد برکاتی کے صاحبزادے الحاج سیٹھ زبیر احمد برکاتی سلمہ نے پاسپورٹ وڈرافٹ اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور دیگر لوازمات کے لیے کافی جدوجہد کی ،مولیٰ عزوجل ان کی خدمات کا دارین میں بہترین صلہ عطا فرمائے ،بہت ہی نیک ،سعید،خوش اخلاق صاحبزادے ہیں۔

میں گھر سے اکیلا ہی چلا تھا ،مناسب ساتھی کی تلاش تھی ،ممبئی جا کر معلوم ہوا کہ حضرت الحاج شاہ ابوالحسنین آل رسول نظمی میاں برکاتی،صاحبزادہ و جانشین حضرت سید العلماء قدس سرہ مع اپنی والدہ ماجدہ وعمہ مکرمہ کے اسی جہاز سے جارہے ہیں،اس سے بے پناہ مسرت ہوئی ،اور حقیقت میں یہ صاحب البرکات حضرت سیدنا شاہ ابوالبرکات قدس سرہ کا اپنے اس ناکارہ غلام پر خصوصی کرم تھا کہ اپنے صاحبزادے والا تبار کی اس عظیم سفر میں ہمرکابی کا شرف عطا فرمایا پھر بعد میں معلوم ہوا کہ جناب مولانا خلیل احمد خاں پٹھان خطیب

مسجد آستانہ مخدومیہ ممبئی ماہم شریف، اور جناب مولانا قاری تراب علی صاحب خطیب مینارہ مسجد ممبئی اسی ہوائی جہاز سے جا رہے ہیں۔ میں نے اللہ عزوجل کا شکر ادا کیا کہ مجھے اپنے گھر اور اپنے حبیب کے در پر بلایا تو ہمراہی بھی ایسوں کی عطا فرمائی جو سب میرے حسب منشا تھے۔ فالحمد اللہ!

ہمارا ہوائی جہاز سات بجے شام کو قبل مغرب روانہ ہوا اور گیارہ بجکر ۲۰ منٹ پر جدہ پہنچ گیا۔ مغرب کی نماز ہوائی جہاز ہی میں پڑھی۔ ہوائی جہاز کے عملہ نے مغرب کے وقت اعلان کیا کہ مغرب کا وقت ہو گیا ہے، حجاج نماز پڑھ لیں۔ تمام حجاج نے سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی مگر میں نے اور حسنین میاں صاحب نے کھڑے ہو کر پورے رکوع و سجدے کے ساتھ نماز مغرب پڑھی، چلتے ہوئے ہوائی جہاز میں بھی کھڑے ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اس لیے سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھنے میں نماز صحیح نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ قیام فرض ہے اسی طرح رکوع اور سجدہ بھی، سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے یہ تینوں فرض ادا نہیں ہو پاتے، حجاج کو اس کا خیال رکھنا فرض ہے۔

ہوائی جہاز سے نکل کر ایئر پورٹ کے ہال کمرے میں آئے، اسی ہال کمرے میں با جماعت نماز عشا ادا کی گئی۔ تقریباً ساری رات ہال کمرے میں گزری۔ ہال کمرہ ایئر کنڈیشن تھا، تمام حجاج سردی سے ٹھٹھر گئے۔ سعودی ہوائی جہاز کا عملہ بہت سست روی اور تاخیر سے حجاج کو باہر نکالتا۔ تقریباً ہوئی جہاز کے پہنچنے کے دو گھنٹے کے بعد مسافرین کو باہر نکالنا شروع کیا، وہ بھی اتنی سستی کے ساتھ کہ ساڑھے چار سو حاجیوں کو نکالنے میں تین گھنٹے کا وقت لگ گیا۔ لائن میں کھڑے کھڑے تمام حاجی تھک کر چور ہو گئے، مگر عیش پرست نجدی ملازمین کو اس کی کوئی بھی پرواہ نہ ہوئی۔ خدا خدا کر کے ائر پورٹ سے باہر نکلے تو حضرت حسنین میاں صاحب کو لینے کے لیے جدہ شہر سے ان کے رشتے دار موجود تھے۔ ڈرافٹ بھنانے کے بعد میں انہیں کی گاڑی میں حضرت حسنین میاں کے ساتھ مکہ معظمہ حاضر ہوا۔

ہماری گاڑی جب مسجد حرام شریف کے پاس شارع عبد اللہ بن زبیر پر پہنچی تو حرم

شریف میں نماز فجر ہو چکی تھی۔ نمازی باہر نکل رہے تھے، گاڑی وہیں ایک طرف کھڑی کر دی حضرت حسنین میاں اور ان کے رشتے دار، شیخ جمال اللیل صاحب کے دفتر کی تلاش میں گئے مستورات موٹر ہی میں رہیں۔ میں ترساں لرزاں حرم شریف میں نماز فجر کے لیے چلا، اس وقت میرا جو حال تھا اس کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا وضو خانہ وہاں سے کافی دور تھا، مجبور زمزم شریف ہی سے وضو کیا، مسجد حرام شریف میں حاضر ہوا جب کعبہ شریف پر نظر پڑی تو وفور مسرت میں بے اختیار منہ سے چیخ نکل گئی، دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کچھ دیر تک خود فراموشی کا عالم رہا مگر پھر خیال آیا کہ باہر مستورات اکیلی ہیں مجھے نماز فجر پڑھ کر جلدی پہنچنا چاہیے۔ سسکیوں کے ساتھ نماز فجر ادا کی، علاوہ رکوع وسجدے کے نگاہ جمال کعبہ سے ہٹتی نہ تھی، بہت اختصار کے ساتھ نماز ادا کر کے الٹے قدم باہر آیا موٹر کے پاس پہنچا، اتنے میں حضرت حسنین میاں صاحب بھی واپس آ گئے، اور ہم لوگ عبدالکریم نوری صاحب کے دفتر میں پہنچے، دو ایک مکان دیکھے گئے مگر وہ پسند نہ آئے میری خواہش یہ تھی کہ ایسا مکان ملتا جس میں مستورات الگ رہتیں اور مرد الگ رہتے مگر چار آدمیوں میں اس قسم کا مکان لینا ہم لوگوں کی وسعت سے باہر تھا، اس لیے میں نے حسنین میاں صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ مولانا خلیل احمد صاحب سے مل کر مشترکہ طور پر ایسے دو مکانات لیے جائیں کہ مستورات کے لیے الگ اور مردوں کے لیے الگ رہائش ہو سکے۔ مگر مولانا خلیل احمد صاحب جدہ سے دوسری موٹر میں آئے تھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اترے ہیں، ناشتے کے بعد عمرہ کرنے کے لیے ہم لوگ حرم شریف میں حاضر ہوئے۔

معلم صاحب نے کسی انتہائی گنوار آدمی کو ہمارے ساتھ کر دیا تھا جسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ باب السلام کہاں ہے؟ اور حرم میں داخلہ کے آداب کیا ہیں؟، وہ ہم لوگوں کو کسی دروازے سے اندر لے گیا اور حجر اسود کے پاس کھڑا کر کے یہ کہہ کر کہ "آپ لوگ طواف کیجیے، میں اس دروازے پر بیٹھا ہوں چلا گیا، جب کہ معلمین کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ پہلی بار کی حاضری میں ان کا کوئی آدمی ساتھ ساتھ رہتا ہے جو عمرے کو پورے ارکان ادا کراتا

ہے۔خیر! ہم لوگوں نے از خود ہی طواف کیا، بھیڑ کم تھی اس لیے بڑے اطمینان سے طواف ہوا، رکن یمانی کا استلام ہر پھیرے میں نصیب ہوا، البتہ حجر اسود کے بوسہ لینے میں ازدحام زیادہ تھا اور دشواری بھی تھی اس لیے صرف ایک بار نصیب ہوا۔ یہ بھی اللہ عزوجل کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ کتنے ایسے بھی حجاج ہیں جنہیں حجر اسود کی زیارت بھی نصیب نہیں ہوتی۔طواف سے فارغ ہوکر ہم دونوں اس شخص کے پاس آئے وہ ہم لوگوں کو لے کر صفا مروہ کی سعی کرائے بغیر دروازے سے باہر آ گیا اور قیام گاہ کی طرف لے چلا۔ہم لوگ ابھی صبح ہی کو حاضر ہوئے تھے۔صفا مروہ کے جائے وقوع سے واقف نہ تھے، اس لیے اس کے پیچھے چلے، انتظار کرتے رہے کہ وہ اب بتائے گا، یہ صفا ہے یہاں سے سعی شروع کرو۔مگر ہم لوگوں کو لیے ہوئے معلم صاحب کے گھر پہنچ گیا، اس پر مجھے تعجب ہوا اور غصہ بھی آیا۔میں نے اس سے کہا کہ ہم لوگوں کو صفا مروہ پر کیوں نہیں لے گیا؟ سعی کیوں نہیں کرائی؟ تو اس نے کہا جلدی کیا ہے، سعی پھر کر لیجیے گا۔غصہ تو بہت آیا مگر ہم لوگوں نے صبر کیا میں نے کہا: ہم ابھی سعی کریں گے، صفا مروہ پر لے چلو۔وہ ہم لوگوں کو لے کر پھر الٹے قدم چلا اور مسجد حرام شریف لایا۔ مجھے پھر شبہہ ہوا کہ معلوم نہیں یہ کہاں لے جا رہا ہے، میں نے پھر اس سے کہا ہم لوگوں کو صفا پر لے چلو، اس نے کہا ہاں! صفا ہی پر لے چل رہا ہوں۔بہر حال! وہ ہم لوگوں کو لا کر صفا پر چھوڑ کر چلا گیا، اور یہ کہہ گیا میں چلتا ہوں آپ لوگ آجایئے گا۔اس کے جانے کے بعد ہم نے سعی کی۔

سبحان اللہ! دیوانوں کی ایک بھیڑ ہے جو صفا مروہ کے درمیان انتہائی جوش و مستی کے ساتھ پروانوں کی طرح دوڑ رہی ہے، ہم نے بھی نیت کی اور سعی شروع کی۔زندگی بھر چلتے رہے اور کبھی کبھار دوڑے بھی ہیں، مگر سعی میں جو لذت تھی، جو کیف تھا، جو مستی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔سعی کرنے کے درمیان ہی مولانا خلیل احمد خاں مل گئے۔میں نے ان سے کہا کہ میری خواہش یہ ہے کہ ہم سب ایک ساتھ رہیں اور اس طرح کا مکان لیا جائے کہ مرد الگ رہیں اور عورتیں الگ۔وہ بھی ہماری اس رائے پر بہت خوش ہوئے، سعی سے فارغ

ہونے کے بعد ان کے ہمراہ ان کی قیام گاہ پر آئے، وہیں حجامت بھی بنوائی، دن بھر وہیں رہے۔ حسنین میاں تو درمیان میں چلے آئے، بعد عصر وہ پھر آئے اور مکان کی تلاش شروع ہوئی۔ مسفلہ میں شارع حمزہ پر ۲۶ رہزار ریال میں تین کوٹھریاں طے ہوئے جس میں ایک بڑا ہال تھا، اس میں ہم سب مرد تھے۔ دو کوٹھریاں تھیں ان میں مستورات رہیں۔ کمرے میں اے، سی بھی فٹ تھا، اور فرنیچر بھی تھا، باورچی خانہ غسل خانہ الگ الگ تھا، پانی کے لیے نل لگے ہوئے تھے، کوئی دقت نہیں تھی، جمدا شاہی ضلع بستی کے منشی حاجی محبت علی صاحب مع اہلیہ نے بھی ہم لوگوں کے ساتھ تھے۔

اب ہم لوگوں کا دو گروپ بن گیا۔ ایک مولانا خلیل احمد خاں صاحب پٹھان کا۔ دوسرے میرا اور حسنین میاں اور منشی محبت علی صاحب کا۔ گروپ کا مطلب صرف یہ ہے کہ کھانے پینے کے لیے دو حصہ ہوئے، ہمارا کھانا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ الگ پکتا تھا، اور مولانا خلیل احمد خاں صاحب وغیرہ کا الگ ہم لوگ سب بڑے اتفاق واتحاد اور محبت و یگانت کے ساتھ رہے۔ عام طور پر حجاج کے مابین جو تم تڑاک ہوجاتا ہے، اس سے ہم لوگ محفوظ رہے، میں اپنے ساتھ غلہ نہیں لے گیا تھا، وہ لوگ کچھ غلہ لے گئے تھے، لیکن اپنی غایت مہربانی سے اپنے ساتھ کھلاتے پلاتے رہے۔

زندگی کی معراج

مکہ معظمہ میں نو دن قیام کے بعد دسویں دن مدینہ طیبہ کے لیے گورنمنٹ کی بس سے ۱۱ر۴۰ منٹ پر چلے، اور ساڑھے سات بجے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ بس اسٹینڈ سے سامان لکڑی کے ٹھیلے پر لدوا کر مسجد اقدس کے قریب جانب شرق ایک گلی کے نکڑ پر سامان رکھا گیا مولانا خلیل احمد خاں صاحب مکان کی تلاش میں نکلے۔ اسی اثنا میں عشا کی نماز بھی ہوگئی، قریب ہی شارع رومیہ میں "دار طیبہ" نام کی بلڈنگ میں دو کمرے چھتیس سو ریال میں لیے گئے۔ ایک میں مردوں نے قیام کیا دوسرے میں عورتوں نے۔ مکان پہنچنے کے بعد جب

اطمینان ہوا تو مسجد اقدس کے دروازے بند ہو چکے تھے اس لیے اس وقت حاضری نہ ہو سکی، ارادہ یہی تھا کہ رات کے پچھلے پہر نہا دھو کر کپڑے بدل کر بارگاہ اقدس میں حاضری دیں گے اس اثنا میں کہیں سے گنبد خضریٰ کی بھی زیارت نہ ہو سکی لیکن ہوا یہ کہ مجھے شدید نزلہ کی شکایت تھی، کسی چائے کی دکان کی تلاش میں، میں نکلا، گلی میں سیدھے جنوب کی طرف چلا گیا، اس گلی کے باہر وہ وسیع میدان ہے جو مسجد اقدس اور جنت البقیع کے درمیان ہے۔

میں اس میدان میں نکل گیا، جب داہنی طرف مڑا، نظر اٹھائی تو سامنے گنبد خضریٰ اپنی پوری زیبائیوں اور عظمتوں کے ساتھ جلوہ فرما تھا، نظر پڑتے ہی میں پہلے ہکا بکا رہ گیا، اور صلوٰۃ وسلام بھی نہ عرض کر سکا۔ کچھ دیر تک سکتے و خود فراموشی کا عالم رہا، بدن کانپتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آیا تو میں نے دست بستہ صلوٰۃ وسلام عرض کرنا شروع کیا، انتہائی خوشی میں آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ روتا جاتا، صلوٰۃ وسلام عرض کیے جاتا۔ اس وقت کی کیفیت ایسی تھی کہ نہ وہاں سے قدم آگے بڑھانے کی جرأت ہوتی تھی، اور نہ پیچھے ہٹانے کو جی چاہتا تھا۔ میں شاید یونہی رہ جاتا کہ ایرانی غول بیابانی کی طرح میرے قریب سے گزرے اور ان وحشیوں نے مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ میں گرتے گرتے بچا، اور وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ان ناپاکوں کے ساتھ جسم کے مس ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے قبل والا رابطہ اس وقت پیدا نہ ہو سکا۔ کچھ دیر کے بعد میں چائے کی تلاش میں چلا گیا۔ چائے پی کر قیام گاہ پر آیا، اور سونے کے لیے لیٹا، اس کے باوجود کہ سفر کی تکان تھی، بس اسٹینڈ سے قیام گاہ تک پیدل آنے کا بھی اثر تھا، مگر نیند کوسوں دور تھی، کبھی اپنی اس فیروز بختی پر خوشی کی لہر آتی کہ کہاں میں، اور کہاں یہ ارض پاک!۔

کبھی یہ خیال کہ اپنا یہ سیاہ منہ داغدار دامن لے کر سرکار کی بارگاہ میں کیسے حاضر ہوں، انتہائی ندامت سے پسینے میں شرابور ہو گیا، کبھی ان کی رحمت بے پناہ کا تصور کر کے اپنی ہراش وندامت کو دور کرتا۔ اس حال میں، میں کب تک رہا یاد نہیں۔ پھر نیند آ گئی، دو بجے آنکھ کھلی، سب ساتھی بے خبر سو رہے تھے، میں اٹھا اور کپڑے نکالے خوب اچھی طرح غسل کیا پھر پورے جسم پر خوشبو ملی کپڑے پہنے، کپڑوں پر بھی جہاں تک ہو سکا خوشبو ملی، ایک نیا جوڑا

خاص اس وقت کے لیے اٹھا رکھا تھا، اسے پہنا اوپر سے شیروانی پہنی۔ شیروانی پہنتے وقت خیال یہ آیا کہ کاش میں اپنے ہمراہ جبہ لایا ہوتا، اور بجائے شیروانی کے جبہ پہنتا اس لیے کہ جبہ حضور اقدس ﷺ کا لباس تھا، اور شیروانی تو ماضی قریب کی ہندیوں کی ایجاد ہے، پھر سفید رنگ کا وہ عمامہ جو نور چشم ڈاکٹر محب الحق سلمہ نے ساتھ کر دیا تھا، باندھا۔

میں جب نہا کر غسل خانے سے نکلا تو حضرت حسنین میاں صاحب بھی بیدار ہو چکے تھے، انہوں نے بھی غسل کیا کپڑے بدلے اور ہم دونوں ساتھ ساتھ بارگاہ اقدس میں حاضری کے لیے چلے۔ باب جبریل سے داخل ہوئے، تہجد کی اذان ہو چکی تھی، پوری مسجد اقدس آدمیوں سے بھر چکی تھی، ہم لوگ دو صفوں کے بیچ میں ہو کر باب ابوبکر صدیق تک چلے گئے کہیں کوئی گنجائش نظر نہیں آئی، مجبوراً باہر نکل کر چاروں طرف نظر دوڑائی، قریب ہی تھوڑی سی جگہ نظر آئی، ہم دونوں وہاں پہنچے، پہلے نوافل پڑھی پھر نماز فجر کی اذان کا انتظار کرتے رہے۔ اذان کے بعد ہم دونوں نے اپنی نماز الگ پڑی، ہم ابھی فرض سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ جماعت ہونے لگی، ہم لوگ نماز سے فارغ ہو کر اوراد و وظائف میں مشغول رہے، جب جماعت ہو چکی اور بھیڑ کم ہوئی تو ہم لوگ باب السلام سے مسجد اقدس میں داخل ہوئے، بھیڑ اب بھی بہت تھی، دھکے کھاتے ہم لوگ مواجہہ اقدس کی طرف چلے تقریباً ۱۵ منٹ میں مواجہہ اقدس تک پہنچے مگر پیچھے لوگوں نے اتنے زور سے دھکے دیے کہ ہم لوگ وہاں کھڑے نہ رہ سکے، دل مسوس کر رہ گئے اور پیچھے سے جو ریلا مسلسل چلا آ رہا تھا، اسی کے دباؤ سے ہم لوگ بلا قصد و اختیار باب جبریل تک پہنچ آئے سوچا گیا کہ اب پھر واپس چلیں لیکن لوگوں کے اژدحام کی وجہ سے ہم لوگ واپس نہ ہو سکے باہر نکلے تو دیکھا سیہ پوش ایرانی مرد و عورت کچھ کھڑے کچھ بیٹھے پورے میدان پر قابض ہیں، زور سے سلام پڑھ رہے ہیں، ایک شور برپا تھا، بہرحال! کچھ دور جا کر ہم لوگوں کو کھڑے ہونے کی جگہ ملی وہیں سے سلام عرض کیا گیا مگر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ رات والا کیف و سرور حاصل نہ ہو سکا، ہمارے چاروں طرف ایرانیوں کا غول بیابانی تھا، قریب ہی سر پر سیاہ پگڑی رکھے ان کا کوئی مجتہد تھا جو انہیں بلند آواز سے سلام پڑھوا رہا تھا ابتداءً تو اس کی طرف دھیان نہیں گیا مگر جب

ہم لوگ صلوٰۃ وسلام سے فارغ ہوگئے تو میں نے سنا وہ مجتہد حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر سلام پڑھوا رہا تھا، جس میں اور بہت سے کلمات کے ساتھ خاص طریقے سے یہ دو کلمے بھی تھے۔ السلام وعلیک ایتھا المظلومۃ، السلام علیک ایتھا الشہیدۃ۔

رافضیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دروازے میں دبا دیا تھا، اس وقت وہ امید سے تھیں دبنے سے اسقاط ہوگیا، اور اسی میں حضرت سیدہ کا وصال ہوگیا، اپنے اسی جھوٹے اعتقاد کے مطابق وہ حضرت سیدہ کو مظلومہ اور شہیدہ بھی کہہ رہا تھا، یہ حقیقت میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تبرا ہے، صرف اسی ایک موقع پر نہیں بلکہ میں نے بارہا ایرانی رافضیوں کے منہ سے یہ تبرا سنا ہے۔

یہ نجدی حکومت کی حق پرستی کہ رافضی علانیہ مسلسل تبرا بکیں، تو ان سے کوئی پرشش نہیں لیکن اگر کوئی سنیؔ وارفتہ شوق ہوکر جالیوں کو بوسے دے دے یا منبر اقدس کو بوسہ دے دے تو اسے جھڑکتے بھی ہیں، دھکے بھی دیتے ہیں، اور مار بھی دیتے ہیں۔ میں نے تو حرمین طیبین جاکر یہ محسوس کیا کہ وہاں مآثر ومزارات کو ہاتھ لگانے اور بوسے دینے کے سوا اور کوئی چیز جرم نہیں، داڑھی منڈواؤ، فلم دیکھو گھروں میں ٹیلی ویژن لگاؤ، اس پر عریاں فحش مخرب اخلاق سین دیکھو، گانے سنو، تصویریں کھینچواؤ، تصویریں بیچو خریدو کوئی چیز جرم نہیں۔ میں نے معلمین کے آفسوں میں دیکھا کہ ٹیلی ویژن لگے ہوئے ہیں، دن رات فلمیں چلتی رہتی ہیں، بازاروں میں علانیہ مصر کی مشہور مُغنیہ ام کلثوم اور دنیا کے مشہور گانے والے، گانے والیوں کے پاکستانی فلمی گانوں کے کیسٹ بکتے ہیں، ان پر کوئی پابندی نہیں۔ میں نجدی حکومت کے طرف داروں سے سوال کرتا ہوں کہ کیا یہ سب چیزیں جائز ہیں، قرآن مجید کی جو بے حرمتی وہاں آنکھوں سے دیکھی وہ کسی چیز کی نہیں دیکھی حجاج بہترین سے بہترین قرآن مجید خرید کر دونوں حرم میں رکھ دیتے ہیں، جب ان کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے، تو بعد عشا کوڑا پھینکنے والے ٹرکوں میں دروازوں کے باہر پڑے ہوئے چپلوں کے ساتھ قرآن مجید کی جلدوں کو بھی ٹرک میں اس طرح بھرتے ہیں جیسے کوڑا بھرا جاتا ہے، قرآن مجید کی جلدوں کو بوروں میں کس کر

گھسیٹ کر لے جاتے ہیں اور اٹھا کر ٹرک میں پھینک دیتے ہیں، پھر انہیں قرآن مجید پر ٹرک میں بیٹھتے ہیں اور لے جا کر کہیں پھینک آتے ہیں۔

حجاج میں بھی ایسے ایسے گنواروں کو دیکھا کہ قرآن مجید کا تکیہ لگائے ہوئے سور ہے ہیں مگر کسی نجدی سپاہی یا مطوع کو توفیق نہیں ہوئی کہ ان گنواروں کو ٹوکتا۔ حجاج بیٹھے تلاوت کر رہے ہیں اور گنوار قرآن کی طرف پاؤں کر کے سو رہے ہیں، مگر انہیں کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں میں نے کئی حاجیوں کو اس پر ٹوکا کچھ تو مان گئے، کچھ جھگڑے پر آمادہ ہوگئے، غرض کہ نجدی حکومت میں یہ سب ناکردنیاں ہوتی ہیں مگر نجدیوں کے وظیفہ خوار اس پر چوں تک نہیں کرتے ہماٗثر و مزارات کے ہاتھ لگانے و بوسہ دینے پر نجدیوں کے بے جا تشدد پر عمل درآمد کرانے کی شب وروز کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال ایرانیوں کو کھلی چھوٹ ہے کہ وہ جو چاہیں کریں حتیٰ کہ انہیں تبرا بکنے کی بھی اجازت ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے جالیوں میں دیکھنا شروع کیا کہ حظیرۂ اقدس جالیوں سے کتنے فاصلے پر ہے، اور اس کی شناخت کیسی ہے کہ مجھے نجدی سپاہی نے شرک شرک، حرام حرام کہہ کے دھکا دے دیا حالاں کہ میں نے جالیوں کو ہاتھ میں بھی نہیں لگایا تھا، اپنے اسلاف کی ہدایت کے مطابق اپنے ہاتھوں کو ہرگز اس لائق نہیں سمجھتا کہ ان مقدس جالیوں کو مس کریں مجھے بہت ہی غصہ آیا میں نے اس بد بخت سے کہا: النظر الیٰ داخل الشباب شرک حرام ؟ تو درندے نے دونوں ہاتھوں سے میرے مونڈھوں کو پوری طاقت سے پکڑا، اور اتنے زور سے دھکا دیا کہ اگر وہاں زائرین کھڑے نہ ہوتے تو میں گر پڑتا، جی میں تو آیا کہ اس ظالم سے دودو ہاتھ کرلوں اگر چہ جانتا تھا کہ میرا کیا حال ہوگا مگر سرکار اپنے چشمان مبارک سے دیکھ تو لیتے کہ کفار قریش کے جانشین ان کے غلاموں کے ساتھ ان کے دربار عالی جاہ میں ان کے روبرو کتنا ستم ڈھاتے ہیں، اور پھر میں جھوم جھوم کر یہ عرض کرتا۔

بجرم عشق تو ام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

مگر پھر خیال آیا کہ یہاں جنگ و جدال اور غوغہ حرام ہے، اس لیے خون کے گھونٹ

پی کررہ گیا، میں کھڑا ہو کر غصہ بھری ہوئی آنکھوں سے اس موذی کو گھور رہا تھا، اور وہ مجھے گھور رہا تھا۔

اسے اتنی تاب کہاں، پھر وہ لپک کر میری طرف بڑھا، اور میرا ہاتھ پکڑ کر کچھ دور گھسیٹ کر لے گیا، پھر پیچھے سے دھکا دے کر اپنی جگہ واپس آگیا، میں نے بڑی حسرت سے بارگاہ عرش جاہ میں عرض کیا: علمکُ بحالی کفانی عن سوالی۔

اس کے برخلاف ایک دن دیکھا کہ بیت فاطمہ کے پاس ایک ایرانی سر پر پگڑی رکھے بیت فاطمہ میں جالیاں پکڑے ہوئے جھانک رہا تھا اور نجدی سپاہی کھڑا دیکھ رہا تھا اسے دانستہ پھٹکارا، میں نے بھی موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور جی بھر کے بیت فاطمہ کی زیارت کی آٹھ بجے صبح کا وقت تھا، اچھی خاصی اندر روشنی تھی، اندر کا سارا منظر صاف نظر آرہا تھا، آخر اس کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے، سوائے اس کے کہ الکفر ملة واحدة نجدی اپنے ایرانی بھائیوں کے ساتھ برادرانہ سلوک نہ کریں تو رشتۂ اخوت کی توہین ہے۔

دوبارہ حاضری

اس وقت تو ہم واپس آگئے، پھر نو بجے حاضر ہوئے، اس وقت عام طور پر زائرین اپنی اپنی قیام گاہ پر ہوتے ہیں، مسجد اقدس اور مواجہہ مبارکہ میں بھیڑ بہت کم ہوتی ہے۔ حسب آدابِ زیارت باب جبریل سے داخل ہوا، اب کی بار حاضری کا رنگ ہی کچھ اور تھا، قدم لڑکھڑا رہے تھے، دل دھڑک رہا تھا، پورا جسم کانپ رہا تھا، آس و یاس، خوف و رجا، امید وبیم کی وہ کش مکش کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ کبھی اپنی بداعمالیوں وبدکرداریوں پر نظر جاتی، تو شرم خجالت سے قدم بندھ جاتے، معاً ان کی رحمت آواز دیتی، آؤ آؤ۔

ایں در گہِ مادر گہِ نومیدی نیست

شفاعتی لاھل الکبائر من امتی

تو ہمت بندھتی، بصد شوق یہ عرض کرتا ہوا آگے بڑھتا۔ ع

سلام اس پر بروں کو جس نے فرمایا یہ میرے ہیں

چاہتا یہی تھا کہ سیدھے مواجہہ اقدس میں حاضر ہوں، اسی طرف مڑا بھی کہ نجدی سپاہی نے روک دیا اور اشارہ کیا کہ سیدھے مسجد اقدس میں جاؤ۔ دل پر ہاتھ رکھ کر یہی کرنا پڑا۔ سامنے ہی صفہ تھا، ان کے ان دیوانوں کا ڈیرہ جو دنیا ومافیہا کو خیرآباد کہہ کر ان کی دیوار تلے پڑے رہتے تھے، جگہ خالی نظر آئی، حاضر ہو کر دو رکعتیں بہت مختصر پڑھیں، اور آگے بڑھا۔ اب میرے قدم اس حصے میں تھے، جو ان کے عہد مبارک میں مسجد تھے، سامنے ریاض الجنۃ ہے جس کی داہنی جانب منبر اقدس ہے، اور سامنے ہی محراب نبوی، فرط مسرت میں اختیار سے باہر ہوا جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ میں رقص کروں مگر معاذ اللہ رقص اور یہاں:

بے ادب پا منہ ایں جا کہ عجب درگاہیست

با خدا دیوانہ باشی با محمد ہوشیار

ریاض الجنۃ کے ایک ایک ستون کو دیکھا، جی چاہا کہ اسی وقت ہر ستون کے پاس دوگانہ شکرانہ ادا کروں، مگر دل کی ہوک کچھ اور تھی، اس لیے محراب نبوی میں حاضر ہو کر دوگانہ پڑھا، اور پھر منزل مقصود کی طرف چلا۔ ایک منٹ بھی نہ گزرا کہ میں کعبۂ مقصود مواجہہ اقدس میں حاضر تھا۔ جالیوں اور مسجد اقدس کے مابین اب بھی زائرین کا تانتا بندھا تھا۔ اس لیے میں کترا کر مواجہہ اقدس کے مقابل ستونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا، معاً یہ تصور بندھا کہ سرکار، سامنے جلوہ فرما ہیں، اور میں روبرو حاضر ہو کر سلام عرض کر رہا ہوں۔ اب وفور خوشی بلکہ سرتا پا خوشی میں وہ کیفیت طاری ہوئی جس کا تحمل مشکل ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ سینے سے باہر نکل پڑے گا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔ اس بارگاہ عرش جاہ میں نذر گزارنے کے لیے ہم غربا کے پاس سوائے آنسوؤں کی لڑی کے اور ہے ہی کیا؟۔

سرکار کے جتنے بھی اسماء طیبات یاد آتے گئے، سب کے ساتھ سلام عرض کیا۔ پورے درود تاج کے اسماء دلائل الخیرات کے کثیر اسما، ان کے علاوہ اور کثیر اسما۔ مجھے یاد نہیں کتنی دیر تک کھڑا صلوٰۃ وسلام عرض کرتا رہا۔ پھر حضرت صدیق اکبر کے مواجہہ اقدس میں حاضر ہوا۔ اب عالم خیال میں سوا چودہ برس پہلے مکہ کی گلیوں میں پہنچ گیا اور حضرت صدیق اکبر کی

ہر ہر قربانی، ہر ہر ادا یاد آتی گئی، اور جب تک پوری زندگی کا ایک ایک ورق ختم نہ ہو گیا، صلوٰۃ وسلام عرض کرتا رہا۔

اس کے بعد فطری طور پر حضرت فاروق اعظم کی طرف دامن دل کھنچا، اور ان کے مواجہ اقدس پر حاضر ہوا، یہاں بھی وہی کیفیت پیدا ہوئی۔ گھر سے شمشیر بکف نکلنے سے لے کر قیصر و کسریٰ کی شوکت و عظمت خاک میں ملا کر عظمت اسلام کا سکہ چار دانگ عالم میں بیٹھا نے، اور ابولؤلؤ کے حملہ، اور اصحاب شوریٰ کے انتخاب تک کے سارے واقعات ذہن کے پردوں پر ابھرتے گئے، پھر شہادت و تدفین پر آکر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اسی کے ساتھ ان پر صلوٰۃ وسلام کا سلسلہ بھی ختم ہوا۔ پھر آداب زیارت کے مطابق دونوں حضرات کے درمیان کھڑے ہو کر مشترکہ سلام عرض کرنے اور بارگاہ اقدس میں سفارش کرنے کی انتہائی الحاح و زاری کے ساتھ درخواست پیش کرنے کے بعد پھر کعبہ مقصود پر پلٹا، کچھ دیر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کے بعد اب درخواستیں اور احباب کے سلام پیش کرنے کی نوبت آئی۔

وفور مسرت کا طوفان تھم چکا تھا، باطمینان عرض حاجات کرنے لگا، چوں کہ زندگی کی یہ معراج میرے محسن اعظم الحاج سیٹھ ابراہیم احمد برکاتی کی عنایت سے حاصل ہوئی تھی، اس لیے سب سے پہلے ان کا اور ان کے صاحبزادے الحاج زبیر احمد کا سلام عرض کیا، اور جو کچھ ہو سکا مانگا، پھر دیگر اعزہ و احباب کی باری آئی، جہاں تک یادداشت نے کام کیا، سوچ سوچ کر سب کا سلام اور سب کی التجائیں پیش کیں۔ اخیر میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کا مشہور و معروف سلام، مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام، عرض کیا اور واپس ہوا۔ باب جبریل سے باہر نکلا تو گیارہ بج چکے تھے۔ دس دن مدینہ طیبہ قیام رہا۔ اس اثنا میں روزانہ تقریباً ہر نماز کے بعد حاضری دیتا نیز احد شریف، قبا، مسجد قبلتین، غزوہ خندق کے میدان میں بنی ہوئی مساجد خمسہ و دیگر مساجد مثلاً مسجد غمامہ وغیرہ کی بھی زیارت کرتا رہا۔ جنۃ البقیع شریف بھی روزانہ حاضر ہوتا رہا۔ یہ دس دن یوں گزر گئے جیسے چند منٹ:

واھا لسویعات ذھبت آن عہد حضور ''بار گہت''

جب یاد آوت موہے کر نہ پرت دردا مدینے کا جانا

واپسی:

میرا ارادہ تھا کہ شہدائے بدر کی بارگاہ میں حاضری ضرور دوں گا۔اس کے لیے اپنی پرائیویٹ گاڑی کی گئی ۔ ۲۸؍ذو قعدہ رمطابق ۱۴؍اگست بروز بدھ عصر کے قبل بہتے ہوئے آنسوؤں اور حسرت زدہ قلب وجگر کے ساتھ مدینہ طیبہ کو وداع کیا۔احرام کے کپڑے قیام گاہ ہی پر پہن لئے تھے۔ذوالحلیفہ جسے اب بیر علی کہتے ہیں آکر عصر کی نماز ادا کی گئی،اور احرام کی نیت بھی ۔پھر موٹر روانہ ہوئی۔مغرب میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا کہ بدر شریف پہنچ گئے ،مغرب ادا کر کے احاطہ مبارکہ میں داخل ہوئے اور اسلام کے ان جاں نثاروں کی بارگاہ میں حاضر ہوئے جن کے مقدس خون نے اسلام کو اس وقت سینچا تھا جب سوائے چند نفوس قدسیہ کے کوئی اسلام کا نام لیوا نہ تھا۔وہاں سلام و فاتحہ خوانی کے بعد عشا کی نماز پڑھی گئی،اور پھر قافلہ مکہ معظمہ چلا،راستے میں منزل مستورہ پر موٹر رکی،ہم نے کھایا پیا،ڈرائیوروں نے آرام کیا۔تقریباً دو گھنٹے وہاں رکے،اس کے نتیجے میں ڈھائی بجے مکہ معظمہ پہنچے۔

حاجی عبدالستار صاحب بٹاٹے والے کے توسط سے ایک مدنی صاحب کے یہاں میلاد شریف میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ۔بمبئی والے حاجی بابا کی کوششوں سے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب خلف الرشید حضرت مولانا ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نیاز حاصل ہوا۔انہوں نے اپنی دیرینہ روایت کے مطابق ہمیں کھانے پر بھی مدعو کیا۔اس طرح دوبار شرف ملاقات حاصل ہوا۔مکہ معظمہ واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ حکومت نے امسال اپنے یہاں کے حساب سے تیس کی رویت مانی ہے اور امسال حج بتاریخ ۲۵؍اگست بروز یک شنبہ ہوگا۔

جنۃ المعلیٰ حاضری دے چکا تھا،ابھی تک غار حرا کی زیارت نہیں کی تھی۔بتاریخ ۱۸؍اگست بروز یک شنبہ میں اور حضرت حسنین میاں صاحب اور قاری تراب علی صاحب غار حرا کی زیارت کے لیے گئے،وہاں پہاڑ کے دامن میں نجدیوں کے مقرر کردہ افراد ہر زبان میں مسلسل لوگوں کو اوپر جانے سے منع کرتے رہتے تھے،حرام،شرک وغیرہ سناتے رہتے،مگر میں نے دیکھا کہ نیچے سے لے کر جبل نور کی چوٹی تک آنے والوں اور جانے والوں کا سلسلہ

بندھا ہوا ہے، ان غریبوں کی چیخ پکار کا کسی پر کوئی اثر نہیں۔

واعظ برس رہا ہے پئے جارہا ہوں میں

ہم تینوں نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ حضرت حسنین میاں صاحب کا چند ماہ پہلے اپنڈ سائینس کا آپریشن ہوا تھا، وہ کچھ دور جا کر واپس آگئے، مگر میں اور قاری تراب علی صاحب غار شریف تک پہنچے یہاں بھی بھیڑ کافی تھی۔ نمبر لگایا، کچھ دیر کے بعد اندر جانے کا موقع مل گیا، غار اندر جاتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس دنیا میں نہیں بلکہ کسی اور ہی عالم میں ہوں، جو سراسر نور، نکہت اور رحمت ہے۔ دو رکعت نماز پڑھی، کچھ دعائیں مانگی کہ پیچھے سے دوسرے امیدواروں نے دھکا دینا شروع کیا اور دل مسوس کر یہ کہتا ہوا۔ ع:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد" قبلے کی طرح دراڑ میں سے باہر آگیا۔

علما نے لکھا ہے غار حرا سے کعبہ نظر آتا ہے۔ میں نے بھی نزہۃ القاری جلد اول ۱۸۵ پر ان پر اعتماد کرتے ہوئے لکھ دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ غار کا منہ کعبہ شریف کے مخالف سمت ہے۔ غالبا جانب شرق، اور کعبہ وہاں سے جانب مغرب ہے، البتہ غار کی پشت سے حرم شریف نظر آتا ہے۔ میں تو ضعف بصارت سے نہ دیکھ سکا مگر قاری تراب علی صاحب نے دیکھا، اور اشارے سے مجھے بتایا۔

منیٰ کی حاضری:

سنت یہی ہے کہ آٹھ ذوالحجہ کو نماز فجر پڑھ کی منیٰ چلا جائے لیکن حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے معلمین آٹھویں شب کو عشا بعد ہی سے حجاج کو منیٰ بھیجنا شروع کر دیتے ہیں، اس لیے ہم لوگوں نے بھی عشا کے بعد ہی حج کا احرم باندھا۔ چوں کہ طواف افاضہ کے بعد، سعی صفا و مروہ کے مابین بہت رش رہتا ہے، اس لیے ہم سب لوگوں نے نفل طواف کر کے سعی بھی کر لی۔ بارہ بجے کے پہلے قیام گاہ پر آئے۔ دو بجے معلم صاحب کے دفتر پہنچے، کچھ دیر موٹر تلاش کرنے میں لگی بالآخر موٹر ملی، اور ہم لوگ نماز فجر کے بعد منیٰ پہنچ گئے۔ یہ دن اور رات منیٰ میں گزری۔ نو کو آٹھ بجے کے بعد عرفات چلے، اور غالبا گیارہ بجے حاضر ہو گئے۔ منیٰ میں جب ہم موٹر میں بیٹھے تو معلوم ہوا کہ حضرت حسنین میاں صاحب کی پھوپھی غائب ہیں،

حضرت حسنین میاں صاحب ان کی تلاش کے لیے موٹر سے اتر گئے۔جب ہم لوگ عرفات پہونچے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک دوسری موٹر میں یہاں آ گئی ہیں،ان کی طرف سے تو اطمینان ہو گیا مگر اب حضرت حسنین میاں صاحب کی فکر ہوئی کہ وہ منیٰ میں پریشان ہوں گے۔ایک گھنٹہ اسی الجھن میں گزرا کہ وہ بھی بارہ بجے آ گئے۔اب اطمینان ہوا تازہ وضو کیا اور اپنے کام میں لگ گئے۔

مگر پاس ہی کچھ حجاج ایسے بھی تھے جو غپ شپ،ہنسی مذاق میں مصروف تھے،جس کی وجہ سے حضور قلب حاصل نہ ہو سکا مگر جیسے بھی ہو سکا اپنے کو مشغول رکھا،میرا جی چاہتا تھا کہ مسجد نمرہ کی حاضری دوں مگر ساتھیوں نے باصرار منع کیا کہ اولا مسجد نمرہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے،دھوپ بھی بہت سخت ہے،ثانیا واپسی میں خیمے کی تلاش مشکل ہوگی،اور اگر خیمے تک نہ پہنچ سکے تو مزدلفہ پیدل جانا پڑیگا،ناچار وہیں خیمے میں نماز ظہر ادا کر لی۔پھر مشغول ہو گیا۔طے یہی کیا تھا کہ آج قیلولہ نہیں کرنا ہے۔

مگر تھوڑی دیر کے بعد نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں سونے پر مجبور ہو گیا،خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا سید مصطفیٰ حیدر حسن صاحب سجادہ نشین مارہرہ مطہرہ برادر سید العلما احرام باندھے ہوئے تشریف لائے ہیں،اور فرما رہے ہیں:مفتی صاحب! آپ حج کے لیے آئے اور مجھ سے نہیں ملے؟ میں نے عرض کیا:سرکار! مجھے اس کی خبر ہی نہیں تھی کہ حضور بھی حج کے لیے آئے ہوئے ہیں،پھر مسکرا کر فرمایا اچھا چلتے ہیں،پھر ملیں گے۔میں گھبرا کر اٹھا،خواب کی اس کیفیت پر خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی،پھر میں نے تازہ وضو کیا اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کی۔زبانی جتنی آیتیں وسورتیں یاد تھیں سب کی تلاوت کی پھر اوراد پڑھے،پھر خیال آیا کہ درود رضویہ بھی پڑھوں،کھڑے ہو کر مدینہ طیبہ کی طرف منھ کر کے ان گنت درود رضویہ پڑھا،اتنے میں عصر کا وقت ہو گیا،ساتھیوں کو جمع کر کے باجماعت نماز عصر ادا کی،پھر خیمے سے باہر نکل کر وقوف کیا،کچھ دیر تک کوئی خاص کیفیت پیدا نہ ہو سکی۔

مگر پھر رحمت ایزدی اس حقیر کی جانب متوجہ ہوئی،پھر تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہیبت وجلال مجھے جلا کر خاک کر دیں گے،منھ سے چیخیں نکلنے لگیں،دھاڑیں مار مار کر رونے

لگا، دعاؤں کا پڑھنا دوبھر ہوگیا، بہت دیر تک یہی حال رہا، پھر سکون ہوا، متوسط آواز سے دعائیں پڑھنے لگا، اتنے میں کسی نے کان پر منھ رکھ کر کہا: دعائیں بلند آواز سے پڑھیے تا کہ آپ سے سن کر ہم لوگ بھی پڑھیں۔

میں ابتداء میدان میں اکیلا ہی کھڑا تھا اب مڑ کے دیکھا تو دس بارہ آدمی میرے پیچھے کھڑے ہیں، جن میں کسی سے بھی میں آشنا نہ تھا، معلموں کی طرح میں بلند آواز سے دعا کا ایک ایک جز پڑھتا پھر وہ لوگ پڑھتے اس میں ایک نیا کیف، نئی لذت محسوس ہوئی۔ میں اسی عالم سرشاری میں تھا کہ ساتھیوں میں سے کسی نے آواز دے کر کہا کہ چلیے ورنہ موٹر میں جگہ نہیں ملے گی۔ میں نے دعا تقریبا ختم کر لی تھی، جو باقی تھی، اسے پوری کی، آخیر میں حاجی ابراہیم احمد صاحب کے لیے خصوصا اور اپنے سب اعزہ واحباب کے لیے عموما مختصر دعا کر کے مڑا تو دیکھا خیمہ خالی ہے، سب ساتھی موٹر پر جا چکے ہیں، پیچھے کھڑے رہنے والے سب آدمیوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور حج کی مبارکباد دی، میں نے بھی ان لوگوں کو مبارک باد دی، اور گیٹ کی طرف بڑھا اور سامنے کھڑی ایک موٹر میں بیٹھ گیا، بیٹھنے کے بعد مڑ کے دیکھا تو سب ہمراہی اسی موٹر میں تھے، غروب آفتاب میں بھی بیس پچیس منٹ باقی تھے میں نے اس وقت کو بھی رائیگاں نہیں جانے دیا، غروب آفتاب کے ایک گھنٹے بعد بس اسٹارٹ ہوئی، مزدلفہ پہنچے، میں اور حسنین میاں اور مستورات موٹر سے اتر کر مزدلفہ کے میدان میں گئے، میں نہ یہ سوچ کر کہ سرکار حسن میاں صاحب مدظلہ نے ملاقات کا وعدہ کیا ہے، شاید وہ اپنوں کی بھیڑ میں نہ تشریف لائیں، تنہا کہیں اجنبیوں میں رہوں تو ممکن ہے کہ کرم فرمائیں۔ ان لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لی، اور ایک نا معلوم سمت چل پڑا، ایک جگہ خالی دیکھ کر چادر بچھائی، قریب ہی نل تھا، وضو کر کے نماز مغرب اور عشا پڑھی، نمازوں سے فارغ ہونے کے بعد دیکھا کہ کچھ لوگ اور آ گئے ہیں۔

ان میں ایک صاحب دمہ کے مریض تھے، انہیں کھانسی آئی اور بہت سا بلغم میرے قریب ہی تھوک دیا، اس لیے میں وہاں سے بھی اٹھا اور کسی اور جگہ کی تلاش میں نکل پڑا کچھ دور چلنے کے بعد ایک جگہ کافی میدان خالی تھا، کچھ لوگ کنکریاں چن رہے تھے، میں نے بھی

وہیں کنکریاں چنیں پھر چادر بچھا کر تھوڑی دیر لیٹ گیا لیکن نیند نہیں آئی، نیند آتی بھی کہاں سے؟ ایک گنہ گار سیہ کار بندہ، جبار وقہار معبود کی بارگاہ میں حاضر ہے، لاکھوں لاکھوں کی بھیڑ ہے معلوم نہیں کسے قبول کیا جائے گا، اور کیسے دھتکار دیا جائے گا، مجھے پتا نہیں کہ میں کس گروہ میں ہوں۔ گھر بار چھوڑا، اعزہ اور اقربا چھوڑے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے یہاں حاضر ہوں، پتا نہیں کس گروہ میں ہوں؟ گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اللہ نے توفیق دی اس کی یاد کی۔

اسی عالم میں ایک بار بے اختیار نگاہ اوپر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ احرام باندھے قبلے کی طرف سے چلے آرہے ہیں۔ میں نے اٹھ کھڑا ہونا چاہا کہ آگے بڑھ کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کروں مگر قدم جیسے بندھ گئے تھے، یہاں تک کہ آنے والے بزرگ بہت قریب آگئے، اب یہ دیکھتا ہوں کہ وہ مفتی اعظم نہیں کوئی اور بزرگ ہیں، انہوں نے آتے ہی سلام کیا میں نے سلام کا جواب دیا، مگر میرے ہوش وحواس غائب تھے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ مجھے نہ تو ان کی دست بوسی کا خیال رہا اور نہ یہ ہوسکا کہ بیٹھنے کی درخواست پیش کرتا، انہوں نے خود ہی مسکرا کر فرمایا: اجازت ہو تو آپ کی چادر پر بیٹھ جاؤں، میں نے عرض کیا: ضرور ضرور تشریف رکھیں، یہ میری سعادت ہے۔ بیٹھنے کے بعد مجھ سے میرا نام، وطن مشغلہ دریافت کیا۔ میں نے سب کچھ اختصار کے ساتھ عرض کردیا پھر میں نے ان سے ان کا نام وغیرہ پوچھا تو فرمایا: نام پوچھ کے کیا کیجیے گا، میں سیلانی آدمی ہوں، آج یہاں کل وہاں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ میں نے دعا کی درخواست کی تو فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ پھر میں نے عرض کی دعائے مغفرت فرمائیں۔ تو کہا: اللھم اغفر لاخی ھــــذا بار بار اس کی تکرار فرمائی، پھر اچانک کھڑے ہوگئے اور فرمایا اب ہم چلتے ہیں، ملنے کا وعدہ کیا تھا، اس لیے آگئے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اور تیزی سے جانب قبلہ بڑھے مجھ پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ انہیں کھڑا دیکھتا رہا، یہ بھی خیال نہ ہوا کہ کب ملنے کا وعدہ فرمایا تھا، یہاں تک کہ وہ غائب ہوگئے۔

بہت دیر تک غور کرتا رہا کہ یہ کون بزرگ تھے اور کیا قصہ ہے مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ کسی اللہ والے نے مجھ بے مایہ پر کرم فرمایا، اس خوشی میں بہت

دیر تک مگن رہا، پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ جب صبح صادق کے وقت توپ کی فائر ہوئی اور پورے میدان میں جگہ جگہ اذانیں ہونے لگیں، تو پھر میں نے تازہ وضو کیا نماز فجر پڑھ کر وقوف کے لیے کھڑا ہو گیا اپنے اور اپنے اعزہ کے لیے جتنی ہو سکیں دعائیں کیں، پھر قریب طلوع آفتاب پیدل ہی منیٰ کی طرف چل پڑا۔ پیدل چلنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ وادی محسر میں تیز رفتاری سے چلنے کی سنت ادا ہو گئی۔ منیٰ پہنچ کر پولیس سے پوچھ کر اپنے معلم کے خیمے میں آیا، جب میں خیمے میں آیا، تو اپنا خیمہ تلاش کرتے ہوئے ایک طرف جا رہا تھا کہ حاجی صفدر حسین صاحب ممبئی والے نے آواز دی، اور باصرار اپنے خیمے میں لے گئے پھر بہ اصرار کھانا کھلایا، چائے پلائی۔ انہوں نے قربانی کے لیے کسی کمپنی کو پیسے دے دیے تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہم لوگ احرام کب کھولیں اور کنکری کب ماریں؟ مین نے ان سے کہا کہ کنکری تو آپ ابھی جا کر مار آیئے اور احرام بعد مغرب کھول لیے گیا، پتا نہیں کمپنی والے کب قربانی کریں۔ پھر میں اپنے خیمہ میں آیا، ابھی تک میرے خیمے میں کوئی نہیں پہنچا تھا، میں چادر بچھا کر لیٹ گیا کچھ دیر کے بعد ساتھی آنے لگے۔ عصر بعد کنکری مارنے کے لیے ہم لوگ گئے، اس سے فارغ ہونے کے بعد ہمارے ساتھی مذبح گئے، میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ مذبح جانے کی ہمت نہ کر سکا۔

قاری تراب علی صاحب کو پیسے دے دیئے اور میں وہاں سے واپس ہو کر مسجد خیف میں حاضر ہوا، نماز مغرب پڑھی، عشا تک حاضر رہا، عشا پڑھ کر خیمے میں آیا، لوگ قربانی کر کے واپس آ چکے تھے، احرام بھی کھول چکے تھے، میں نے بھی سر منڈایا اور احرام کھول دیا۔ نہا کر سو گیا، بہت گہری نیند آئی یہاں تک کہ صبح تک سوتا ہی رہا۔

آج گیارہ ذوالحجہ مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور طواف افاضہ کیا۔ حرم شریف کا پورا صحن، مسجد حرام کے دالان حجاج سے بھرے ہوئے تھے، آدمیوں کا موجیں مارتا ہوا سمندر کعبہ کے گرد دیوانہ وار طواف کر رہا تھا، بھیڑ دیکھ کر میری ہمت جواب دے گئی مگر طواف کرنا ہی تھا، اپنے مشائخ سلسلہ سے استعانت کر کے بھیڑ میں گھس گیا، اور طواف شروع کر دیا، جد و جہد کر کے کعبہ شریف کے بالکل قریب پہنچ گیا، یہاں تک کہ کبھی کبھی میرے اور کعبہ کے درمیان

کوئی حائل نہ رہتا، دو پھیرے حطیم کی دیواروں سے لگ کر کیے، پچیس منٹ میں طواف سے فارغ ہو گیا۔ اس وقت میرے ساتھ صرف قاری تراب علی صاحب تھے۔ طواف کے بعد ہم دونوں مسجد حرام کی چھت پر چڑھ گئے وہاں سے طواف کرنے والوں کا منظر دیکھ دیکھ کر روح جھوم جھوم اٹھتی۔ ہم لوگ بہت دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے، پھر قیام گاہ پر آئے اور عصر کے بعد پھر منیٰ پیدل چلے، اس وقت جمرات پر بھیڑ بہت کم تھی، اطمینان سے بہ طریق مسنون و مستحب تینوں جمرات پر کنکریاں ماری گئیں اور خیمے میں واپس آئے۔

۱۲رذوالحجہ کو سوائے کنکری مارنے کے اور کوئی کام نہیں تھا، اس لیے ناشتے کے بعد مولانا افتخار احمد صاحب سابق استاذ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ یہ ''ریاض'' میں رہتے تھے، مع اپنے بال بچوں کے حج کے لیے آئے تھے، ان سے ملاقات کے بعد الحاج سیٹھ اسماعیل جانی اور حاجی عبدالستار بٹاٹے والے سے ملنے کے لیے گئے، ان سے ملاقات کر کے حضرت علامہ اختر رضا صاحب ازہری جانشین مفتی اعظم ہند کی خدمت میں حاضری کو سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت خود ہی کرم فرماتے ہوئے تشریف لائے، دوپہر کا وقت اسی میں بیت گیا، کھانا کھا کر میں چاہتا تھا کہ کچھ دیر آرام کروں کہ سب ساتھیوں نے یک بیک رمی جمرہ کا پروگرام بنالیا، میں نے سب کو منع کیا مگر کوئی نہیں مانا۔ خیمے میں صرف حسنین میاں کی والدہ ماجدہ اور ان کی پھوپھی صاحبہ رہ گئیں۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ بعد عصر کنکری مارنے کے لیے جاؤں گا پھر پیدل مکہ معظمہ واپس جاؤں گا۔ سب لوگ چلے گئے، میں بیٹھا ہی رہا۔ اتنے میں بریلی شریف کے کچھ حضرات ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ انہوں نے مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک میں شرکت کی دعوت دی، میں نے قبول کرلی، پھر دوسری باتیں شروع ہوگئیں۔ اتنے میں اچانک میرے کانوں میں آواز آئی، جمرہ پر آؤ مجھے پانی پلاؤ۔ آواز انتہائی دردناک تھی، جیسے جاں بلب پیاسا کسی کو پکار رہا ہو۔ میں نے اس کو اپنا واہمہ سمجھا مگر تین بار یہی آواز آئی۔ اب میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بریلی والوں سے معذرت کی کہ چوں کہ مجھے کل ہی جدہ جانا ہے، اس لیے میں کنکری مارنے جارہا ہوں، اور میں تیزی سے جمرہ کی طرف چلا، راستے میں مولانا خلیل احمد صاحب کا قافلہ بھی مل گیا، ساتھ

ساتھ جمرہ پر پہنچے، سب نے جمرۂ اولیٰ کی رمی کسی طرح کرلی، اس سے فارغ ہوکر جمرۂ ثانیہ کی طرف ہم لوگ جارہے تھے کہ مولانا خلیل احمد خاں صاحب ہکا بکا، ننگے سر، چشمہ غائب، ننگے پاؤں چلے آرہے ہیں اور فرمایا کہ حضرت واپس چلیے اس وقت ہرگز کنکری نہ ماریے، میری جان بچ گئی، میں گر پڑا تھا، سمجھے ہوئے تھا کہ اب میں گیا، کلمہ تک پڑھ لیا تھا، آپ کی زیارت مقدر تھی کہ کچھ لوگوں نے ترس کھا کر مجھے اٹھالیا اور جان بچی۔ ہمارا قافلہ منتشر ہوچکا تھا۔ قاری تراب علی، حاجی منشی محبت علی مع اہلیہ کا پتا نہ تھا، باقی ماندہ لوگ واپس ہوئے اتنے میں ایک سفید ریش بزرگ سر پر افغانیوں کی طرح عمامہ باندھے ہوئے تشریف لائے، میرے پاس تھرماس تھا مجھ سے پانی مانگا میں نے تھرماس کے ڈھکنے میں بھر کر انہیں پانی پیش کیا، وہ پینے کے لیے بیٹھ گئے، آدھا پانی پی کر مجھے واپس کردیا، میں نے اصرار سے کہا کہ اور پی لیجئے مگر ڈھکنا انہوں نے مجھے تھما دیا اور کھڑے ہوگئے۔ میں نے باقی ماندہ پانی پیا۔ اب دیکھتا ہوں تو ان بزرگ کا پتا نہیں، اتنے میں میرے ساتھی آگے بڑھ چکے تھے لیکن کر ان کے ساتھ ہوگیا، طے یہ ہوا کہ اس وقت واپس چلیں پھر شام کو آکر کنکری ماری جائے گی۔

چوں کہ میں پہلے جہاز سے گیا تھا، واپسی کے لیے بھی میرا پہلا ہی جہاز تھا، جو وہاں کی ۱۳ر ذوالحجہ اور ہندوستان کی ۱۲ مطابق ۲۹ر اگست بروز جمعرات تھا، قاعدے کے مطابق بارہ ایک بجے دن تک ایئر پورٹ پہنچ کر ٹکٹ او کے کرانا ضروری تھا اس لیے ہم لوگ بارہ ہی کو مکہ معظمہ آگئے۔ میں دو بجے رات کو حرم شریف میں حاضر ہوا، نماز فجر کے بعد طواف وداع کیا اور بصد حسرت ویاس بیت اللہ شریف کو آخیر سلام کرکے قیام گاہ پر آیا، ۱۲ر بجے جدہ پہنچے لیکن ہمارا ہوائی جہاز رات میں ۱۱ر بج کر ۴۲ر منٹ پر جدہ سے چلا، واپسی میں نجدی ایئر پورٹ پر وہی بدنظمی اور حاجیوں کی ایذا رسانی کی کارفرمائی تھی۔

اس کے باوجود کہ حجاج صبح ہی کو ایئر پورٹ پہنچ چکے تھے اور ۱۲ر بجے تک تو تمام ہی حجاج آگئے تھے مگر حجاج کو اندر نہیں جانے دیا گیا، جہاز چھوٹنے سے کچھ پہلے سامان اندر جانے لگا تو وہ مارا ماری وہ اٹھا پٹک کہ اگر قاری تراب علی صاحب میرے ساتھ نہ ہوتے

تو شاید میں اندر مع سامان کے نہیں جا سکتا تھا۔ پھر اندر پہنچنے کے بعد قطار میں اتنی دیر تک کھڑا رہنا پڑا کہ سارے حاجی تھک کر چور ہو گئے۔ خیر خدا خدا کر کے ہوائی جہاز تک پہنچے، جہاز اسٹارٹ ہوا اور ہم ۷؍ بجے صبح کو (ممبئی کے ٹائم سے) ممبئی پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ پر لینے کے لیے حاجی ابراہیم احمد صاحب برکاتی، جناب قاری سراج اظہر صاحب رضوی، عزیزم مولانا ولی اللہ صاحب مع اپنے احباب کے اور عبدالرزاق بٹاٹے والے موجود تھے۔ واپسی میں بھی عطاری مسجد ہی میں قیام رہا۔ اب کی بار بھی ان سب احباب نے وہی کرم فرمائی کی جو پہلے کر چکے تھے۔ تین دن قیام کے بعد مہانگری اکسپریس سے گھر واپس آ گیا۔

فالحمد لله علىٰ ذٰلک والصلوٰة والسلام علىٰ حبيبه وعلىٰ آله وصحبه

حج و زیارت سے مشرف تو ہو چکا مگر رہ رہ کے خیال آتا ہے:

لاکھ سکھی پی ایک ہے چو اور پی پی ہوے
ناجانوں اس جھنڈ میں کون سہاگن ہوے

محمد شریف الحق امجدی

خادم الافتا: الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور، اعظم گڈھ

۶؍ ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ؍ مطابق ۱۹؍ دسمبر ۱۹۸۵ء شب پنج شنبہ

(نزہۃ القاری ج ۲ ص ۵)

اشرفیہ کا وفد بمبئی میں

جلالۃ العلم،حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی جسمانی و روحانی توانائیوں کا مظہر الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور بحمدہ تعالیٰ اپنے بانی کی امیدوں کے مطابق ان کے شہزادے و جانشین عزیز ملت حضرت مولانا شاہ عبدالحفیظ صاحب زید مجدہم کی سربراہی میں روز افزوں ترقی کرتا چلا جارہا ہے۔جامعہ ہٰذا کی عظمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس وقت اڑسٹھ مدرسین و دیگر ملازمین کا اسٹاف تعلیم وتعلم و انتظام میں مصروف ہے۔علاوہ ان ایثار پسند افراد کے جو فی سبیل اللہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔دو ہزار طلبہ مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔اس میں سات سو وہ بیرونی طلبہ ہیں جن کے قیام و طعام، کتاب، روشنی وغیرہ کا مدرسہ کفیل ہے۔ناظرے سے لے کر دورۂ حدیث تک کہ اعلیٰ و بے مثال تعلیم کا انتظام ہے۔پانچ زبانوں میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی جارہی ہے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ہندی۔اب تک کا دستور یہی تھا کہ دینی مدارس سے فارغ شدہ علما صرف اردو میں تقریر کرنے پر قادر ہوتے تھے،آج کی سمٹی ہوئی دنیا کا لحاظ کرتے ہوئے دیگر بلاد میں تبلیغ کی ضرورت کومحسوس کرتے ہوئے اپنے نصاب میں اس کا پورا پورا لحاظ کیا ہے کہ ہمارے یہاں کے فارغ شدہ علما فارسی ،عربی ،انگریزی میں بھی تقریر کرنے پر قادر ہوں۔اس کے لیے بی،اے تک کی انگریزی زبان کا بندوبست بھی کردیا۔اسی کا نتیجہ ہے کہ جامعہ کے فارغ شدہ علما سعودی عربیہ،افریقہ،ہالینڈ،برطانیہ وغیرہ میں دین وملت کی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔جس کا اثر یہ ہے کہ ملک تو ملک بیرون ملک کے طلبہ بھی یہاں تعلیم میں مصروف ہیں،مثلاً سری لنکا،افریقہ،ہالینڈ وغیرہ۔

امسال داخلہ کے متمنی طلبہ کی اتنی کثرت تھی کہ جامعہ سب کا داخلہ نہیں کرسکا۔سب سے اہم مسئلہ قیام کا ہے۔جس پر قابو پانا بڑا مشکل ہے۔ایسے کمرے جن میں چار افراد کے

قیام کی گنجائش تھی چھ کو رکھا گیا، پھر بھی مجبور ہو کر ڈیڑھ سو طلبہ سے معذرت کرنی پڑی جس کا کارکنان اشرفیہ کو بے حد قلق ہے۔ اور اسے جان کر دوسرے بہی خواہان اشرفیہ کو بھی ہوگا۔

ادھر درس گاہ کی وہ وسیع فلک بوس عمارت (جو ۲۰×۳۰) کے اٹھائیس کمروں پر مشتمل ہے، جن میں دو ہال ۳۰×۴۰ کے ہیں، فل ہوگئی۔ لہٰذا اس کی شدید ترین ضرورت محسوس ہوئی کہ حفظ وقرأت کے لیے مجوزہ عمارت کی تعمیر جلد از جلد کی جائے، دارالحدیث کا وہ عالیشان گنبد جو ۴۲×۴۲ کے وسیع وعریض ہال پر تعمیر ہونے والا ہے نامکمل پڑا ہے۔

ان سب کی تکمیل کے لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک کے مخیّر، دین پرور افراد کو اس طرف متوجہ کیا جائے، اراکین کی استدعا پر ایک وفد کی تشکیل ہوئی، جس کے لیے مندرجہ ذیل حضرات کو نامزد کیا گیا۔

(۱) عزیز ملت حضرت سربراہ اعلیٰ صاحب
(۲) محدث کبیر حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب
(۳) مفکر اسلام حضرت مولانا محمد ادریس صاحب
(۴) جناب مولانا غلام حسین صاحب
(۵) جناب صوفی نظام الدین صاحب
(۶) جناب عبدالغفور صاحب

چنانچہ یہ حضرات بمبئی گئے، اور ساتھ ہی راقم الحروف فقیر امجدی بھی۔ اللہ عزوجل کا فضل وکرم اور اس کے حبیب ﷺ کی عنایت سے خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ بمبئی کے حضرات نے اس وفد کا پر جوش محبت بھرے انداز میں استقبال کیا، اور ہر طرح تعاون کیا۔ جن میں سرفہرست محسن ملت الحاج سیٹھ احسان اللہ خاں صاحب (پہلوان سیٹھ) اور عزیز گرامی قدر مولانا معین الحق صاحب ابن الحاج سیٹھ شمس الحق علیمی مرحوم کے اسمائے گرامی ہیں۔ اللہ عزوجل کسی کو دولت وثروت دے یہ اس کا فضل وکرم ہے۔ پھر اسے دینی کاموں میں صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے، یہ اس کا دوسرا اور عظیم فضل ہے، اور دونوں فضل وکرم سے بڑھ کر یہ فضل وکرم ہے کہ کسی کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ دینی کاموں کے لیے اپنا وقت

صرف کر کے اور دوسروں کی تعاون کی ترغیب دے۔ جناب پہلوان سیٹھ پر اللہ عزوجل کے تینوں فضل ہیں۔ اللہ نے انہیں غناے مالی سے بھی نوازا ہے، اور دل کھول کر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حوصلہ بھی عطا فرمایا ہے۔ یہ نسبتا بہت آسان ہے کہ کوئی شخص اپنی جیب سے امداد واعانت کردے مگر دوسروں سے کہنا بڑا مشکل ہوتا ہے، جناب الحاج سیٹھ پہلوان صاحب اس معاملہ میں بھی قطعا جھجک محسوس نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ بمبئی میں ''اشرفیہ'' کے وفد کی کامیابی موصوف ہی کی کوششوں کی رہین منت ہے۔

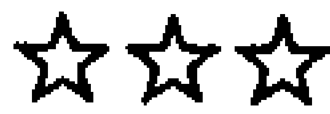
الحاج سیٹھ پہلوان صاحب ہی کی ہدایت پر یہ وفد بھیونڈی بھی گیا، وہاں الحاج عبد الحمید صاحب نے بھی اسی طرح تعاون کا مظاہرہ کیا، جس طرح الحاج سیٹھ پہلوان صاحب ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی گاڑی وفد کے لیے وقف کی، ساتھ ہی ساتھ ہر جگہ تشریف لے گئے، اور لوگوں پر زور بھی ڈالا۔ بھیونڈی میں ان کے ساتھ الحاج سیٹھ نثار احمد صاحب عزیزی، جناب حافظ قمر الدین صاحب، صوفی مختار احمد صاحب وغیرہم نے بھی وفد کی بھر پور تعاون کیا۔

بمبئی میں الحاج سیٹھ اسمٰعیل جانی صاحب نے بھی وفد کا پورے طور سے تعاون کیا۔ بعض ایسے حلقے جہاں سے اشرفیہ کا کوئی لگاؤ نہیں تھا وہاں وفد کو لے گئے اور اشرفیہ کا مکمل تعارف کرایا۔ اللہ عزوجل کا شکر ہے کہ اس میں وہ کامیاب ہوئے، بات نامکمل رہ جائے گی اگر ہم عالی جناب سیٹھ مصطفیٰ خاں صاحب کا ذکر خیر نہ کریں، جنہوں نے ہمیں بڑے شوق و محبت وعقیدت کے ساتھ اپنا مہمان بنایا۔ موصوف بھی اس زمانہ میں بہت ہی قابل قدر ہیں، علما کی عزت واحترام، دین کی راہ میں بے دریغ خرچ کرنا ان کا خاص شعار ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ عزوجل اپنے حبیب ﷺ کے صدقے اور طفیل میں اشرفیہ کے ان سرپرستوں کو آفات ارضی وسماوی سے محفوظ رکھے۔ اوران کے کاروبار میں یوما فیوما ترقیاں عطا فرماتا رہے۔ اور دارین میں انہیں شاد وآباد رکھے۔ آمین ثم آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

جدید تعمیرات:

شوال سے اب تک مسلسل تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ صدر گیٹ کے متصل جانب شمال لب سڑک ایک ہسپتال کی تعمیر ہوئی ہے۔ جس میں جملہ امراض کے علاج کا بہت اعلیٰ سائنٹفک انتظام ہوگا، نئے دارالاقامہ میں بالائی منزل پر تعمیر کا کام شروع ہے، جن میں تقریبا چار کمرے مکمل ہیں، موجودہ باحوصلہ اراکین کا پروگرام یہ ہے کہ تعمیر کا کام مسلسل ہوتا رہے گا۔ بترتیب الاھم فالاھم عمارتیں بنتی جائیں گی، ان کی نظر میں سب سے اہم دارالحدیث کا گنبد ہے۔ اس کے بغیر درس گاہ کی سنٹرل بلڈنگ بے زیب لگتی ہے، اس کے لیے مستریوں سے بات چیت جاری ہے۔ لیکن اس پر مصارف کا تخمینہ اتنا زیادہ ہے کہ کام شروع کرتے ہوئے ہچکتے ہیں، اس پر تعمیر کے مصارف کا تخمینہ دو لاکھ ہے۔ دین دار و دین پرور اہل دول سے درخواست ہے کہ اس تعمیر میں خصوصی طور پر حصہ لیں۔ درالحدیث صرف ایک ہی بار بنے گا بار بار نہیں بنے گا، اس میں شریک ہونا کتنی بڑی سعادت ہے اس کو کسی سے مت پوچھئے اس کو اپنے حب رسول سے لبریز دل سے پوچھئے!۔ (ماہنامہ اشرفیہ)



فقیہ اعظم ہند

شارح بخاری علیہ الرحمہ کی اہم تصانیف

نزهة القاری: بخاری شریف کی نہایت جامع مفید شرح جو تمام عربی فارسی شروح کا عطر مجموعہ ہے۔ عوام، خواص، علماء، طلبہ، واعظین، مستفیدین کے لئے لاجواب تحفہ، کتابت طباعت نہایت اعلیٰ جلد زریں، خوب صورت، مضبوط، خوشنما۔

سائز: 20x30/8 صفحات مکمل قیمت -/1800

جلد اول	صفحات:559	از:ابتداء	تا	کتاب الوضو
جلد ثانی	صفحات:488	از:کتاب الوضوء	تا	ختم کتاب الصلوٰة
جلد ثالث	صفحات:556	از: مواقیت الصلوة	تا	کتاب الجنائز
جلد رابع	صفحات:520	از: کتاب الجنائز	تا	کتاب المناسك
جلد خامس	صفحات:528	از:کتاب الصوم	تا	کتاب الهبة
جلد سادس	صفحات:618	از:کتاب الشهادة	تا	کتاب الانبیاء
جلد سابع	صفحات:648	از:کتاب المناقب	تا	کتاب التفسیر
جلد ثامن	صفحات:416	از: کتاب فضائل القرآن تا		کتا ب الدعوات
جلد تاسع	صفحات:356	از: کتاب الرقاق	تا	ختم بخاری

اشرف السیر: فن سیرت پر تحقیقی مقدمہ کے ساتھ غار حرا تک کے واقعات پر مشتمل ایک تاریخی دستاویز۔ سائز: 23x36/16

مقالات شارح بخاری: شارح بخاری کے اہم موضوع پر مضامین و مقالات کا حسین گلدستہ، تین حصوں میں۔ سائز: 20x26/8

اسلام اور چاند کا سفر: از روئے شرع چاند پر پہنچنا ممکن ہے یا نہیں؟ چاند سورج ستارے کہاں ہیں۔ شارح بخاری کی تحقیقات کو خزینہ، صفحات:128 ☆ قیمت، سائز: 23x36/16

اثبات ایصال ثواب: اس موضوع پر شارح بخاری نے اس کتاب میں ایک نئے انداز سے بحث کی ہے میلاد و قیام نیاز و فاتحہ کے سلسلہ میں جو لوگ کسی شک و شبہے میں ہوں ان کے اطمینان کلی کی دستاویز۔ صفحات:80 ☆ قیمت، سائز: 23x36/16

فتنوں کی سرزمین: نجد و عراق کا ایک گراں قدر تاریخی دینی اور سیاسی جائزہ۔

امام احمد رضا اور مسئلہ تکفیر: از شارح بخاری، اپنے موضوع پر علم و تحقیق کا قابل مطالعہ ذخیرہ۔

منصفانہ جائزہ: سنی دیوبندی اختلافات پر شارح بخاری کی فیصلہ کن ابحاث کا مرقع۔ سائز: 23x36/16

تحقیقات: معاندین اہل سنت کے کچھ اعتراضات کے مدلل جوابات، دو حصوں میں۔ سائز: 23x36/16

اذان خطبہ کہاں ہو: اس موضوع پر شارح بخاری کے تلمیذ رشید مولانا حافظ عبدالحق صاحب کا محققانہ رسالہ، اذان خطبہ کہاں ہو؟ پر پھلواری کے بعض پیروں نے بہت ریز کی تھی۔ اس کا بھرپور رد اس کتاب میں ہے۔ سائز: 23x36/16

تنقید برمحل: جناب مولانا حافظ عبدالحق صاحب زید مجدہ کے اشہب قلم کی جولانی دماغ کی نکتہ آفرینی مطالعہ کی فراوانی کا منظر دیکھنا ہو تو اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ سائز: 23x36/16

شارح بخاری: از مولانا یٰسین اختر مصباحی، مولانا موصوف کے باوقار اور جاندار قلم سے شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کے حالات و خدمات پر مشتمل ایک مختصر اور جامع تعارف۔ صفحات:275، سائز: 23x36/16

دائرۃ البرکات، کریم الدین پور، گھوسی، ضلع مئو، یوپی (انڈیا)


مکتبہ برکات المدینہ
جامع مسجد بہار شریعت بہادر آباد کراچی۔